سالنامہ نیرنگ خیال

۱۹۳۸ء

قیمت فی پرچہ عہ

محصول ڈاک ۵ر

قیمت سالنامہ سمیت سالانہ ۴ روپے ۴ر

ممالک خارجہ سے ۱۲ شلنگ

برما سے چھ روپے

چیف ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن

ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسایل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۶ ‖ ۸ ۹ ۱ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء ‖ نمبر ۱۲

۔۔۔ ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ نیرنگ خیال میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا۔ تصاویر وٹائٹل وکٹوریہ پریس لاہور میں چھپے

تصاویر

تصاویر کا انتخاب ایک کٹھن کام ہے ہر مذاق کیلئے کوئی چیز ہو اور ہو بھی بلند پایہ جسمیں اسفل جذبات اور عامیانہ پن سے پرہیز برتا جا سکے۔ یہ ہے نقطۂ نظر جو ہم انتخاب تصاویر میں مدنظر رکھتے ہیں۔

(۱) رنگین تصاویر میں سب سے اول ہمارا ٹائٹل ہے۔ ہندوستان کے مایہ ناز مصور بہزاد ہند مسٹر ایم اے چغتائی کی ایک تصویر ہے۔ بہار رنگ جس میں ایک عورت لب جو محو نظارہ ہے۔ اور دو خوبصورت ہرن بھی پانی پینے کے لئے وہاں آ پہنچے ہیں۔ موسم اور فضا سے بسنت کا اظہار ہوتا ہے تصویر سے سادگی اور پرکاری کے جذبات ہویدا ہیں۔ حاشیہ کی تمام نقاشی کا کام "معصوم قلم" مسٹر ایم اسمٰعیل کی قلم کاری کا نمونہ ہے اور بے حد جاذب نظر ہے۔ یہ سب کچھ چھ رنگوں میں تیار ہوا ہے۔ ٹائٹل کو کاغذ بھی بہترین لگایا گیا ہے۔

(۲)

ورق الٹتے ہی اندر ایک اور ٹائٹل ہے۔ یہ تصویر اپنی جگہ ایک ہی رنگ میں ہزاروں خوبیاں لئے ہوئے ہے۔ ایک عورت ہے۔ جو ایک برتن لئے سر پر اٹھائے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ ہے مطلب ترقی کی طرف بڑھنے کا۔ پردوں اور خطوط کا ایک طویل سلسلہ اسے گھیرے ہوئے ہے جس سے اس کی استقامت اور ثابت قدمی ظاہر ہوتی ہے۔ مشکلات اور خطرات کے مقابلہ میں ہمت آزما عورت یعنی فن ادب برابر وسعت کی پہنائیوں میں پرواز کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ عبارت ہے نیرنگ خیال سے۔ اس کی کوشش جدوجہد ہے۔ اسے نوازنا اور ترقی دینا آپ کا کام ہے۔

(۳)

پنجاب کی اتحادی وزارت۔ ہندوستان میں کانگرسی اور غیر کانگرسی وزارتیں مختلف صوبوں میں قائم ہیں۔ کانگرسی وزارتوں سے پبلک کو زیادہ فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ لیکن پنجاب کی اتحادی وزارت جس میں ہندو مسلمان اور سکھ سب ہی شامل ہیں۔ پنجاب کی حکومت کی عنان نہایت قابلیت سے سنبھالے ہوئے ہے۔ اس وزارت میں دو ہندو اور ایک سکھ اور تین مسلمان گویا صوبہ کی مسلمان اکثریت نے پنجاب کی حکومت نصف بنصف بانٹ رکھی ہے اور پھر آپس میں ایسا اتحاد ہے کہ جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی مسلمان اپنی جگہ نالاں ہیں کہ ان کے حقوق کی حفاظت نہیں کی جا رہی اور ہندو اپنی جگہ نالاں ہیں۔ یہ سب کچھ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ پنجاب کی اتحادی وزارت ہندو مسلم سوال سے بالاتر ہے۔ اعتراض کرنے اور عیب لگانے کے لئے مواد کہاں نہیں مل جاتا۔ اور ہمارے صوبے کے کانگرسی اخبار اعتراض کرنے کے لئے نت نئی باتیں ایجاد کر لیتے ہیں۔ ایسا ہی اتحادی اخبارات کانگرسی وزارتوں کے عیوب چن چن کر بیان کرتے ہیں یہ جواب اور الجواب کا سلسلہ سیاسی پارٹیوں کی ہنگامہ آرائی اور زندگی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس نکتہ چینیاں اگر ہنگامہ آرائی کی جگہ نیک نیتی سے ہوں تو ملک کو فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پنجاب کو عموماً اور ہندوؤں کو خصوصاً سر سکندر سے بہتر وزیر اعظم کبھی نہیں ملے گا۔ اگر ہندو چاہیں تو سر سکندر حیات کی وزارت کے عہد میں پنجاب کی ہندو مسلم فضا کو ناپاکیوں سے دور رکھ کر بہتر و افضل بنانے کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مخالف ... کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اصولی مخالفت رکھنے والے بیشک رکھیں۔ لیکن بات بات پر اٹھنا اور اعتراض کرنا بھی کوئی قابل تعریف فعل نہیں ہے۔ اور ہمیں گلہ صرف پریس سے ہے۔

(۴)

نیرنگ خیال کے قلمی معاون۔ اس صفحہ پر پانچ تصاویر ہیں جناب

شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم۔ اے ایڈوکیٹ لکھنؤ۔ جناب صاحبزادہ محمد عمر صاحب بی۔ اے مختار عدالت جموں۔ جناب صفدر مرزا قدسی صاحب عفو۔ اسد بیگ صاحب صوفی بی اے۔ اور جناب ریاض حسین صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر۔ یہ پانچوں حضرات نیرنگ خیال کے علمی معاون ہیں +

(۵)

مسیح الملک حکیم حافظ محمد جمیل صاحب ۔ سرپرست ہندوستانی دواخانہ دھلی ۔

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم کا نام نامی صدیوں تک فراموش نہیں کر سکتا۔ آپ نے ملک کی سیاسی خدمات کے ساتھ ساتھ طب کے احیاء و ترقی میں جو کچھ کیا وہ اتنا گراں قدر ہے۔ کہ کہاں تک تعریف کی جائے دہلی میں ایک عالیشان طبیہ کالج کا قیام اور ہندوستانی دواخانہ کا قائم کرنا یہ دو ایسے نادر روزگار کام ہیں جن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے دہلی میں ہندوستانی دواخانہ کی نقالی میں چپے چپے پر دواخانے قائم ہیں اور بعض نے تو بڑی بڑی عمارتیں بنوائی ہیں اور دولت بھی کمائی ہے۔ یہ تمام نقال دونوں ہاتھوں سے مخلوق خدا کو لوٹ رہے ہیں۔ لیکن اونچی دوکان اور پھیکا پکوان کی مثال ان پر صادق آتی ہے۔ ان کی دوائیں ناقص اور بے اثر ہوتی ہیں۔ پبلک فضول اپنا روپیہ ان کی خرید پر ضائع کر رہی ہے۔ دہلی میں ہندوستانی دواخانہ جو حضرت حکیم محمد اجمل خاں صاحب نے قائم کیا تھا۔ سات آٹھ لاکھ روپے سالانہ کا بجٹ بناتا ہے۔ اور اس کی تمام آمدنی طبیہ کالج پر خرچ ہوتی ہے۔ اس کی ادویات پورے اوزان اور کامل توجہ اور دیانت داری سے تیار ہوتی ہیں۔ اسلئے پبلک اور اطبار کا فرض ہے کہ ادویات طلب کرتے وقت ہندوستانی دواخانہ کی ہی سرپرستی فرمایا کریں۔

حکیم حافظ محمد احمد صاحب کے انتقال پر ملال کے بعد حکیم محمد جمیل صاحب اپنے والد بزرگوار کی گدی پر تشریف لائے ہیں۔ آپ کے سوا اس وقت دہلی میں کوئی ایسا طبیب موجود نہیں۔ جو حکیم محمد اجمل خاں صاحب کی جگہ سنبھال سکتا۔ حکیم محمد جمیل صاحب کا تجربہ اور قابلیت کسی تشریح و تعریف سے مستغنی ہے۔ امید ہے کہ ہندوستان کے امرا اور روسا حکیم محمد جمیل صاحب کی خدمات فن سے فائدہ اٹھائیں گے ہمارے پاس ایک مضمون اس سلسلہ میں موصول ہوا تھا لیکن ہم اسے نیرنگ خیال کی کسی آئندہ اشاعت میں درج کرینگے۔ نیز دہلی کے دواخانوں پر بھی ایک مبسوط مضمون قابل اشاعت محفوظ پڑا ہے۔ وہ بھی کسی آئندہ نمبر میں پیش کیا جائیگا۔

(۶)

فخر پنجاب رئیس الحکما حکیم محمد حسن صاحب قرشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور

پنجاب اور لاہور۔ طب یونانی کی ترقی کا مرکز بن رہا ہے۔ اور یہ تمام رونق پنجاب طبی کانفرنس کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پنجاب میں اس وقت اچھے اچھے طبیب موجود ہیں۔ جو کامیاب مطبوں کے مالک ہیں۔ بعض یونانی اطبار کے پاس مریضوں کا غیر معمولی ہجوم ہوتا ہے یہ طب یونانی کی لاثانی افادی حیثیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں لاہور میں قبلہ شفاء الملک حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی مرحوم کا مطب بہت ہی مشہور تھا جس میں دور دور سے امرا اور روسا تشریف لاتے تھے حکیم صاحب کی وفات کے بعد جو جگہ خالی ہو گئی تھی وہ صرف قبلہ حکیم محمد حسن صاحب قرشی کی وجہ سے زندہ و برقرار نظر آ رہی ہے۔ پنجاب کے اکثر سربرآوردہ حضرات قرشی صاحب کی خدمات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ قبلہ حکیم محمد حسن صاحب قرشی کی مصروفیتیں بہت زیادہ ہیں ایک طرف تو انہیں ہر سال پنجاب کے سب سے بڑے طبی کالج سے کامیاب اطبا کی ایک جماعت طیار کرنی پڑتی ہے دوسری طرف جدید تصنیفات کے ذریعہ سے وہ اطبار کے لئے قابل عمل و قابل قدر لٹریچر مہیا کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی تازہ و بلند پایہ تالیف جامع الحکمت نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ نسلوں سے بھی خراج تحسین حاصل کرتی رہیگی تیسری طرف انہیں پیچیدہ و دیرینہ امراض کے مریضوں کو وقت دینا پڑتا ہے۔ مگر حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کی طرح ہماری بھی یہ رائے ہے کہ اب وہ اپنے اوقات کا بڑا حصہ مریضوں کے لئے وقف کر دیں۔ تاکہ پنجاب کے تعلیم یافتہ اور بلند طبقہ میں طب یونانی کا وقار بدستور قائم رہے۔ پیچیدہ امراض کے معالجہ میں انہیں جو ید طولیٰ حاصل ہے اس کے نفع کو محدود

... کے مترادف ہوگا۔

(۷)

جاپان کی چین پر چڑھائی۔ ایک مغربی مصور کا شاہکار ہے۔ پہاڑوں کی وادیوں کے درمیان ایک شہر ہے جس پر ایک اژدہا عظیم منہ پھاڑتا اور آگ برساتا ہوا چلا آرہا ہے۔ جاپان نے مشرقی روایات کے مطابق چین کا تیا پانچا کر دیا ہے۔ اس حرکت شنیعہ کی اس سے بہتر تصویر تیار نہیں ہو سکتی تھی۔

(۸)

مطالعہ۔ یہ تصویر جاپانی نہیں انگریزی ہے۔ درختوں کے سایہ تلے جب کہ دھوپ کھلی ہوئی ہو پانی میں ایک کشتی کے درمیان ایک عورت چھتری سے سایہ کئے محو مطالعہ ہے۔ مصور نے اچھے وقت اور اچھے منظر کی تصویر کھینچی ہے۔

(۹)

کیا لعل و گوہر اس کے عوض دینا ہے ظالم
دل توڑا ہے تو نے کوئی گوہر نہیں توڑا

یہ تصویر بھی ایک یورپین مصور کا کارنامہ ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ تصویر کسی مقامی رسالے میں چند سال ہوئے شایع ہوئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری نظر سے نہ گذری اور ہم نے اس کا بلاک خود تیار کرالیا۔ خیر اس سے غرض نہیں یہ تصویر ہمارے ناظرین کے لئے یکسر نئی ہے ایڈمنڈ ڈیولک کی طرز مصور نے پیش کی ہے۔ ایک حسینہ زر و جواہر کے بھرے ہوئے صندوق کے اوپر کھڑی ہے۔ لیکن اداس اور دل شکستہ ہمارے دوست مسٹر نازش رضوی جو دہلی میں گراموفون کمپنی کے شاعر اور گیت نویس ہیں انھوں نے اس پر جو شعر چسپت کیا تھا وہی اس کے نیچے درج کر دیا گیا ہے۔

(۱۰)

منظر نغمہ۔ یہ تصویر بھی بہزاد ہند مسٹر شاکر و اکیل دہلوی کے طرز مصوری کا نمونہ ہے۔ رنگوں اور خطوں کا ہلکا پن اس تصویر کی خوبی ہے ... تصویر کی طرح ہے۔ ہر چیز ساکت و جامد ہو رہی ہے۔ اور نغموں کی لے رنگ و پے میں سارمی وطاری ہے۔

(۱۱)

سہیلیاں۔ یہ یورپ کے وسطی زمانہ کی یادگار ہے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے درمیان کی مصوری جو حقیقت کے زیادہ قریب ہوتی تھی۔ یہ اس کی نظیر ہے سہیلیاں دیہات و قصبات میں جب باہم جمع ہوتی ہیں۔ تو کھیل کود میں جو کچھ کرتی ہیں اس تصویر سے ظاہر ہے یہ چیز صرف یورپ ہی میں نہیں ہمارے ہندوستانی دیہات و قصبات میں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔

(۱۲)

اُمی۔ (ملاحظہ افسانہ) لیکن پریس والوں نے چھاپ دیا ہے (ملاحظہ ہو آنانہ) اُمی کے نام سے ایک دلچسپ افسانہ سالنامہ کی زینت ہے۔ یہ تصویر اُسی کی ہیروئن کی مظہر ہے۔ جنوبی ہند کے پہاڑی قصبات ہیں جہاں ساحل مالابار کے آس پاس عربی رنگ و معاشرت مسلمانوں پر غالب نظر آتی ہے

(۱۳)

کیوپڈ۔ یعنی خالق عشق و محبت اپنے گلے میں دلوں کا ہار ڈالے تیر و ترکش سنبھالے اپنے دل پر ہاتھ رکھے پھر فضاؤں میں اپنے شکار کی تلاش میں ہے۔ دلوں کا ہار جسم پر سے ہوتا ہوا نیچے پہاڑی سے بہت نیچے چلا جا رہا ہے نہ معلوم کتنے کروڑوں دل اس ستمگر کے تیر کا نشانہ بن چکے ہیں۔ اسپر بھی سادگی اور بھولا پن۔ بے خبری اور بے چارگی اس کے چہرے سے ظاہر ہے۔

(۱۴)

پریت کی ریت۔ یہ تصویر شروع میں ہے۔ یہ تصویر اور اس پر ایک دلچسپ ڈرامہ جناب صفوۃ اللہ بیگ صاحب صوفی بی اے کا عطیہ ہے۔ صوفی صاحب نیرنگ خیال کے قدیمی معاون اور محسن ہیں دہلی کے ایک معزز خاندان کے رکن۔ سید سجاد مرزا جیسے قابل باپ کے قابل بیٹے گذشتہ سال آپ نے شادی بھی کر لی۔ گویا پریت کی ریت کا عملی سبق بھی پڑھ لیا۔ آپ یہ سبق اب خاندان ادب کی ضیافت طبع کے لئے پیش

کر رہے ہیں۔ اس عرصہ میں آپ نے کتنی ترقی کی ہے۔ وہ اس ڈرامے سے ظاہر ہے۔ اب آپ ایم اے کے طالب علم ہیں ۱۹۳۸ء میں اگر خدا چاہے تو ایم اے بھی ہو جائیں گے۔ ریڈیو پر آپ کے ڈرامے اور بچوں کا پروگرام بڑی دلچسپی سے سنا جاتا ہے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات... ابھی یہ ابتدا ہے۔ یہ نوجوان ہندوستان کی علمی ادبی فضا پر آفتاب بن کر چمکیگا۔ اور اپنے باپ دادا کا نام روشن کرے گا۔ یہ ہوگی انتہا جسے ہم اور آپ خدا کرے سب اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

پریٹ کی ریت میں رنگوں کا امتزاج ایسا گہرا اور خطوط کی دلکشی اتنی جاذب ہے کہ باوجودیکہ عورت اور مرد دونوں پشت کئے کھڑے ہیں۔ یہ کیفیت انتہائی استغراق اور یکسانیت کی مظہر ہے فضا میں پرندوں کا پرواز کرتے دکھانا مصور کا نقطۂ خصوصی ہے

(۱۵)

آرٹ کے چار نادر نمونے۔ اس تصویر میں چار بلاک ہیں اور یہ دو رنگوں میں چھاپا گیا ہے۔ دو برتن ہیں ایک مجسمہ۔ اور ایک لکڑی کا انسان۔ برتنوں کے نقش و نگار اور ان کی بناوٹ تانبے اور پیتل پر ابھرے ہوئے نقوش اٹھارہویں اور سترہویں صدی کے فن کاری کے مظہر ہیں۔ مجسمہ قدیم ہندوستانی سنگ تراشی کا نادر نمونہ ہے۔ اور لکڑی کا انسان چینی مصوری کا شاہکار ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے کہ کپڑے کے شکستن دکھائے گئے ہیں اور یہ کام لکڑی کا بنانا کتنا کٹھن کام ہے۔

(۱۶)

چار تصویریں فلم سے متعلق ہیں چینی ایکٹرس اینا مے وونگ۔ ایک رقاصہ کا کمال جس کے بدن میں شاید ہڈی نہیں مصری بہروپ۔ اور کلو پیٹرا بنی ہوئی ایکٹرس۔

(۱۷)

حیدر آباد کے مناظر کی چھ تصویریں ہیں۔ ترقی پذیر حیدر آباد کے ان چھ مناظر کے ساتھ شہزادہ نواب اعظم جاہ بہادر ولی عہد سلطنت دکن و برار بھی موجود ہیں۔ اس صفحہ پر سات تصویریں ہیں۔

(۱۸)

ہندوستان مصوری کا ایک نادر نمونہ

یہ فن کاری ایجنٹا۔ طرز کی ہے۔ اور اسے ہی قدیم ہندوستانی مصوری کا معراج تصور کیا جاتا ہے۔ تصویر کی خوبیاں خود اپنے منہ سے بول رہی ہیں۔

(۱۹-۲۰)

کلوپیٹرا کی گرفتاری اور چاند بی بی معرکہ کارزار میں۔

انگریزی مصور اور فلمکار اپنی اپنی ذہن میں کچھ کا کچھ بنا جاتے ہیں۔ کلوپیٹرا پر ہزاروں کتابیں اور تصویریں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ چاند بی بی کو معرکہ کارزار میں ایک مغربی مصور نے دکھایا ہے لیکن چاند بی بی کا لباس سراسر غیر مناسب ہے۔ کرتا تو اس نے بنایا ہے لیکن وہ رایونانی کی معاشرت کا مظہر ہے۔ اسلامی معاشرت سے اسے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ اس فروگذاشت کے علاوہ تصویر کی بقیہ فضا بہت موثر ہے۔

(۲۱-۲۲)

ہر مجسٹی ملکہ مصر۔ ہز مجسٹی شاہ فاروق والئے مصر کی ہونیوالی بیوی کی تصویر ہے۔ جب تک یہ پرچہ شائع ہوگا۔ توقع ہے کہ ان کی شادی بھی ہو چکی ہوگی۔ یہ تصویر ان دنوں چند ہندوستانی اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ لیکن یہ سب سے بہتر ہے۔ خدا کرے یہ شادی مصر اور شاہ مصر و ملکہ کے لئے نیک ثابت ہو۔ ملکہ مصر کا نام فریدہ ذوالفقار اور عمر ۱۴ سال ہے۔ ایک قدیم ترین ترکی خاندان سے آپ کا تعلق ہے۔

(۲۳) رباب کا ایک دردانگیز تار، حزن و ملال کی تصویر ہے

گلاب کی تصویر۔ ہم نے اسے دو رنگ میں شائع کیا ہے گلاب کا پھول اور لب سرخ بنائے گئے۔ لیکن چھپائی اچھی نہ ہو سکنے کے باعث اس کا وہ اثر ظاہر نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

(۲۴)

حسن و جمال کے تین نادر نمونے اس صفحہ پر تین بلاک ہیں۔ ایک آرٹ کی تصویر ہے۔ نمبر ۲ صرف خوبصورت ہے جس میں ایک حسینہ کرسی پر بیٹھی ہے۔ تیسری تصویر ایک ایسی ایکٹریس کی ہے جس نے فلمی میک اپ سے اپنے حسن کو بڑھایا ہو۔ [illegible]

گل کدہ

از جناب مولانا عبد المجید صاحب سالک بی اے مدیر روزنامہ انقلاب لاہور

میں نے کچھ نہ پوچھا۔ صرف جنگل کے کنارے ہر درخت کے پیچھے کھڑا رہا۔

صبح صادق کی آنکھوں پر اب تک غنودگی چھا رہی تھی اور ہوا میں اوس کی نمی موجود تھی۔ سرزمین سے اوپر اور ہلکی ہلکی کہر میں جھکی کھڑی تھی۔

بڑے درخت کے نیچے تو اپنے ان ہاتھوں سے جو مکھن جیسے نازک و تازہ ہیں گائے کا دودھ دوہ رہی تھی۔

اور میں خاموش و ساکن کھڑا تھا۔

میں نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ وہ ایک پرندہ تھا۔ جو گھنے جنگل میں کہیں گا رہا تھا!

آم کا درخت گاؤں کی سڑک پر اپنے پھول گرا رہا تھا اور بھونرے ایک ایک کرکے گونجتے ہوئے آرہے تھے۔

دریا کے پہلو ہی میں شیوجی کے مندر کا بڑا دروازہ کھلا ہوا تھا اور پجاری نے منتر پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔

تو برتن کو اپنی گود میں لئے گائے کا دودھ دوہ رہی تھی۔

میں اپنی خالی کلسی لئے کھڑا تھا۔

میں تیرے نزدیک نہیں آیا۔

آسمان مندر کے گھنٹے کی آواز کے ساتھ ہی جاگا۔

ہنکائے ہوئے چوپایوں کے کھروں سے سڑک پر گرد و غبار اٹھا

چھلکتے ہوئے کلسیاں اپنے کولہوں پر اٹھائے دریا پر سے آئیں۔

تیری چوڑیاں چھنک رہی تھیں اور دودھ کی جھاگ برتن کے کناروں پر بہتی بڑھتی چلی آئی اور میں تیرے نزدیک نہیں آیا۔

جب دوپہر گذر چکی تھی اور بانسوں کے جھنڈ میں آندھی سے ٹہنیاں سرسرا رہی تھیں میں سڑک کے پاس ٹہل رہا تھا معلوم نہیں کیوں؟

جھکے ہوئے سائے لئے بازو پوری طرح پھیلائے اڑتی ہوئی روشنی کے قدموں میں لپٹ رہے تھے کوئلیں گیت گا گا کر تھک رہی تھیں۔

میں سڑک کے پاس ٹہل رہا تھا معلوم نہیں کیوں؟

پانی کے پاس جھونپڑی پر ایک گھنے اور چھائے ہوئے درخت کی چھاؤں پڑ رہی تھی۔

کوئی عورت اپنے کام میں مصروف تھی۔ اور اس کی چوڑیوں کی جھنکار اس گوشے میں موسیقی پیدا کر رہی تھی میں اس جھونپڑی کے سامنے کھڑا ہو گیا معلوم نہیں کیوں؟

تنگ اور پُرپیچ سڑک بہت سے رائی کے کھیتوں اور بہت سے آم کے جنگلوں میں سے گذرتی ہے۔ یہ سڑک گاؤں کے مندر اور دریا کے گھاٹ پر بازار کے پاس سے ہو کر جاتی ہے۔ میں اس جھونپڑی کے پاس ٹھہر گیا۔ معلوم نہیں کیوں؟

کئی سال گزرے مارچ کے مہینے میں ایک دن ہوا چل رہی تھی جب کہ بہار غنودگی کے عالم میں گنگنا رہی تھی۔ اور آم کا مور خاک پر گر رہا تھا۔

لہریں لیتا ہوا پانی اچھلتا تھا۔ اور اس پیتل کی کلسی کو چاٹ رہا تھا جو گھاٹ پر پڑی تھی میں ماہ مارچ کے اس پُرہوا دن کو یاد کر رہا ہوں معلوم نہیں کیوں؟

سائے کی تاریکی گہری ہوتی جاتی ہے۔ اور چوپائے اپنے اپنے باڑوں میں واپس چلے آتے ہیں۔ سنسان چراگاہوں پر روشنی خاکستری ہوتی جاتی ہے۔ اور گاؤں والے کنارے پر کھڑے کشتی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

پریت کی ریت

ایک ایکٹ کی ایک تمثیل

از جناب صفوۃ اللہ بیگ صوفی بی۔اے

(افرادِ تمثیل)

پریتم
پریتی
بازیگر ——— جو دلوں کو جوڑتا اور موڑتا ہے

[ایک بوسیدہ پرانی قطع کے مکان کا ایک کمرہ۔ آگ کی سرخ روشنی ہے جو آتشدان کے سرخ دہکتے ہوئے کوئلوں سے نکل رہی روشن ہے۔ باہر ایک بیحد تنگ و تاریک گلی ہے جس میں دروازہ کھلتا ہے۔ آتشدان کے سامنے ایک بوسیدہ الماری رکھی ہے جس میں بیچ میل برتن سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں۔ کمرے کے بیچوں بیچ میں ایک آبنوس کی پرانی میز ہے جس پر ایک سرخ میز پوش پڑا ہوا ہے۔ چھت میں ایک بہت بڑی چھی ہے جس کے قریب چھت گیری کا لیمپ لٹک رہا ہے۔ لیمپ بہت دھیما دھیما جل رہا ہے۔

کھڑکی کے سامنے سے ایک سایہ گذرتا ہے۔ پریتی کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتی ہے۔ وہ لیمپ کو اونچا کر کے کیتلی کو آگ پر رکھ دیتی ہے پھر الماری میں سے برتن نکال کر میز پر چاء کا سامان چنتی ہے۔ ایک دفعہ وہ کھڑکی میں سے باہر جھانکتی ہے اور پھر ناامید ہو کر واپس آجاتی ہے۔ ——— تھوڑی دیر میں دور سے گانے کی ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ کان لگا کر سنتی ہے۔ اس کا چہرہ خوشی سے [illegible] لگتا ہے۔ کوئی گا رہا ہے)

پریم ہے میرا باپ
پاپی ہوں میں پاپی بالم پریم ہے میرا باپ۔
تو بھی پاپی بن جا
جنم مرن کا ساتھی بن جا جنم مرن کا ساتھی ہو جا

(آواز رفتہ رفتہ قریب ہوتی جاتی ہے ——— ایک سفید نکونی ٹوپی کھڑکی کے سامنے سے گذرتی ہے اور پریتم داخل ہوتا ہے)

پریتم ——— (اپنی ٹوپی پریتی کی گردن پھینکتے ہوئے) اُف! کتنی سردی ہے۔ میرے پاؤں تخ ہو گئے۔

پریتی۔ یہ لیجئے اپنے سلیپر۔ میں نے اُن کو گرم کر دیا ہے۔ لائیے میں آپکے جوتے اُتار دوں۔

(وہ پریتم کا جوتا کھولتی ہے)

پریتم۔ (گنگناتا ہے) پریم ہے میرا باپ
پریم ہے میرا باپ
ابھی چاء تیار نہیں ہوئی۔

پریتی۔ بس ذرا سی [illegible] کسر ہے۔

پریتم۔ [illegible] ——— مجھے یقین نہیں کہ آپ [illegible] میرا گلا ہی نہیں چلتا۔

پریتی۔ آپ بھی بالکل کیتلی کی طرح ہیں۔ یہ بھی جب سرد ہوتی ہے تو بالکل نہیں گاتی۔ ——— بی بی کیتلی تم کیوں سرد ہوئی جا رہی ہو۔ ذرا

جلدی کرو۔

پریتم۔ کاش یہ کیتلی بھی اپنی آواز پر فریفتہ ہوتی۔

پریتی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اپنی آواز پر فریفتہ ہے۔ جبھی تو یہ ایک سیریں نوا پرندے کی طرح گا رہی ہے۔ آگ کے بستر پر دیر تک کروٹیں بدلنے سے اس کا سوز بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ اور یہ دیکھئے یہ بخارات کے بادل جو اوپر جا کر قطروں میں منجمد ہو جاتے ہیں۔ اس کی آہ آتشیں ہیں جو کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کی آہ و بکا کی طرح آنکھوں کے راستے آنسوؤں کی شکل میں ٹپکتے ہیں۔

پریتم۔ (ہنس کر) یعنی آتش نفس سراپا درد و سراپا سوز ہے۔

پریتی۔ (ایک نقرئی قہقہہ لگا کر) ہم بھی محفل کے شمعوں اور پروانوں کے سوز سے اپنی چاء بناتے ہیں ——— (چاء دانی میں چاء انڈیلتے ہوئے) آیئے چاء تیار ہوگئی۔

پریتم ——— (دہکتے ہوئے انگاروں میں گھورتے ہوئے) کتنی حسین اور کتنی چھبیلی! میری آنکھیں اسکو ڈھونڈ رہی ہیں ——— ایک نظر میں پورا کاروان ہوش لوٹ لیا! میں نے دل کی نذر دی اور اسنے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا ——— کیا اس کی سیرت بھی اس کی صورت کی طرح حسین ہے؟ ——— اس دنیا میں اکثر حسین جسموں میں کثیف روحیں رہا کرتی ہیں۔

پریتی ——— کیا بڑبڑا رہے ہو ——— تمہارے چہرے کی شگفتگی پر یہ مردنی اور مرجھاہٹ کیسی ہے؟

پریتم۔ میں اپنی کسی اور دنیا میں تھا۔

پریتی۔ اچھا تو تھوڑی دیر کے لئے اس دنیا میں آجاؤ لو یہ چاء پیو ——— تم اتنے مغموم کیوں ہو؟

پریتم۔ (چاء کی چسکی لیتے ہوئے) مغموم! دنیا ہے ہی مغموم رہنے کی جگہ خوشی کو ڈھونڈو تو خوشی نہیں ملتی۔ موت کو مانگو تو موت نصیب نہیں ہوتی۔ سکون کی تلاش کرو تو سکون کہیں چھپ جاتا ہے ——— غرض جس چیز کو دل چاہے وہ میسر نہیں ——— عزت۔ شہرت۔ محبت یہ سب دل کو تسکین دینے کے ڈھونگ ہیں جو یہاں کسی قیمت بھی دستیاب نہیں ہوتے ——— میں تو اس دنیا اور اس کے دنیا والوں دونوں سے تنگ آگیا ہوں ——— کیا تم ہمیشہ خوش رہتی ہو۔

پریتی۔ میں ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔

پریتم ——— اُف

(میز کے اور قریب کرسی کو کھینچ لیتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی ہو جاتی ہے اس دوران میں دونوں چاء پیتے ہیں)

پریتی چاء تو ٹھیک ہے نا۔

پریتم۔ ذرا ہلکی ہے۔

پریتی۔ لاؤ میں اور تیز چاء بنا دوں۔

پریتم۔ نہیں ٹھیک ہے ——— تم مجھے اس طرح ستایا مت کرو ——— پریتی کیا تم نے اس لڑکی کو دیکھا تھا؟

پریتی ——— کس کو؟

پریتم۔ جو وہاں تماشے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھی تھی۔

پریتی۔ نہیں میں نے اس کو نہیں دیکھا۔

پریتم۔ جتنی دیر میں گاتا رہا ——— وہ نظریں نیچی کئے میرا گانا سنتی رہی جب میں گا چکا تو اس نے بہت زور سے تالیاں بجائیں اور پھر وہاں سے اٹھ کر غائب ہوگئی۔ اس کی بھولی بھولی شکل میری آنکھوں میں کھبی جا رہی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ کوئی پری نہو میری آنکھوں نے اتنی حسین اور سڈول عورت آج تک نہیں دیکھی۔

پریتی۔ وہ سنگھار کئے ہوئے ہوگی۔

پریتم۔ نہیں۔ وہ اس کا قدرتی حسن تھا۔ جب تم نے اُسے دیکھا ہی نہیں تو تم نے یہ کیسے کہدیا کہ سنگھار کئے ہوئے ہوگی۔

پریتی۔ شاید میں نے اس کو دیکھا ہو۔

پریتم۔ دیکھو پریتی تم کیوں خواہ مخواہ اس بیچاری سے جلتی ہو ہم تم دونوں نے جب سے یہ تماشے کا کام شروع کیا ہے ہمارا اور تمہارا رشتہ صرف دو تجارتی شریکوں کا سا ہے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اور کوئی بندھن اس کے علاوہ نہیں ہے میں آزاد ہوں جس سے چاہوں محبت کروں اور جس سے چاہوں شادی کروں اس لیئے تم بھی اپنی محبت اور اپنے انتخاب کے معاملہ میں آزاد ہو ہم ایک دوسرے

کے پابند نہیں۔

پریتی ۔ یہ غلط ہے پریتم — تم مجھ پر الزام لگا رہے ۔ میں کسی سے حسد نہیں کرتی۔

پریتم ۔ (اپنی دھن میں محو ہو کر گاتا ہے)

دنیا والوں کے بکنے دے سُن نہ انکی ایک　　یہ بدبخت نہ دیں گے ہرگز کوئی رائے نیک

گونگا بہرا ہوجا

جنم مرن کا ساتھی بن جا　　جنم مرن کا ساتھی ہوجا

پریتی ۔ کیا تم نے اس لڑکی کو تماشے کے بعد بھی دیکھا؟

پریتم ۔ نہیں ۔ وہ بھیڑ میں کہیں کھو گئی ۔ میری نگاہیں اس کو نہ پاسکیں — اب میں اُسے ڈھونڈنے جارہا ہوں۔

پریتم ۔ باہر سردی ہے

پریتم ۔ لیکن اگر وہ نہیں ملی تو میری دنیا اس سے زیادہ سرد ہوجائیگی۔

پریتی ۔ یہاں آگ کے پاس بیٹھو

پریتم ۔ میرے لئے محبت کی آگ بہت کافی ہے۔

پریتی ۔ مجھے اپنے موزے رفو کرنے ہیں ۔ کاش تم اس میں کچھ میری مدد کرتے۔

پریتم ۔ اور مجھے اپنے چاک گریباں کا رفو کرنا ہے — کاش تم اس میں کچھ مدد دیتیں۔ دنیا میں تمہاری جرابوں کے رفو سے زیادہ بھی ضروری کام ہیں۔

پریتی ۔ تو تم نے اپنے گریبان کو پارہ پارہ کیوں کیا — ہم پہلے تو جرابوں میں سوراخ کرلیتے ہیں اور پھر بیٹھ کر ان کو گانٹھتے اور رفو کرتے ہیں عقلمند وہ ہیں جو پہلے ہی ان کو نہ پھٹنے دیں۔

پریتم ۔ یہ تو تم نے عقلمندی کی بات کی مجھے اس پر یہ گیت یاد آگیا۔

تجھے کیا فکر ہے اے دل بندھا سلسل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کرلے
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کرلے

پریتی ۔ کیا تم اس کو تماشہ گاہ میں گاؤ گے۔

پریتم ۔ تم کو ہر وقت تماشے یا تماشہ گاہ کی پڑی رہتی ہے ۔ افسوس کہ تمہارے دل میں وہ تڑپ نہیں جو کو ساحل سے ہم کنار ہونے کے لئے ہر وقت بیقرار رکھتی ہے ۔ پریتی تم کیا جانو محبت کیا ہے بسنو۔

محبت رُوح جسم عارضی ہے　　محبت زندگی کی زندگی ہے
محبت غایت الغایات ہستی　　محبت رہنما ہے رہبری ہے

مجھ کو دیکھو۔

پریتی ۔ کیا دیکھوں تم ٹھیرتے ہی نہیں — پریتم ٹھہر جاؤ ۔ باہر بہت سردی پڑ رہی ہے

پریتم ۔ اس لئے کہ میں یہاں بیٹھ کر آپ کا رونا سنوں

پریتی ۔ تم تو یہ کہتے تھے کہ میں ہر وقت ہنستی رہتی ہوں۔

پریتم ۔ جبھی تو مجھے جانے سے روکتی ہو ۔ میں چاہتا ہوں کہ باہر جاؤں ۔ اور اس دنیا کی تمام وسعت کو چھان ڈالوں ۔ کہیں کسی کوہسار میں کسی آبشار کے نیچے یا کسی سرسبز و شاداب وادی میں کسی صاف و شفاف ..

پریتی ۔ دیکھو بھول جاؤ پریتم ۔ بازار میں بڑی کیچڑ اور ٹھنڈک ہوگی میرا دل نہیں ہیں پڑا رہے گا۔

پریتم ۔ نہیں میں نہیں بیٹھنے کا تم مجھ کو نہیں روک سکتیں ۔ سمندر کے طوفان پاڑوں سے نہیں رکا کرتے اُن کے تھپیڑے ہر مخالف چیز کو دنا کر دیتے ہیں ۔ میرے دل میں بھی محبت کا طوفان بپا ہے ۔ اور اس کو کہ تم تو کیا میں بھی اگر چاہوں تو نہیں روک سکتا تمہاری ضد بیکار ہے میں ضرور جاؤں گا۔

پریتی ۔ کیا تم ہمیشہ کسی عورت کے تخیل میں غرق رہتے ہو۔

پریتم ۔ اور کیا تم ہر وقت کسی غیر مرد کے خیال میں کھوئی ہوئی نہیں رہتیں؟

پریتی ۔ توبہ ۔ میں کیوں کسی غیر مرد کا خیال کرنے لگی۔

پریتم ۔ عورتوں میں تخیل کا مادہ ہی قدرت نے ودیعت نہیں کیا ۔ ان کو سوائے آنسو بہانے کے اور کیا آتا ہے ۔ میں تو ایسی عورت چاہتا ہوں جو میرے خوابوں کی طرح رنگین میرے دل کی طرح جوان اور میرے ارمانوں کی طرح حشر انگیز ہو ۔ اور اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر پوجا کرسکوں ۔ تم نادان ہو تم مجھ کو نہیں سمجھ سکتیں۔

پریتی ۔ ٹھیک ہے میں نادان ہوں — (روتی ہے)

پریتم ۔ شاید تم مجھ کو کبھی نہ سمجھ سکو ۔ مجھ میں اور صبر کرنے کی طاقت نہیں ۔ اب میں جاتا ہوں ۔ (وہ اپنا گیت ۔ تو بھی پاپی بن جا جنم مرن کا ساتھی ...

ہوجا جنم مرن کا ساتھی بن جا۔ گاتا ہوا جاتا ہے۔ اس کی آواز دھیرے دھیرے کم ہوتی جاتی ہے۔ پریتی اُس کی مدہم آواز کو کان لگا کر سنتی ہے پھر جاکر آتشدان کی آگ کو تازہ کرتی ہے۔ اس وقت اس کے کانوں میں پریتم کے بول گونج رہے ہیں اور وہ پاپی ہوں میں پاپی بالم پریم ہے میرا پاپ مدہوشی کے عالم میں اٹک اٹک کر آہستہ آہستہ دہراتی ہے۔ اس کے دل کی اس پکار کو سوائے شعلوں کے اور کوئی نہیں سنتا —— اس کی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو بہ کر اس کے شفق آلود گالوں پر آجاتے ہیں اور وہ فرطِ غم سے اپنا منہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے —— کوئی دھیرے دھیرے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ وہ چونک کر اوپر دیکھتی ہے۔ دروازہ پر پھر دستک ہوتی ہے،

پریتی۔ اندر تشریف لے آیئے۔

(دروازہ آہستہ آہستہ خود بخود کھل جاتا ہے اور بازیگر —— جو دلوں کو جوڑتا ہے اور موڑتا ہے۔ اندر داخل ہوتا ہے یہ ایک بوڑھا عجیب الخلقت انسان ہے۔ اس کا لباس اس کی شکل سے زیادہ عجیب ہے۔ وہ ٹخنوں تک کا سبز عبا پہنے ہوئے ہے جس کے سینے پر ایک سرخ رنگ کی دل کی تصویر بنی ہوئی ہے اس کی جیبیں بہت لمبی ہیں اور اس میں روپہلی چمکدار ربن ٹنکے ہوئے ہیں اس کے گلے میں ایک ترکش ہے جس میں مرصع تیر پڑے ہیں اور ہاتھ میں ایک سنہری کمان ہے اُس کے چہرے سے محبت ٹپکتی ہے۔ دروازہ اس کے آنے کے بعد خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ پریتی اس کو دیکھ کر کھوئی سی جاتی ہے۔)

مجھ کو سخت افسوس ہے کہ میں آپ کی دستک پر فوراً دروازہ نہیں کھول سکی۔

بازیگر۔ نہیں کوئی ہرج نہیں۔ میں خود دروازہ کھولنے کا عادی ہوں۔ اور آپ کا دروازہ تو بہت جلدی کھل گیا۔ بعض جگہ تو مجھے مقفل دروازوں کو کھولنا پڑتا ہے —— شاید تم تعجب کر رہی ہو کہ میں ہوں کون؟

پریتی۔ نہیں۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ آپ کی کیا تواضع کروں۔

بازیگر۔ آپ کی اس عنایت اور مہمان نوازی کا شکریہ! عورت کی فطرت میں ہمدردی اور مہمان نوازی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ میں بہت کم خوراک ہوں اور اگر یہ کہوں کہ میں غذا سے بالکل بے نیاز ہوں تو شاید مبالغہ نہ ہو۔ میرا پیٹ تو صرف مسکراہٹ اور محبت بھری نگاہ سے بھی بھر جاتا ہے۔

پریتی۔ —— خیر آپ کی مرضی آپ کچھ نوش نہ کریں —— لیکن آپ بے تکلفی سے آرام تو ضرور فرمائیں گے۔

بازیگر۔ —— تکلف کرنا تو مجھ کو بالکل نہیں آتا —— میں تو ہر گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہوں —— بہت سارے آدمیوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ میرا وجود گھر کی خوشی اور رونق —— کے لئے لازمی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ذرا سی آگ تاپ لوں

پریتی۔ ضرور۔ اس میں پوچھنے کی بھلا کونسی بات تھی۔

بازیگر۔ شکریہ! ہائیں پریتی تم رو رہی تھیں۔ [illegible] ہے تر ہیں۔

پریتی۔ (گھبراکر) ہاں شاید۔

بازیگر۔ خدا تم پر رحم کرے۔ میں سب جانتا ہوں۔ یہ سب پریتم کی وجہ سے ہے۔ تم اُس سے محبت کرتی اور وہ تمہاری اس گرمجوشی کا جواب ایسی سرد مہری سے دیتا ہے —— تم اس پر جان چھڑکتی ہو اور وہ تمہاری پرواہ بھی نہیں کرتا کتنی عجیب بات ہے۔ ایک تڑپے اور دوسرا بے خبر رہے —— ایک تو اپنی جان ہلکان کر دے اور دوسرا ٹس سے مس نہ ہو۔

پریتی۔ نہیں میں روز نہیں روتی۔ آج اس وقت وہ بے انتہا مغموم تھے اور اُن کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر میری دل کی کلی بھی مرجھا گئی۔ میں نے اُن کو خوش کرنے کی بہت کوشش کی —— لیکن افسوس؟ ——

بازیگر۔ لیکن آج "وہ" رنجیدہ کیوں تھے۔

پریتی۔ معلوم نہیں۔ میں نے بہت پوچھا لیکن [illegible] افسردہ نہوں تو کیا ہوں۔ کتنے دن ہوگئے۔ بین آمدنی ذرا سی بھی نہیں ہوتی۔ اب ہمارے تماشے میں کوئی نہیں آتا۔ ——

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ ذہانت اور سیاہ بختی دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

بازیگر۔ لیکن کیا پریتم تمہارے ان آنسوؤں کے قابل ہے۔

پریتی۔ میرے آنسوؤں کی اس کے سامنے کیا حقیقت ہے۔

بازیگر۔ تمہیں نہیں معلوم پریتی یہ آنسو بہت قیمتی چیز ہیں۔ یہ جگر کے خون سے بنتے ہیں۔ ان کو اس طرح ضائع کرنا عقلمندی نہیں یہ ہم کو بہت تھوڑی مقدار میں ملے ہیں۔ ان کو اگر یوں آنکھوں کے راستے بہادو گی تو پھر تمہاری امنگوں میں یہ گرمی نہیں رہے گی اور وہ سرد ہو جائیں گی قدرت نے انکو ہمارے دل کو زندہ اور گرم رکھنے کے لئے عطا کیا ہے جن لوگوں کے آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں اُن کی افسردگی کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟

پریتی۔ لیکن آپ کو معلوم نہیں پریتم تو بہت ہی اچھا ہے۔ میرے آنسو تو کیا میری ہستی بھی اس کے سامنے بے قیمت ہے آپ اس کو اتنا نہیں جانتے جتنا میں جانتی ہوں ـــــ یہ ضروری ہے کہ وہ بہت ہی تلون مزاج ہے۔ قناعت اس میں نام کو نہیں ـــــ ایک بھونرے کی طرح چمن کی ہر کلی سے رس چوسنا چاہتا ہے۔ وہ کسی سے لگ کر محبت نہیں کرتا۔ کاش وہ مجھ سے محبت کرتا۔ آپ جانتے ہیں محبت سے انسان میں کتنی کتنی بڑی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔

بازیگر۔ کیا تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

پریتی۔ اُس میں دیوتاؤں کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں جس وقت دل کی بھینٹ محبت کی قربان گاہ پر چڑھائی جاتی ہے۔ اس وقت انسان آب و گل کی اس دنیا سے نکلکر ایک ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی فطرتی کمزوریاں اور اس کی برائیاں اس کے ساتھ نہیں جاسکتیں۔ اس میں رنج و غم سہنے اور مصیبتیں اٹھانے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ عجز و انکسار پرستش و عبودیت کی زندہ تصویر بن جاتا ہے۔ اور اپنے گرد کے ماحول سے بے نیاز ہو کر۔ اپنی دھن میں مست اور اپنی تلاش و جستجو میں سرگرم رہتا ہے۔ وہ جتنا پاتا ہے اس سے زیادہ اپنے آپ کو کھوتا جاتا ہے۔ جتنا سلجھتا ہے اُس سے زیادہ الجھتا جاتا ہے۔ محبت ایک جست میں صدیوں کی منزلیں طے کر لیتی ہے۔

بازیگر۔ لیکن تم میں کیا تبدیلیاں ہوئیں پریتی۔

پریتی۔ میں پریتم کے جوتوں کو جب وہ بھیگ جاتے ہیں سکھاتی ہوں۔ اس کے لئے چاء بناتی ہوں اور اس خیال میں ہر وقت مگن رہتی ہوں کہ پریتم کا کام کر رہی ہوں اگر مجھ کو ان سے پریم نہیں ہوتا تو یہ زندگی کیسی پھیکی اور کیسی بوجھل ہوتی۔؟

بازیگر۔ کیا تم کو یقین ہے کہ تمہیں اس سے سچی محبت ہے۔

پریتی۔ ہاں۔

بازیگر۔ کیا تم کو یہ محسوس ہوتا کہ پریتم ہر وقت ـــــ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے، تمہارے ساتھ ہے اور تم اس کی طرف ایک نامعلوم طاقت سے کھچی جارہی ہو ـــــ اور تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ اس سے ہم کنار ہونے کے لئے مچل رہا ہے؟

پریتی۔ ہاں بالکل یہ ہی۔

بازیگر۔ اور تمہیں پریتم کی آواز بہترین راگی سے زیادہ دلکش معلوم ہوتی ہے؟

پریتی۔ ہاں اُس کی آواز میری دل کی گہرائیوں میں اتر کر میرے سوتے ہوئے ارمانوں میں ایک طوفان بپا کر دیتی ہے۔

بازیگر۔ اور تم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پریتم تمہاری کائنات پر چھایا ہوا ہے؟

پریتی۔ ہاں مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ پریتم ہی پریتم ہے یہ تمام دنیا پریتم کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

بازیگر۔ لیکن آخر اس کی کوئی وجہ بھی ہے؟

پریتی۔ ہاں اس لئے کہ وہ پریتم ہے۔

بازیگر۔ اس لئے کہ وہ پریتم ہے! وہی پرانی دلیل۔

پریتی۔ آپ اس کو جانتے نہیں۔ میں اس کو خوب جانتی ہوں۔ وہ ایک گرانبہا موتی ہے جو زمانے کے ناقدرشناسوں کے ہاتھوں ان حالوں پڑا ہوا ہے۔ ورنہ اس کے سینے میں وہ چنگاریاں دفن ہیں جو ایک دفعہ اس تمام عالم کو خس و خاشاک کی طرح جلا کر بھسم کردیں۔ ـــــ اس کے نالوں میں وہ اثر پوشیدہ ہے جو سننے والوں کے لئے درس حیات کا کام دے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ تھوڑا سا کاہل ہے سبے پرواہ بھی بہت ہے۔ لیکن اس کی یہ کمزوریاں

اس کی خوبیوں سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں ——— اگر وہ ذرا سی
بھی کوشش کرے تو وہ دنیا کا ہر بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے۔
ہر بلندی کو پھلانگ سکتا ہے ——— آپ نے کبھی اس کی مسکراہٹ
دیکھی ہے ——— اپنے خیالات کی دنیا میں جب وہ گم ہوتا ہے
تو کبھی کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے ———
بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ "زندگی" خود ان ہونٹوں پر رقص کر
رہی ہے ——— لیکن کاش وہ میرا ہوتا۔ اوروں کی طرف
دیکھ کر مسکرانے کی جگہ وہ میری طرف دیکھکر مسکراتا۔

بازیگر۔ اچھا تو وہ اوروں کی طرف دیکھکر بھی مسکراتا ہے۔

پریتی۔ ہاں۔ کوئی دن ایسا خوش نصیب گزرتا ہوگا۔ جب کوئی خوبصورت
عورت تماشے میں نہ آتی ہو۔ آج ہی ایک لڑکی آئی تھی۔ ہمیں وقت
وہ اس کی تلاش میں اُسے ڈھونڈنے گیا ہوا ہے ——— لیکن
اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں وہ بیچاریاں اس سے محبت
کئے بغیر نہیں رہ سکتیں (غرور سے) اس سے تو ہر ایک ہی محبت
کرتا ہے۔

بازیگر۔ اور اگر ان میں سے کوئی شریف عورت اس سے شادی کرے تو؟

پریتی۔ ایک غریب آدمی سے جس کے پاس نہ دھن ہو نہ دولت ہو کون بھلا
شادی کرنے کے لئے راضی ہوگی۔ محبت کرنا اور چیز ہے اور اُس
محبت کو شادی کے دائمی سلسلے میں مرتبط کرنا اور چیز۔ اس کے لئے
بڑی قربانیوں اور بڑے جگرے کی ضرورت ہے۔ محبت کا دم تو
ہر شخص بھرتا ہے لیکن اُس کو نباہنے والے اور انجام تک پہونچانے
والے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ شادی کے نام سے بڑے بڑے مرد
میدان بھاگ نکلتے ہیں ——— اور اگر پریتم کی شادی ہو بھی گئی
تو پھر میں تو جیتے جی مر جاؤنگی ——— لیکن ——— میں ——— میں
آپ سے اتنی بے تکلف کیوں ہو گئی؟ ! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہیں۔

(بازیگر پریتی کے قریب آجاتا ہے اور نہایت موثر آواز
میں آہستہ آہستہ کہتا ہے)

بازیگر۔ ہاں۔ تم مجھ کو بہت عرصے سے جانتی ہو۔ بہت دن ہوئے جبکہ
تم نے شباب کی پہلی منزل میں قدم رکھا تھا اور تمہارے دل
میں ارمانوں کا پہلا جوار بھاٹا آیا تھا اسی دن سے تم کو میری تلاش
تھی (پریتی گم ہو جاتی ہے۔ اور ایک عالم بے خودی میں بازیگر
کو دیکھتی ہے، وہ مسکراتا ہے۔ اتنے میں اس کی نظر اس کے گلے
میں پڑی ہوئی مرصع سنہری کمان پر پڑتی ہے)

پریتی۔ ہائیں یہ کیا ہے؟

بازیگر۔ یہ ——— بہت زمانہ گزرا اس سے میں تیراندازی کی مشق
کیا کرتا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی کر لیتا ہوں۔ لیکن بہت کم اب پہلے
جیسے شکار ہی نہیں ملتے۔ ان جنگلوں میں اور ان شہر کی گنجان
آبادیوں کے بسنے والے مصروف لوگوں پر میں اپنا ترکش
خالی نہیں کرنا چاہتا۔

پریتی۔ آپ شہر میں شکار کھیلا کرتے ہیں۔ شاید چڑیا گھر میں شیر کا شکار
فرماتے ہوں گے۔

بازیگر۔ نہیں پریتی تم نہیں سمجھیں۔ میں اور شکاریوں کی طرح فطرت
کے حسن کو اپنی بیدردی سے پامال نہیں کرتا۔ میں تو ان سے
دلوں کو چھیدا کرتا تھا۔

پریتی۔ دلوں کو چھیدا کرتے تھے آدمیوں کے؟

بازیگر۔ ہاں! دلوں کو چھیدا کرتا ہوں آدمیوں کے ——— اور پھر ان
دونوں دلوں کو محبت کی مالا میں گوندھ دیتا ہوں۔

پریتی۔ آپ دو دلوں کو محبت کی مالا میں گوندھ دیتے ہیں۔

بازیگر ——— ہاں

پریتی۔ اور پھر کیا وہ محبت کی مالا کبھی ٹوٹ بھی جاتی ہے؟

بازیگر۔ بہت کم۔ اور اگر ٹوٹے بھی تو ایک گرہ دینے سے جڑ جاتی ہے۔

پریتی۔ لیکن اس میں جوڑ آجاتا ہوگا۔

بازیگر۔ نہیں پریتی نہیں۔ اس میں شیشے کی طرح بال نہیں پڑتا بلکہ
اُس کے دونوں سرے ٹوٹ کر جڑنے پر اور قریب ہو جاتے ہیں۔

پریتی (تو پھر آپ ——— کیا ——— ؟

(فقرہ پورا نہیں ہوتا۔ دور سے پریتم کی آواز سنائی
دیتی وہ گا رہا ہے)

رات اندھیری چمکے بجلی۔ بادل شور مچائے
کوئی بیکل۔ کوئی دکھیا۔ کوئی رنج اٹھا سے
عیش نگر میں بیٹھا بیٹھا پاپی تو سب ٹھکرائے

بازیگر۔ (رازدارانہ لہجے میں) یہ کون ہے۔

پریتی ——— پریتم۔

(دوبارہ سفید نکونی ٹوپی کھڑکی کے سامنے سے گذرتی ہے۔ پریتم داخل ہوتا ہے)

پریتم۔ وہ کہیں بھی نہیں ملی۔ افسوس (بازیگر کو دیکھتے ہوئے) آپ کی تعریف آپ کون ہیں۔؟

بازیگر۔ آپنے مجھ کو نہیں پہچانا۔ پریتی تو ایک منٹ میں پہچان گئی۔

پریتم۔ تو آپ کوئی پرانے پاپی ہوں گے۔

بازیگر۔ ممکن ہے آپ میری عمر کا کیا اندازہ لگاتے ہوں گے۔؟

پریتم۔ (ہاتھ سے دکھاتے ہوئے) یہی کوئی ایک بالشت۔

بازیگر۔ معلوم ہوتا ہے کہ دن بھر نقلیں اتارتے سے تمہارے رگ و ریشہ میں مسخرا پن پیوست ہو گیا ہے۔ لیکن ہر جگہ بھونڈا پن نہیں سراہا جا سکتا۔

پریتی۔ پریتم۔ تم اتنے بداخلاق مت بنو۔

بازیگر۔ (جو پریتم سے علیحدگی میں گفتگو کرنے کا خواہشمند ہے) پریتی کیا تم نے کھانا پکالیا۔

پریتی۔ ارے میں تو آپ کی باتوں میں بالکل بھول گئی۔ کہیں دوکانیں نہ بند ہو گئی ہوں۔ کیا آپ میرے واپس آنے تک ٹھیریں گے۔

بازیگر۔ میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش ضرور کروں گا۔

(پریتی چلی جاتی ہے ——— خاموشی
اس دوران میں بازیگر پریتم کو خوب گھورتا ہے)

بازیگر۔ کہو دوست آجکل بزنس کا کیا حال ہے۔

پریتم۔ بزنس کا حال! اگر بزنس سے آپ کا مطلب واہ واہ اور تالیاں ہیں تو میرا بزنس خوب چلتا ہے۔ اور اگر بزنس سے مقصد روپیہ ہے تو وہ ہمیشہ کی طرح آجکل بھی سرد ہے۔ دنیا میں قدر شناسوں کی بہت کمی ہے۔

بازیگر۔ کچھ تدبیر کرتے ہو یا تن بہ تقدیر بیٹھے رہتے ہو۔

پریتم۔ تقدیر اگر اتنی اچھی ہوتی کہ خالی بیٹھے سے بھی ہن برستا تو آج کو یہ دن ہی کیوں ہوتے۔ تقدیر کو تو چھوڑیئے یہاں تو تدبیر بھی کارگر نہیں ہوتی ——— روز نئی ترکیبیں سوچتا ہوں۔ آنکھوں کا تیل نکالتا ہوں۔ لیکن سب بیکار۔ اب آج میں نے اڈیٹر صاحب سے معاہدہ ہے کہ میں ان کو کچھ پاس مفت دیا کروں گا اور وہ میرا اشتہار اپنے اخبار میں مفت چھاپ دیا کریں۔ وہ راضی تو ہو گئے ہیں۔ دیکھئے کیا بنتا ہے۔

بازیگر۔ پریتم اگر دنیا بھر کی دولت بھی تمہارے پاس آجائے جب بھی تم خوش نہیں رہ سکتے۔

پریتم۔ آپ مجھ کو پہلے تمام دنیا کی دولت دیدیجئے۔ پھر دیکھئے میں کیا کرتا ہوں۔ دولت کی اس غلط تقسیم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں میرے راج میں یہ کبھی نہ ہو کہ کھٹو اور پاکھنڈی تو آبائی ترکے سے گل چھرے اڑائیں اور محنتی دن بھر کی محنت اور کاوش کے بعد بھی سوکھے ٹکڑوں کو ترسیں ——— ایسے سکول بناؤں جس میں انسان صحیح معنوں میں "آدمی" بنکر نکلیں۔

بازیگر۔ تم شہرت اور دولت کے خواب دیکھتے اور خیالی پلاؤ پکاتے ہو تم مستقبل کو رنگین اور شاندار بنانا چاہتے ہو لیکن تم نے ان چیزوں کو جو حقیقت میں اس وقت موجود ہیں بالکل نظر انداز کر دیا ہے ——— تم مضطرب ہو اور چاہتے ہو کہ اپنے اس اضطراب اور بے چینی سے سکون قلب خرید لو لیکن پریتم یہ کیسے ممکن ہے؟

پریتم۔ آپ چاہتے ہیں کہ اس اضطراب کو چھوڑ دوں اور کتے کی طرح ایک ہڈی پر قانع ہو جاؤں۔ لیکن یہ میرے عقیدے اور میرے مسلک دونوں کے خلاف ہے۔ میری دانست میں زندگی نام ہے جہد و عمل کا پیہم کوشش کا! میری روح کی یہ بے چینی میرے دل میں بھڑکنے والی یہ آگ میری عظمت کی نشانیاں ہیں۔ سکون میرے نزدیک موت کے ہم معنی ہے۔ میں انقلاب پسند ہوں ——— میں چاہتا ہوں کہ لمحوں میں زندگیاں سنور جائیں اور اور آدمی یوں کیڑوں کی طرح نہ رینگیں۔ میرے دماغ میں خیالات بھی

اسی بجلی کی سرعت کے ساتھ آتے ہیں۔ دیکھئے میں نے اس بند کو
چند سکنڈ میں لکھ لیا۔ سنئے (گاتا ہے)

یہ نھری نھری آنکھیں ۔ یہ لمبی لمبی پلکیں۔
یہ تیکھی تیکھی چتون ۔ یہ سندر سندر درشن
مایا ہے سب مایا ہے

بازیگر۔ لیکن تم ایک ایسا گیت کیوں نہیں لکھتے جو کبھی ختم ہی نہ ہو ـــــ جسکی حلاوت اور جسکا سوز ہمیشہ قائم رہے۔

پریتم۔ یہ تو ایک مجنونانہ سا خیال ہے۔

بازیگر۔ ایسے دلکش گیت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ خوش رہے

پریتم۔ یہ خیال تو بہت اچھا ہے کہ آدمی ہمیشہ خوش رہے۔ لیکن اس دنیا میں آج تک کوئی خوش رہا ہے جو میں خوش رہوں گا۔

بازیگر۔ اچھا تو میں آپ سے ایک چھوٹا سا معاملہ کر سکتا ہوں۔

پریتم۔ جی ہاں۔ بڑی خوشی سے۔ آپ اپنے لئے کونسی نشستیں محفوظ کرائیں گے۔ سامنے کی قطاروں کی کرسیاں بہت آرام دہ ہیں۔ اُن پر مخمل کی پوشش ہے، ان کی قیمت ایک روپیہ فی نشست ہے۔ ان سے پیچھے لکڑی کے بنچ آٹھ آنہ فی نشست کے ہیں اور سب سے پچھلا حصہ دو آنے فی سیٹ کا ہے۔ لیکن آپ تو روپے والی ہی سیٹیں لیجئے گا نا ـــــ آپکے لئے کتنی سیٹیں ریزرو ہوں گی؟

بازیگر۔ اُو۔ تم مجھ کو سمجھے نہیں کہ میں کون ہوں۔

پریتم۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارا فرض ہر شخص کی خدمت کرنا ہے کمپنی آپ کی اس توجہ کے لئے آپ کی بہت ممنون ہے۔

بازیگر۔ میں خوابوں کی تخلیق کرتا ہوں۔

پریتم۔ کیا کہا؟

بازیگر۔ میں خوابوں کی تخلیق کرتا ہوں ـــ ان خوابوں کی جو کہ انسان کی تمام زندگی کا نچوڑ ہیں۔ اور جن کو ہر شخص سوتے جاگتے۔ اٹھتے بیٹھتے دیکھا کرتا ہے۔

پریتم۔ یا تو آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ یا عمر کی زیادتی نے آپ کے اعصاب کو کمزور اور آپ کے دماغی توازن کو الٹ پلٹ کر دیا ہے

بازیگر۔ پریتم تم کو میری باتوں پر یقین نہیں آتا۔ لیکن دنیا میں زیادہ تعداد اُن آدمیوں کی ہے۔ جو میری باتوں کو بلا کسی حیل و حجت و پس و پیش کے مان لیتے ہیں ـــــ میرے بنائے ہوئے خواب دلوں کو خوشی اور مسرت سے لبریز کر دیتے ہیں ـــــ تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ یہ ننھی منی چڑیاں کہاں کہاں غائب ہو جاتی ہیں یہ سب میرے کارخانے میں آتی ہیں اور مجھ کو بتاتی ہیں کہ اس دنیا میں کس کس کو خوابوں کی ضرورت ہے۔

پریتم۔ کیا آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ میں آپ کی اس لنترانی پر ایمان لے آؤں گا

بازیگر۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ جب پھول مرجھا جاتے ہیں تو ان کا رنگ کہاں جاتا ہے۔ اور جاڑے میں ننھی ننھی رنگین سلیوں کا کیا حشر ہوتا ہے ـــــ اور برسات کے جگنو جگ مگ جگ مگ کرتے یٹ بنے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔؟

پریتم۔ نہیں یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا۔

بازیگر۔ دنیا کی ہر حسین چیز جو بے دردی اور لاپرواہی کا شکار رہتی ہے میرے کارخانے میں امان پاتی ہے ـــــ اور وہاں میں بیٹھ کر اپنا وہ مشہور خواب بناتا ہوں جسکو یہ دنیا والے محبت کہتے ہیں

پریتم۔ لیکن آپ کی محبت تو ـــــ

بازیگر۔ کیا تم محبت میں یقین نہیں رکھتے۔

پریتم۔ کچھ کچھ ـــــ میری تمام زندگی محبت کی اس گتھی کو سلجھانے میں صرف ہوئی ہے۔ لیکن میں کم از کم اپنی کوشش میں ناکام رہا ـــــ محبت کا تخیل کتنا سہانا ہے۔ لیکن اس کے نتائج جب حقیقت کی روشنی میں آتے ہیں تو کتنے بھیانک اور کتنے مہیب ہوتے ہیں؟ ـــــ اس میں محبت کا کوئی قصور نہیں اس دنیا میں ایسی چیزوں کا وجود ہی سرے سے نہیں ہے جو محبت کے قابل ہوں۔

بازیگر۔ لیکن کیا پتہ کہ تم اپنی جستجو میں اصلی چیزوں کو نہ پا سکے اور نقلی مال کو دیکھکر تم نے محبت کے متعلق یہ غلط اندازہ لگایا ہو۔

پریتم۔ بہت ممکن ہے۔ لیکن اصلی اور نقلی مال کی پہچان کیا ہے۔

بازیگر۔ سینکڑوں نشانیاں ہیں جوں ہی تم کو سچی محبت ملتی ہے تمہارے

شانوں میں محبت کے سنہری پر اگ آتے ہیں اور تم میں قوت پرواز پیدا ہو جاتی ہے ——— پھر تم اس خاک جسم میں محصور نہیں رہتے بلکہ کائنات کی بلندیاں تمہاری جولان گاہ بن جاتی ہے۔ تم اڑتے ہو اور ستاروں کی قندیلوں کی رہبری میں [illegible] سیر کرتے ہو۔ میں اپنے خوابوں کو چاندنی رات میں [illegible] دیتا ہوں ——— چودھویں رات کا چاند جب پورا ہو جاتا ہے تو میں روز اس میں سے ایک ٹکڑا لیکر اپنے خواب میں ملا دیا کرتا ہوں یہاں تک کہ وہ پورا ختم ہو جاتا ہے۔

پریتم۔ آپ کی باتیں بے انتہا دلچسپ ہیں۔ تو کیا تمام خواب یہ [illegible] ہیں۔

بازیگر۔ [illegible] میرے پاس اور بھی بہت سے قاصد [illegible] گھڑیال بارہ بجاتا ہے۔ اور ساری دنیا اسکے [illegible] اس وقت [illegible] اور سناٹے [illegible] میرے کارخانے میں آتا ہے۔ میں اسکو [illegible] چشمے میں غسل دیتا ہوں اور کہتا ہوں جاؤ [illegible] ہمیشہ کے لئے لوگوں کے دلوں میں ایک مستقل یاد [illegible] کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی دن بھٹک کر پھولوں [illegible] میں پہنچ جاتا ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے کھویا جاتا ہے ——— اس کے علاوہ میں ننھے بچوں کو قدرت سے خرید لیتا ہوں۔ اور پھر ان کے لئے ایک مناسب خواب تجویز کرکے ان کے جسم میں بند کر دیتا ہوں اور ان کا پارسل بلا محصول اپنے پاس سے ادا کرکے اس دنیا میں بھیجدیتا ہوں

پریتم۔ میری تمام زندگی بھی خوابوں میں بسر ہوتی ہے۔ لیکن وہ تو اتنے مکمل نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرے خواب میری اپنی تخلیق تھے اور مجھ کو خوابوں کے بنانے میں نہ آپ کا ملکہ حاصل ہے اور نہ آپ کا تجربہ!

بازیگر۔ [illegible] نظر انداز کر جاتے ہو ——— تمہیں ان میں غم کی [illegible] دینی چاہئے تاکہ مٹھاس کی زیادتی کم ہو جائے۔ میں نے اس [illegible] کو معلوم کر لیا۔ اور اب میں ہر روز صبح شبنم کے موتیوں کو چن لیتا ہوں اور اپنے خوابوں کو آنسوؤں سے بھر دیتا ہوں۔

پریتم۔ آنسو! ——— کتنی حسین چیز؟ میں آپ کا بنایا ہوا خواب آزمانے کی کوشش کروں گا۔

بازیگر۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں صرف استقلال اور ہمت کی ضرورت ہے۔

پریتم۔ لیکن خواب تلاش کیسے کئے جا سکتے ہیں؟

بازیگر۔ بہت دن ہوئے میں نے ایک خواب بنایا تھا ——— وہ خواب تمہارے لئے بہت موزوں ہوگا۔ اس خواب کو میں نے ایک بچی میں بند کرکے اس دنیا میں بھیج دیا۔ یہ کوئی پندرہ سولہ سال کی بات ہے اب وہ بچی ایک حسین دوشیزہ ہے جسکی نیلی آنکھیں ہیں۔ اور جسکے سنہری بال اپنے حسن میں جواب نہیں رکھتے

پریتم۔ لیکن اس ذکر سے مجھے کیا فائدہ؟

بازیگر۔ جب میں نے اس کو اس دنیا میں بھیجا تھا۔ تو اس کی بلٹی کو [illegible] رکھ لیا تھا ——— وہ ابھی تک میرے پاس موجود ہے اگر [illegible] ہو تو تم اسے لے سکتے ہو۔

پریتم۔ شکریہ! لیکن اس سے فائدہ کیا؟

بازیگر۔ جس کے پاس یہ بلٹی ہوگی اس کو مال چھڑانے کا پورا حق ہوگا ——— اس میں اس کی پوری تفصیل بھی درج ہے تاکہ تمہیں پہچاننے میں [illegible] میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ سودا بہت فائدہ کا ہے۔

پریتم۔ کیا اس کے گالوں میں گلاب کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ اور کیا وہ کالے کالے [illegible] کی مالا گلے میں پہنے ہوئے ہے۔

بازیگر۔ نہیں تو۔

پریتم۔ تو وہ کوئی دوسری ہوگی۔ آپ تو مجھے یہ بتائیے کہ مجھ کو وہ کہاں ملے گی جس کو میں نے آج تماشے میں دیکھا تھا۔

بازیگر۔ بتانا میرا کام ہے اور ڈھونڈنا تمہارا۔

پریتم۔ اچھا تو میں اسے پھر ڈھونڈنے جاتا ہوں۔

بازیگر۔ اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں۔

پریتم۔ میں ابھی اسے تلاش کر لوں کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اور اسے پا لے۔

بازیگر۔ ایک آدمی کو ایک پھول کی ضرورت تھی۔

پریتم۔ (اس بے موقع بات پہ جھلا کر) پھول کی

باغباں۔ وہ اس ڈر کے مارے کہ کہیں صبح کے سیلانی تمام پھولوں کو چن نہ لیں آدھی رات کو اُس کی تلاش میں نکل گیا اور تمام رات اندھیر میں اِدھر اُدھر ٹکراتا رہا۔ لیکن پھول نہ ملنا تھا نہ ملا صبح ہوتے گھر جو پہنچا تو کیا دیکھتا ہے ایک بہت خوبصورت پھول اُس ہی کی کیاری میں کھل رہا ہے ـــــ اس لئے تم اس شخص کی صلاح پر عمل کرو جو زندگی کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہے۔

پریتم۔ اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو خیر ـــ

بازیگر بہت سارے آدمی کسی چیز کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اور وہ اپنی جستجو آنکھیں میچ کر کرتے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے جب تم اپنی دھن میں مست چلے جا رہے ہو تو تم کو کیا پتہ کہ تمہارے پاؤں کی روندن میں کیا مسلا گیا۔ اور کتنے شاہکار تمہاری بے پرواہی سے بغیر دیکھے رہ گئے۔ دل کی آنکھیں ہر وقت کھلی رکھنی چاہئیں۔ لو اپنے گیت کا یہ دوسرا اور آخری بند ـــــ میں نے تمہارے گیت کو مکمل کر دیا ہے۔

یہ گورے گورے گال	یہ کالے کالے بال
یہ پیاری پیاری گردن	یہ اُبھرا اُبھرا جوبن

یہ مایہ ہے سب مایہ ہے

کل چھوٹا ہے سنسار	ایک سچا سرجن ہار

(پریتم بازیگر کی باتوں میں اس ہی طرح غرق ہے جس طرح کچھ دیر پہلے پریتی تھی ـــ کھڑکی کے سامنے سے ایک سرخ شکل گزرتی ہے اور پریتی کمرے میں داخل ہوتی ہے)

پریتی۔ اخاہ۔ کیسی خوشی کی بات ہے کہ آپ ابھی تک یہیں ہیں۔

بازیگر۔ اب میں جا رہا ہوں۔ میں بہت سیلانی ہوں۔

پریتی (دروازہ روک کر) نہیں میں آپ کو ابھی نہیں جانے دونگی ـــ آپ کی باتوں نے میری دل کی افسردگی دھو دی۔ اور میری امیدیں پھر دوبارہ زندہ ہو رہی ہیں۔

بازیگر۔ تم بھی کرو بہر صورت کر و پریتی۔

پریتم تعجب سے ہوکر ہمارے مہمان کون ہیں؟ یہ خوابوں کی تخلیق کرتے ہیں ان کے پر رنگین تخیل اس اجڑی بستی کو زندگی اور روحانیت بخشتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شاہکار کو آج مجھے دیدیا ہے ـــــ مجھے صرف اُسے ڈھونڈنا باقی ہے۔

بازیگر۔ اچھا میرے عزیز دوستو خدا حافظ ـــ میرا کام پورا ہو چکا۔

(وہ دونوں کو نہایت تپاک سے جھک کر تعظیم دیتا ہے اور پھر نظروں سے غائب ہو جاتا ہے)

پریتی ہائیں وہ نظروں سے کہاں اوجھل ہو گئے ـــــ جیسے یہاں کوئی تھا بھی نہیں۔

پریتم۔ آج مدت کے بعد امید کی پہلی کرن دکھائی دی ہے۔ اب میں اپنی زندگی کے خواب کی تعبیر پاؤں گا میرا دل کہہ رہا ہے کہ میرے دن اچھے آ گئے۔ نامرادی و ناکامی کی کٹھن منزلیں ختم ہوئیں اور اب عیش و کامرانی کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ اب میں بہت جلد اپنی محبت کو پا لوں گا۔ اور اس کی محبت کے ناپیدا کنار سمندر میں اپنی ہستی کو ایک قطرے کی طرح ملا کر ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو غیر فانی کر دوں گا۔

پریتی۔ خدا آپ کو مبارک کرے۔ اور آپ کی دلی مرادوں کو جلد پورا کرے ـــــــــ اب ہم کو کوشش کر کے خوب کمانا چاہئے تاکہ آپکی نئی زندگی معاش کی فکروں سے پاک ہو ـــ اب میں خوب رقص کیا کروں گی ـــ اتنا رقص کروں گی کہ رقص کرتے کرتے میرے ہاتھ اور پاؤں دونوں کی طاقت جواب دیدے گی اور میں بے دم ہو کر گر پڑوں گی۔ تماشائی تعجب سے کہیں گے "ہائیں یہ رقاصہ رقص کر رہی ہے یا موت سے ہم کنار ہونے جا رہی ہے" ساز و نغموں کی وہ آواز جو جذبات پر تیل چھڑک کر دلوں کی آگ کو اور بھڑکا دیتی ہے۔ میری زندگی کی شمع کو آہستہ آہستہ بجھا دے گی ـــــ پریتم پیارے میں تمہاری زیست کی گھڑیوں کو فکروں سے پاک کر دوں گی۔ تاکہ تم دونوں چین سے رہ سکو۔

پریتم۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ پریتی ہم دونوں کو تماشے کامیاب کرنے کیلئے پوری کوشش کرنی چاہئے ـــــ میں بھی اب دلی سوز سے گایا کرونگا ـــ لاؤ اخبار کے لئے اشتہار کا مضمون لکھ لیں (میز پر سے کاغذ قلم دوات اٹھا کر لکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پکار

پکار کر پڑھتا بھی جاتا ہے۔)

خوشخبری

"اہل شہر کی خوش قسمتی سے اس شہر میں پریتم اور پریتی، دو مشہور آرٹسٹ اپنے آرٹ کا مظاہرہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔ رقص و سرود کی یہ محفل جنت نگاہ بھی ہے اور فردوس گوش بھی۔ پریتم کے گیت کانوں سے اتر کر ہمیشہ کے لئے دلوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں اور پریتی کے ساتھ کائنات کا ذرہ ذرہ وجد میں آ کر رقص کرتا ہے آپ فن کے اس مظاہرے کو دیکھ کر نہ صرف ہماری داد دیں گے بلکہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پائیں جسکا ہر ذرہ شعر و موسیقی سے لبریز ہے۔ پریتی ایک سوا سال کی ایک حسن و جمال کی دیوی ہے جس کی خود فطرت نے مشاطگی ہے۔ اس کے" ——— بال ——— کس رنگ کے ہیں؟

پریتی ——— سنہری۔

پریتم ـ کتنی عجیب بات ہے کہ دو آدمی ہمیشہ ساتھ رہیں اور ایک دوسرے کے بالوں کا رنگ بھی نہ جانیں۔

(لکھتا ہے)" اُس کے سنہری بال اور اس کی ———" آنکھیں ——— کس رنگ کی پریتی تمہاری آنکھیں؟

پریتی ـ نیلی ـ پریتم۔

پریتم ـ سنہری بال ـ نیلی آنکھیں ـ سنہری! نیلی! ـ میں بھی تو کچھ یہی سوچتا تھا ـ ہشت ـ لغو۔

پریتی کیا لغو ہے۔

پریتم ـ یہی سنہری بال ـ نیلی نیلی آنکھیں تو سب ہی عورتوں کے ہوتی ہیں نا۔

پریتی ـ ہاں پریتم ـ ہم سب یکتا کیسے ہو سکتے ـ ہر ایک تو تمہارے خوابوں میں بسنے والی دیوی کے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔

پریتم ـ آج تمہاری آواز میں کتنا رس ہے ـ میں نے اس سے پہلے اس کو محسوس ہی نہیں کیا ——— نہ میں نے یہ دیکھا کہ تمہارے سنہری بال نے ——— دیکھو میں اس پرچے میں دیکھوں جو بازیگر لے دیا تھا اس میں پوری پوری تفصیل درج ہے ———

(جیب سے پرچہ نکال کر دیکھتا ہے)

——— پریتی! ——— ذرا تم وہاں روشنی میں تو کھڑی ہو جاؤ۔

پریتی ـ کیوں آج کیا بات ہے۔

پریتم ـ ہاں بالکل نئی بات ـ دیکھو اس میں لکھا کیا ہے ———

——— پریتی خدا کے لئے سچ بتاؤ کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ـ کیا یہ سب سچ ہے ـ کیا تم اتنی ہی حسین ہو یا تم نے میری آنکھوں پر جادو کر دیا ہے ـ معلوم ہوتا ہے کہ گلاب کی تازگی کو تم نے اپنے جسم میں سمو لیا۔

پریتی ـ پریتم ـ آج تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔

پریتم ـ پریتی ـ آخر میں نے تم کو پا لیا ـ وہ ٹھیک کہتا تھا "دل کی آنکھیں ہر وقت کھلی رکھنی چاہئے ——— بہت سے لوگ اپنی جستجو آنکھ میچ کر کرتے ہیں ——— تم کو کیا پتہ کہ تمہاری پاؤں کی روندن میں کیا مسلا گیا ——— اور کتنے شاہکار تمہاری اس بے پرواہی کا شکار ہوئے ——— میں نے تمہیں آج پہلی دفعہ دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے ـ میرا دل آج خوشی رقص کر رہا ہے۔

پریتی ـ پریتم۔

پریتم ـ میرے بازوؤں میں محبت کے سنہری پر اگ آئے ہیں ——— اور اب میں تم کو آسمان ـ چاند اور ستاروں کی سیر کراؤں گا ـ ہم دونوں محبت کے گیت گا کر فضا کو مست کر دیں گے۔

پریتی ـ پریتم آج میں کتنی خوش ہوں ـ عمر بھر میں پہلی دفعہ آج ———

پریتم ـ پریتی ـ تم مسکرا رہی ہو ـ میں تمہاری اس جاودانی مسکراہٹ کو تمہارے ہونٹوں سے ایک گلچیں کی طرح چن لینا چاہتا ہوں۔

{ دونوں ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔
{ ایک طویل بوسہ

(گھڑیال ٹن ٹن ـ ٹن ـ بارہ بجاتا ہے۔)

پریتم ـ بارہ بجے گئے رات کی اس تاریکی اور سناٹے میں جب دنیا سکھ اور چین کی چادر تانے سو رہی ہے آج کا یہ دن اُس کے کارخانے میں گیا ہے ـ وہ اس کو بقائے دوام کے چشمے میں غسل دے کر

گا۔ جاؤ ننھے گل، تم ہمیشہ کے لئے لوگوں کے دلوں میں ایک مستقل یاد بن جاؤ" ـــــ اور پھر آج کا یہ دن ہمیشہ کیلئے ہمارے دل میں ایک میٹھی یاد بن جائے گا۔

پریتی - پریتم چلو وہاں آتشدان کے پاس چل کر بیٹھیں

پریتم - چلو پریتی - آگ کے ان سرخ شعلوں کے سامنے اپنے کبھی نہ ختم ہونے والے گیت کی ابتدا کریں تاکہ اس میں ہمیشہ پہلے دن کا سا سوز رہے۔

(پریتم اور پریتی ـــــ آتشدان کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں ان کے خوش چہرے سرخ روشنی میں اور دمکنے لگتے ہیں)

پریتم (گاتا ہے) یہ ریت کی الٹی ریت ہو پیارے

پریتی - ہارن میں ہے جیت

پریتم ہار لے جیون ہار دے تن من

پریتی چاہے گر تو میت

پریتم مالکل نردھن ہوجا

جنم مرن کا ساتھی بن جا جنم مرن کا ساتھی ہو جا

پریتی - بس ایک غرض ہے تجھ سے ساجن ہو جا میرا ہو جا

یا تو مجھ کو اپنا کر لے یا خود مجھ میں کھو جا

بس تو میرا ہو جا

پریتم - (دونوں) جنم مرن کا ساتھی بن جا جنم مرن کا ساتھی ہو جا

(چھت گیری کا لیمپ گل ہو گیا ـــــ ان کے چہرے صرف آتشدان کی روشنی سے روشن ہیں - آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے)

(ڈراپ ڈاؤن)

صوفی

سماج میں عورت کا صحیح درجہ

(از خان بہادر علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری۔ ایل ایل ڈی بار ایٹ لا)

اس نازک مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ذہن میں سماج کے ابتدائی حالت کا نقشہ موجود ہو۔ جب مرد و عورت نے کشاکش حیات کا ساتھ ساتھ مقابلہ کرنا شروع کیا اور زندگی کے جملہ فرائض دونوں کو ادا کرنا پڑتے تھے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ جسمانی حالات میں تبدیلی ہوئی۔ اور مرد و عورت کے جد و جہد اور عمل کی حدیں بھی بدلتی گئیں۔ مرد نے حیوانِ صحرا سے مقابلہ کی ٹھہرائی، وہ صحرائی جانوروں کے مدمقابل آیا۔ اور کاشتکاری اور رہائش گری کی غرض سے زمین اور جنگلوں کو صاف کرنے لگا۔ عورت نازک تھی۔ اور بوجوہ مرد کی طرح ہمہ وقت متحرک نہیں ہو سکتی تھی اس سے اس نے گھر بار سنبھالا۔ اس طرح قدرت نے مرد و عورت کے فرائض کے درمیان ایک خطِ امتیاز کھینچ دیا۔ سماجی زندگی کے ارتقا کے ساتھ یہ حد بندی واضح تر ہوتی گئی۔ مرد و عورت دونوں اپنی اپنی محدود فضا میں پرورش پاتے رہے زندگی کے مختلف شعبوں میں مرد کی کامیابیوں نے اس میں فوقیت کا احساس پیدا کر دیا۔ اور عورتیں جن میں اس قسم کے مواقع کم میسر آئے۔ اپنے کو مردوں سے کمتر سمجھنے لگیں۔ ہم دونوں مرد و عورت "آزادیٔ نسواں اور مساوات" کے کتنے ہی زبردست حامی کیوں نہ ہوں لیکن ابھی تک عام خیال یہی ہے۔ کہ عورتیں مردوں سے کمتر ہیں۔ اس کا تجربہ ہمیں نہ صرف روزانہ کی زندگی میں بلکہ آرٹ اور ادب میں بھی ہوتا ہے۔ یہی عام خیال ہے جو حقوقِ نسواں کے جد و جہد اور علم برداری کے راہ میں حائل ہے مگر یہ خیال رفتہ رفتہ زائل ہو رہا ہے۔ کیونکہ عورتوں کو بھی اہمیت کا احساس ہوتا جا رہا ہے اور وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں حصہ لے کر ثابت کر رہی ہے۔ کہ جس طرح وہ اچھی بیویاں اور مائیں ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح ان میں اعلیٰ ڈاکٹر سائنس داں اور انشاپرداز ہونے کی بھی صلاحیت ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ کہ ملازمتوں اور زندگی کے بعض شعبوں میں عورتوں کا مردوں کے ساتھ اتحاد اور اشتراکِ عمل ہماری سماجی اور اخلاقی نظام کے لئے بے حد مفید ہے اس لئے مردوں کا فرض ہے۔ کہ وہ معاونت کا ہاتھ بڑھائیں اور سماجی اور سیاسی زندگی میں عورتوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم نہ کریں

اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔ کہ سماجی زندگی کا ایک معین مقصد ہے اور ضبط و نظم سماجی زندگی کے روحِ رواں۔ اگر یہ ضبط و نظم یا اعتدال صحیح سے غائب ہو جائے۔ تو سماج کو ایک ایسے انقلاب کا سامنا کرنا پڑے گا جس کا اثر جسمانی دنیا پر بھی پڑے گا۔ آج دنیا میں مختلف قوتیں برسرِ پیکار ہیں۔ جو سماج میں ایک عظیم تزلزل پیدا کر رہی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ میرے خیال میں اس کا سبب انسانی تمدن میں مردانہ عنصر کا افراط ہے۔ اور جب تک عورتیں مردوں کی معاونت نہ کریں۔ اس مشکل سے نجات ممکن نہیں عورت خلاق ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ مشرق میں دیوی کی پوجا ہوتی ہے جو عورت کی عزت و حرمت کی دلیل ہے۔ سنسکرت کا ایک مشہور قول ہے جس جگہ عورت کی پرستش ہوتی ہے۔ وہاں دیوتا رہتے ہیں۔ عورت مرد کی حیوانی قدرت کو قابو میں رکھ سکتی ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ عورت کو خدمت اشتراکِ عمل اور آزادی کے موقعے دئے جائیں مصر میں عورتوں کے عہدِ اقتدار میں جب کہ مرد و عورت کی حیثیت برابر تھی ناجائز اولاد کا نام و نشان نہ تھا۔

عورتوں کو ان کے فطری ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کے اظہار کے بہترین مواقع بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہئے۔ کہ ان کی تربیت و پرورش اس طرح ہو کہ ان کی نسوانی خصوصیات برقرار رہیں جن [illegible]

اکبر کی قنوطیت اور اس کا ارتقاء

(از جناب ڈاکٹر تصدق حسین صاحب خالد ایم۔ اے پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لاء)

اس امر پر چنداں روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کہ ایک شاعر اپنے عہد کی ملکیت ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر عظیم بالشان ہستی کی نشو ونما اور بالیدگی اس کے ماحول کے ساتھ بالالتزام ہم آہنگی ظاہر کرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ کہ وہ اپنے گرد و پیش ہی کا نتیجہ ہے۔ ہر عصر اپنے ساتھ ایک نیا عنصر لاتا ہے۔ جس کے ہمہ گیر غلبہ کے آگے ہر شخص سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ دنیا میں بڑے سے بڑا انسان بھی خواہ کتنی ہی غیر معمولی خدا داد ذہانت کا اہل کیوں نہ ہو ناگزیر اس سوسائٹی کی تہذیب دماغی اور اخلاقی رجحانات اور مقاصد کے سانچے میں ڈھل جائے گا جس میں وہ پیدا ہوا ہو۔ اس لئے اس کی تصانیف کا رنگ بھی ایک معتد بہ حصہ تک ایسی تاثرات کا نتیجہ ہوگا۔ اگر ایک زبردست شخصیت زمانہ آفرین ہوتی ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی اپنے عصر کے اثرات کو قبول کر لیتی ہے۔ اور اس کی تصانیف کی کامیابی خواہ وہ کتنی ہی جدت طراز کیوں نہ ہو قبولِ عامہ پر منحصر ہوتی ہے۔ بنا بریں ہمیں ان کو درست طور پر سمجھنے کے لئے ان اثرات کی نوعیت کو دیکھنا ہوگا۔ جو شاعر یا مصنف کے حالات کی تشکیل کا باعث ہوئے۔ جنہوں نے اس کے مذاق کی رہنمائی کی۔ اور ان کی تصنیفات کو امتیازِ خصوصی بخشا۔

بعض اوقات یہ تاثرات محض ادبی ہوتی ہیں یعنی تصانیف یا مصنفین کا اثر۔ مثلاً بر سبیل تذکرہ اگرچہ جدت آفرینی طبیعت اور رفعت تخیل نے کلام اقبال کو کتنا ہی حسن اور حقیقت کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ پھر بھی اسے مغربی ادب کے مطالعہ ہی کا نتیجہ کہا جائے گا۔

لیکن وہ تاثرات جو اکثر ادبیات کی دنیا میں انقلاب پیدا کرتے ہیں ادبی نہیں ہوتے۔ وہ تاثرات تصنیفات یا مصنفین سے نہیں بلکہ عام زندگی سیاسیات اور سوسائٹی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو ایک عصر کی زندگی میں تازہ خیالات اور دلچسپیاں پیدا کر دے۔ ہر وہ اثر جو اس کے خیالات اور حیات کے وجود تسلسل میں تنوع کی روح پھونک دے۔ ادبیات کی تصنیف میں جزو زندگی ہو کر داخل ہوتا ہے۔ ہمیں کبھی کسی ایسی تصنیف کا خیال بھی نہ کرنا چاہئے۔ جسے وقت اور ملک کے تاثرات سے محفوظ ہو کر لیا گیا ہو۔ اگر کرامول کے بعد کی تمام کتابوں میں مذہبی رنگ صاف پائش ہے۔ تو انقلاب زمن کے مختزا عصر میں ہر شاعر لوائے حریت بلند کرتا نظر آتا ہے۔ خود اردو ادب کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ کہ ہر مصنف کو اپنے عہد کے تاثرات قبول کرنے پڑتے ہیں اور اس کے خیالات قومی زندگی اور قومی جذبات کا آئینہ ہوتے ہیں لیکن ہمیں اس امر کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے۔ کہ تمام متمیز ہستیاں جو دنیا میں کسی نئے طرز امتیاز حاصل کرتی ہیں وقت اور حالات کو تبدیل کرنے میں اکثر کامیاب ہوتی ہیں۔

(۲)

اکبر کا بچپن غدر کے پر آشوب زمانہ میں گزرا۔ جب کہ اسلام کے جاہ و حشم کی سرور زماں ہندوستان پر سات سو سال جلوہ گر ہو کر یہیں کی زوال درتھک میں سپردِ بے کسی ہو گئیں۔ یہ زمانہ ایک بڑے زبردست انحطاط کا زمانہ تھا اسلام کی شان و شوکت ختم ہو چکی تھی۔ جاہ و وقار چھن چکا تھا۔ مسلمانوں کا نقارۂ اقبال افق ہند پر جھلملایا اور جھلملا کر رہ گیا۔

نحوست پس و پیش منڈلا رہی تھی
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی تھی
حالی

اس کے بعد سر سید مرحوم کا دور آیا۔ اور وہ تمدنی مذہبی تعلیمی اور ملکی مشاغل جو ان کی ذات بابرکات سے وابستہ ہیں۔ اکبر کی آنکھوں سے گزرے نیشنل کانگرس اور ایجوکیشنل کانفرنس مسلم لیگ وغیرہ ہم جو دورِ حاضر کی سیاسی اور علمی مجالس ہیں اسی زمانہ میں معرضِ وجود میں آئیں ان کی مفصل تاریخ یا اس زمانہ کے حالات کا بالتفصیل تذکرہ چنداں ضروری نہیں کیونکہ یہ [illegible]

...ن سے جملہ احباب واقف ہیں۔

(۳)

شاعری بعض صورتوں میں پیغمبری کا جزو خیال کی جاتی ہے بعض شعرا واقعات کے ماتحت اہل ملک اور اہل قوم کے لئے پیغام لاتے ہیں۔ پیغام اکثر اہل ملک اور اہل قوم کو رجوع ساتھ کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے شاعر ہر صورت، ہر پہلو اور طریقہ سے اپنا پیغام پہنچا دیتے ہیں یہ پیغام ان کی حیات طبعی حقیقت قصہ اور اضطراری جذبات کا آئینہ ہوتا ہے وہ واقعات کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں۔ وقتی حالات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ معاملات تمدنی سیاسی کہ جن میں قومی ہیجان اور ملی حیات کا راز مضمر ہو ان کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی زندگی عشرستان خاموش ہو جاتی ہے اور بالآخر ان کے واردات قلبی و احساسات ذہنی ایک پیام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ملکی اور ملی خدمت کو اپنا فرض منصبی اور کار منصبی سمجھتے ہوئے وہ جس پیام کو زندگی کا ماحصل سمجھتا ہے۔ قوم اور ملک کے پیش کرتا ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی یہ آرزو ہوتی ہے۔ کہ اسے مدرس عمل بنایا جائے۔

لفظ پیغمبر کے ان خاص اور محدود معنوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اکبر پر صادق آ سکتا ہے۔ کہ وہ اردو زبان کے ان شعرا سے ہے جو ملک اور قوم کے لئے ایک پیغام لائے۔

(۴)

اکبر کا زمانہ ادبی، تمدنی سیاسی و اجتماعی تبدیلیوں اور سرگرمیوں سے متمیز تھا۔ نئی نئی تحریکات اور نئے نئے خیالات ملک کے نوجوانوں پر اثر انداز تھے۔ اکبر جیسی ممتاز اور مشخص ہستی جو فطرۃً سوز اندروں واقع ہوئی تھی۔ ان تاثرات کو خاموش نہیں دیکھ سکتی تھی۔ دنیا نے رنگ بدلا۔ انقلابات نے [illegible] ملک کی پرانی بزم آرائیاں نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں [illegible] اپنا فرض خیال کیا تاکہ وہ بھی ان تحریکات میں حصہ لے کر ملک و [illegible] کی بہبود [illegible] لائے انہوں نے حالات ماضی حال کو پیش نظر رکھ کر اپنا [illegible] لیکن ان کی پیدائش اور پرورش قدیم [illegible] اور [illegible] ہونے [illegible] ان کی [illegible] قوم کی شان [illegible]

کھوئے جانے پر متفکر، صوفیانہ حسرت آگئیں اور حسرت تحلیل ہو چکی تھی۔ اس نے وہ فطرۃً قنوطی ہو گیا۔

بہ لحاظ کا واحد یاس انگیز اثر ہی نہ تھا جس نے اکبر کے کلام کو مرقع غم سا دیا۔ فطری رجحانات سے قطع نظر کرتے ہوئے اکبر کی طبیعت پر بہت سے بیرونی اثرات ایسے پڑے جن کا تعلق جو ان کے گھر سے تھا۔

اکبر کی پہلی مصیبت گھر سے شروع ہوتی۔ عورت انسانی زندگی کا سب سے بہترین سرمایہ ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ حیات انسانی پر جس سے زیادہ گہرا اور دیرپا اثر صنف نازک کا ہوتا ہے۔ واقعات کے تخالف نے اکبر کی زندگی کو تلخ بنا دیا جس کا نتیجہ گھر کی چار دیواری کے اندر محدود نہ رہا۔ اکبر کی طبیعت لاابالی ہو گئی جس نے آخر کار صدہا اضطراب پیہم اور کاوش پیہم کا سامان مہیا کر دیا۔

عنفوان شباب کے جذبات نہایت سرکش ہوتے ہیں اور اپنے اندر وہ قوت سحر رکھتے ہیں کہ طبیعت کو جس رنگ میں چاہیں رنگ دیں۔ اگر اکبر کی نفرت اپنی پہلی منکوحہ کے حق میں انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ تو دوسری اہلیہ کی محبت بھی اپنی نظیر آپ ہی رکھتی تھی بلبل

ہے با وجود دل بھی جواب گل پریشاں ہے۔

مشیت ایزدی کو یہ منظور نہ تھا۔ کہ اکبر کو حقیقت مسرت حاصل ہو اس لئے یہاں اس کا نحیف و زار جسم ہمیشہ طبیبوں اور حکیموں کا تختۂ مشق بنا رہا۔ وہاں روحانی صدمات بھی ہمیشہ اس کے حرماں نصیب دل پر حملہ آور ہوتے رہے۔

اکبر نے اپنے لخت جگر کو اس سرزمین میں تعلیم کے لئے بھیجا جہاں ان کے قول کے مطابق "بڈھے بھی روش دین خدا بھول جاتے ہیں۔" اور وہ تو نوجوان تھا۔ اپنے گھر کو بھول گیا۔ اور ایسا بھولا کہ واپس آنا قسم تھا۔ ایک باپ کے لئے اس سے زیادہ کیا صدمہ ہو سکتا ہے؟ مغربی تعلیم اور اس کے اثرات کے متعلق جو ان کے خیالات ہوئے۔ ان پر ہم بعد میں بحث کریں گے لیکن جو [illegible] اس حرماں نصیب کو ہوا ہوگا۔ وہ ان اشعار سے ٹپک رہا ہے۔ جو اس نے اس موقع پر کہے۔

جینے پہ تو ہاں اہلِ جہاں دیتے ہیں اکبر
لیکن تجھے دشوار ہے معلوم نہیں کیوں

سوال کی بے تکلفانہ سادگی، الفاظ کا مضطرب ترنم اور حال کا بے ساختہ پن قلب و صدر کی نہ ملنے والی حالت کو ہمارے سامنے آشکار کر دیتے ہیں۔

لیکن اس ہجومِ یاس کا سبب؟ وہی جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اور جسے اکبر ان الفاظ میں ادا کرتا ہے ؎

دلِ مایوس میں وہ شورشیں برپا نہیں ہوتیں
امیدیں اس قدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں

اکبر کا دل رنگِ باغِ ہستی سے اس قدر کملا گیا کہ اس کے لئے فصلِ گل کی طرب افزا ہوائیں بھی سامانِ نشاط نہ ہو سکتی تھیں[1]۔

آئے دن متواتر مصائب کا نزول اس قدر حوصلہ شکن ثابت ہوتا ہے کہ اکبر میں برداشت کی تاب نہیں رہتی۔ اور وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے ؎

آماجگاہِ سرِ حوادث ہوں رات دن!
پسلا ہوا ہوں غمِ روزگار کا

(۸)

جب تکالیف کا یہ عالم ہو۔ تو کون ہے جو حظِ لطفِ زیست سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ کہ اسے طمانیتِ قلب حاصل ہو۔ اور روح جلتارِ غم سے آزاد۔ جو دل اضطرارِ پیہم کے ہاتھوں درد کا پتلا بن چکا ہو۔ اسے خوشی کہاں۔ اس لئے وہ جذبہ جو ان الفاظ میں منتقل ہے ایک حقیقی جذبہ ہے۔

خوشی کا رنگ ہے دل میں نہ سرسبزی امیدوں کی
ہمارا باغ ویراں ہو چکا گل ہے نہ بوٹا ہے!

دنیا کے ویرانے میں اکبر زندہ رہا۔ تو زندگی کے دن پورے کرنے کے لئے زندہ رہا۔ ورنہ اسے کوئی حظِ زیست حاصل نہ تھا۔

رنگ تیرا ہمیں مطبوع نہیں اے دنیا!
تجھ میں ہم جی تو رہے ہیں مگر اکراہ کے ساتھ
لذتِ زندگانی کی کہاں اس تلخ کامی میں
خدا کا حکم ہے جیتے ہیں مگر اکبر مزا کب

جب انسان پر ہر طرف سے بلائیں ٹوٹ پڑتی ہیں تو پہلے پہل وہ ان کے دفعیہ کا تدارک کرتا ہے۔ لیکن جب دیکھتا ہے کہ غم و حسرت کے سوا اس کی قسمت میں اور کچھ نہیں۔ تو انتہائے یاس میں وہ وہی کہتا ہے۔ جو اکبر نے کہا ؎

نشتر لگائے جا تو اے رنجِ نوا بیدل
دل کو ابھی تکان باقی ہے جوشِ خوں کی

یہ تھی ارتقائے یاس کی تیسری منزل جس کی تصویر اکبر نے اس طرح کھینچی ؎

ہر ارادے میں نظر آتی ہے اک صورتِ یاس
شغل اب کچھ بھی نہیں نسخِ عزیمت کے سوا

یاس کے اس تیسرے دور میں اکبر نے چند اشعار ایک بحر میں کہے ہیں جس پر وہ اس سے پینتیس سال پہلے طبع آزمائی کر چکا تھا طبیعت کی پختگی کے علاوہ تاثراتِ خارجی و داخلی کا جو اثر اس کے دل پر ہوا۔ اس کی سب سے بہتر مثال غالباً ان اشعار کے بعض مضمون کے مقابلہ سے مل سکتی ہے ہم دونوں غزلوں کو نقل کرتے ہیں۔ تاکہ ادبیات کے طالب علم شاعر کے قلبی احساسات کے ارتقا کا اندازہ کر سکیں۔

(۹) لیکن ع رنج سے خوگر ہوا تو مٹ جاتا ہے رنج

اکبر نے اپنی زندگی میں وہی تجربہ حاصل کیا جو غالب نے آج سے ۶۰ سال پیشتر کیا۔ اس کا درد بھی آخر دور ہو کر رہا۔ ؎

کچھ غم نہیں اگر میں مایوس ہو گیا ہوں
اب یاس سے بہت کچھ مانوس ہو گیا ہوں

اس جگہ سے ارتقاءِ یاس کی چوتھی منزل کا آغاز ہوتا ہے [illegible] افسردہ چمن میں نسیمِ چمنِ طور کا گزر ہوتا ہے امیدیں اپنی [illegible]

---

[1] ہوا بھی اس قدر افسردہ رنگِ باغِ ہستی سے۔ ہوائیں فصلِ گل کی بھی نشاط افزا نہیں رہتیں۔

حکومت ہند کے پہلے ہندوستانی رکن کا تقرر

از مولوی محمد اظہار الحسن بی اے ایل ایل بی (علیگ) وکیل غازی آباد

برطانوی عہد حکومت میں ہندوستان کی سیاسی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں کئی برس کی مسلسل تحقیقات اور مجلس آرائیوں کے بعد بالآخر ۱۹۳۵ء میں جدید آئین پارلیمنٹ سے پاس ہو گیا۔ اور ملک معظم نے بھی اپنی منظوری عطا فرمادی یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے اس کا نفاذ صوبوں میں ہو گیا۔ موجودہ آئین میں حکومت ہند قطعی طور پر غیر ذمہ دار ہے۔ گورنر جنرل کی مجلس انتظامیہ کے اراکین کا تقرر ملک معظم کے دست اختیار میں ہے اور ان اراکین کی ذمہ داری صرف گورنر جنرل اور ہوم گورنمنٹ کی خوشنودی تک محدود ہے ملک کے منتخب کردہ نمائندوں کو یہ اقتدار حاصل نہیں ہے کہ وہ اراکین مجلس انتظامیہ کو اپنی رائے پر چلا سکیں۔ یوں نو نظام حکومت میں دو مجالس قانون ساز یعنی کونسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی بھی شامل ہیں لیکن ان کی حالت زیادہ تر بے ستند گنبد بے در (؟) ... بر حاسند کی مصداق ہے۔ اسمبلی اور کونسل سے کچھ بھی کیوں نہ منظور ہو گورنر جنرل ان کے فیصلوں کو ایک جنبش قلم مسترد کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مانٹگو چیمسفورڈ اصلاحات کے دور میں ایک دو نہیں متعدد مواقع ایسے پیش آئے جب گورنر جنرل نے اپنے اختیارات خصوصی کو کام فرمایا۔ قانون جدید کی رو سے صوبائی خود اختیاری کے علاوہ مرکزی حکومت میں بھی ایک حد تک ذمہ داری منظور کی گئی ہے۔ بظاہر حکومت ہند کا غالب حصہ ہندوستانیوں پر مشتمل ہوگا لیکن تحفظات کی شق سے ان کے اختیارات کی باگ ڈور گورنر جنرل اور ان کے مشیران خصوصی کے ہاتھ میں رہے گی ہندوستان میں ہر طبقہ اور ہر خیال کے سیاسی رہنماؤں نے بالاتفاق آئین جدید کو مایوس کن قرار دیا ہے۔ اور بجا طور پر اس کے خلاف احتجاج کیا جا رہا ہے یہ سب کچھ بجا اور درست لیکن آج سے تیس چالیس سال پہلے کی حالت پر نظر ڈالئے۔ اور موجودہ کیفیت سے موازنہ کیجئے۔ تو طرز حکومت میں حیرت انگیز انقلاب نظر آئے گا۔

۱۸۵۸ء میں ملکہ معظمہ وکٹوریہ آنجہانی نے ہندوستان کی زمام حکومت آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ سے نکال کر خود اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ اس موقع پر جو مشہور فرمان شاہی ملکہ معظمہ نے شائع کیا تھا۔ اس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ سرکاری مناصب پر تقرر کرنے میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے گا لیکن پوری نصف صدی تک یہ وعدہ شرمندۂ ایفا نہ ہوا۔

۱۸۶۱ء تک قانون سازی کے فرائض کلیتہ برطانوی حکام کے سپرد تھے۔ اس سال لیجسلیٹو کونسل کی ترمیم از سر نو ہوئی۔ اور بعض غیر سرکاری اراکین نامزد ہونے لگے۔ اگلا قدم ۱۸۹۲ء میں اٹھایا گیا۔ جدید انڈین کونسل ایکٹ کی رو سے ہندوستانی ممبروں کے تقرر میں انتخاب کا عنصر شامل کیا گیا اور بعض غیر سرکاری اراکین کونسل منتخب ہونے لگے۔ اس کے بعد لارڈ منٹو کے عہد تک صورت حالات یہی رہی۔ پھر منٹو مارلے اصلاحات کا نفاذ ہوا۔ اور ہندوستانیوں کو قانون سازی میں مزید دخل دیا گیا۔ پہلی مرتبہ مجالس قانون ساز میں غیر سرکاری ہندوستانی اراکین کو اکثریت حاصل ہوئی

"۱۹۲۱ء تک برطانوی ہند میں گورنر جنرل باجلاس کونسل ہی کو تمام ملک میں سول اور ملٹری حکومت کی سرکاری کارروائی کی ذمہ داری کا اعلیٰ ترین منصب حاصل تھا۔"

شہنشاہ جارج پنجم کے تاریخی اعلان مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء میں ... ترقی کی تاریخ کا خلاصہ یوں کیا گیا ہے۔

مسئلہ پر غور کرنے کے لئے مقرر کر دی تھی۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۰۶ء کو انہوں نے پھر لارڈ مارلے کو لکھا

"میں جتنا غور کرتا ہوں۔ اتنا ہی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں ایک ہندوستانی کے تقرر کے حق میں ہوتا جاتا ہوں لیکن پوری تیاری ضروری ہے۔ بعض میں اس معاملہ میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کرنا چاہتا"

لارڈ مارلے اس رائے سے متفق ضرور رہے لیکن انہیں انگلو انڈین کی جانب سے خطرہ تھا کہ جس طور پر البرٹ بل[2] کا ہنگامہ برپا ہوا تھا اس طرح سر بی فلر SIR. B FALLER کی حمایت میں سور و غل مخالفت۔ اسی طرح پھر شروع نہ ہو جائے۔ چنانچہ ۲۳ نومبر کو جو مراسلہ انہوں نے وائسرائے کو لکھا اس میں انہی دقتوں کا ذکر ہے۔ اس کے باوجود وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں کا مطالبہ پورا کرنا ہوگا۔ مراسلہ میں انہوں نے لکھا تھا۔

"دوسری جانب میں اپنے دل میں سوچتا ہوں۔ کہ آپ کی کونسل میں ایک ہندوستانی کے تقرر کو کب تک روکا جا سکتا ہے درانحالیکہ خود آپ کی کمیٹی کے چار اراکین میں سے دو اس امر سے نہیں ڈرتے"۔

وہ یہ سمجھتے تھے کہ وائسرائے اور وزیر ہند کی کونسل میں ایک ہندوستانی کا تقرر کر دینا ہندوستانی سیاسیوں کی تالیف قلوب کا باعث ہوگا۔ اس سے حکومت کو کوئی ضعف نہیں پہنچے گا۔ جنوری ۱۹۰۷ء سے قبل لارڈ منٹو نے اس بارے میں قطعی رائے قائم کر لی تھی۔ ان کو اس تجویز کی صحت میں کوئی شبہ نہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی سیاسیین کے مطالبات کا بہترین جواب یہی تقرر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اول تو اس کی مخالفت اتفاق رائے سے نہ ہوگی دوسرے وہ لوگ بھی جو اس تجویز کے مخالف ہیں۔ رفتہ رفتہ مائل ہو جائیں گے۔ کونسل والوں کو اعتراض تھا کہ امور سلطنت میں کسی ہندوستانی کو راز دار بنانا ممکن نہیں۔ اور اس قسم کے تقرر کے معنی کانگریس کے سامنے جھک جانے کے ہوں گے۔ ان اعتراضات کو وہ تنگدلی پر محمول کرتے تھے کانگریس والوں کی ۱۸۸۶ء سے زیادہ پروا نہ تھی لیکن ملک کے تعلیم یافتہ اور اعتدال پسند طبقہ کا انہیں ضرور لحاظ تھا۔ جو سیاسی ترقی کا طلبگار تھا۔ اور جس کے متعلق انہیں اندیشہ تھا۔ کہ کہیں مایوس ہو کر کانگریس میں شامل ہو جائے

۶ مارچ ۱۹۰۷ء کو لارڈ منٹو نے کونسل کا اجلاس کیا۔ اصلاحات کے موضوع پر سرکاری مراسلہ کا مسودہ زیر بحث تھا۔ نیٹو ممبر کے متعلق صرف مسٹر بیکر کو وائسرائے سے اتفاق تھا۔ مخالفین میں سب سے زیادہ باثر لارڈ کچنر تھے۔ جن کے نزدیک یہ تجویز نظام حکومت کو درہم برہم کر دینے کے مترادف تھی۔ بالآخر ۲۹ مارچ کو حکومت ہند کا مراسلہ روانہ کر دیا گیا جب یہ مراسلہ انڈیا آفس میں موصول ہوا۔ تو لارڈ مارلے نے ۷ یا ۸ ممبروں کی ایک کمیٹی میں اس کو غور کرنے کے لئے پیش کر دیا۔ خود کوئی رائے مخالفت یا موافقت میں پیش نہیں کی۔ البتہ بعد میں بعض ممبروں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ سر تھیوڈور ماریسن[3] تک نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہوئی۔ کہ آپ لیڈر آف دی اپوزیشن Leader of the opposition کو کابینہ کا رکن مقرر کر دیں۔ کونسل کی متفقہ مخالفت سے متاثر ہو کر لارڈ مارلے اس خیال کو ترک کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۰۷ء کو انہوں نے لارڈ منٹو سے دریافت کیا۔

"اگر یہ معاملہ مخصوص تجویز گرجانے۔ تو کیا یہ امر پوشیدہ رکھا جا سکتا ہے کہ ایسی تجویز پیش ہوئی تھی۔ اور آپ اس کے حق میں تھے یا نہ

---

[2] لارڈ رپن کے عہد میں ایک مسودہ قانون پیش ہوا تھا جس کی رو سے ہندوستانی مجسٹریٹوں کو یورپین ملزموں کے مقدمات کی سماعت کا اختیار دیا جانا تجویز ہوا تھا انگلو انڈین طبقہ نے اس بل کے پیش ہونے پر ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بالآخر یہ بل ناکام رہا۔

SIR B FALLER صوبہ مشرقی بنگال کے لفٹنٹ گورنر تھے ان کے عہد میں کالجوں کے طلبہ نے حکومت ہند کے بعض احکام کی خلاف ورزی کی۔ فلر صاحب اس جرم کی پوری سزا دینا چاہتے تھے۔ لارڈ منٹو نے موقعہ کی نزاکت کے لحاظ سے اس کی اجازت نہ دی۔ سر بی فلر اس پر آزردہ ہو کر مستعفی ہو گئے۔ لارڈ منٹو نے استعفا منظور کر لیا۔

[3] علی گڑھ کالج کے مشہور پرنسپل اس زمانہ میں انڈیا کونسل کے ممبر تھے۔

بہت اہم ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات ظاہر ہوگئی۔ تو میرے خیال میں سرکاری اور غیر سرکاری یوروپین حلقہ میں آپ کے اقتدار اور ہر دلعزیزی کو کم کرنے کا باعث ہوگی۔ اس کے برعکس اگر میں اس کا مجوز ہوتا۔ اور یہ بات ظاہر ہو جاتی کہ میں آپ کی کونسل میں کسی کا تقرر کرنے کی بجائے بادشاہ کی کونسل میں ایک یا دو ہندوستانی ممبروں کا تقرر کرتا۔"

لیکن لارڈ منٹو اپنی رائے پر قائم رہے۔ انہوں نے جواب دیا "یہ امر پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ ایک حد تک پیاس کر لے گی کہ اس مسئلہ پر سرکاری طور پر غور کیا جا سکتا ہے جہاں تک اینگلو انڈین طبقہ کا تعلق ہے۔ اس مسئلہ پر دو فریق ہو جائیں گے مخالف اور موافق ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ اختلاف کرنے والے مخبر پیدا کریں گے اگر تقرر عمل میں آگیا۔ تو شور رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے ورنہ ایک نیا ایجی ٹیشن شروع ہوگا جس میں اعتدال پسند ہندوستانی بھی شریک ہوں گے۔ اور بہت سے اینگلو انڈین لوگوں کو بھی ہمدردی ہوگی اور یہ خیال کیا جائے گا کہ وائسرائے اور (میں سمجھتا ہوں کہ یہ قیاس کر لیا جائے گا کہ آپ بھی اس رائے سے متفق تھے) معقول برطانوی رائے عامہ کو نوکر شاہی کی مخالفت کے آگے جھکنا پڑا۔ بہر صورت ہنگامہ ہوگا۔ اگر کسی ہندوستانی کا تقرر ہوگیا۔ تو شور و غل رفتہ رفتہ دھیما پڑ جائے گا لیکن تجویز کے نامنظور ہونے کی صورت میں ہندوستانیوں کی توقعات اور عام خیال ہمارے مقابلہ میں صف آرا ہوں گے اور ایک عظیم الشان جھگڑا پیدا ہوگا جس میں ہماری شکست یقینی ہے۔"

لیکن لارڈ مارلے نے ۲۶ اپریل کو پھر یہ دیکھا کہ نیشو ممبر کی مخالفت
[illegible] انڈیا کونسل میں ایک دو ہندوستانیوں

۲۰ مئی ۱۹۰۶ء کو حکومت ہند کا مراسلہ کابینہ میں پیش ہوا بہت شدید مخالفت ہوئی۔ لارڈ رپن سے بھی جن کی ہندوستان دوستی مسلم تھی۔ مخالفت کا ساتھ دیا۔ اور اس خیال کا اظہار کیا۔ کہ خارجی امور پر بات کسی ہندوستانی کا واقف ہونا مناسب نہیں لارڈ کرزن (سابق وائسرائے) کو بھی کچھ اسی قسم کا اختلاف تھا۔ سر ہیری ماونر شروع سے آخر تک مخالف رہے۔ خود لارڈ مارلے کو بھی یہ اطمینان نہ تھا۔ کہ ایک ہندوستانی کے تقرر سے اتنا فائدہ ہوگا کہ یوروپین طبقہ کی مخالفت اور ہنگامہ آرائی مول لی جائے۔ اس لئے کابینہ کا فیصلہ تجویز کے حق میں نہ ہوا۔ البتہ تصفیہ کے طور پر یہ سمجھوتہ ہو گیا۔ کہ وائسرائے کی کونسل کے بجائے انڈیا کونسل میں ایک یا دو ہندوستانیوں کا تقرر کر دیا جائے کچھ عرصہ کے لئے لارڈ منٹو کو اسی پر قناعت کرنا پڑی اگر ان کی مستحکم رائے تھی کہ ہندوستانیوں کو نظام مملکت میں مزید حصہ دینے کا وقت آچکا تھا۔ تھوڑے عرصہ کی خط و کتابت کے بعد قرعہ فال مسٹر کرشنا گوبند گپتا آئی سی ایس[1] اور مسٹر سید حسین بلگرامی کے نام نکلا اور بالآخر ۲۶ اگست ۱۹۰۷ء کو لارڈ مارلے نے ملک معظم کے حضور میں یہ دو نام انڈیا کونسل میں تقرری کے لئے پیش کر دئے۔ اور بارگاہ شاہی سے منظوری عطا ہو گئی

اگرچہ لارڈ منٹو کو فی الحال ناکامی ہوئی لیکن انہوں نے یہ خیال قطعی ترک نہیں کیا۔ تقریباً ایک سال کے بعد یکم جولائی ۱۹۰۸ء کو انہوں نے جو مراسلہ لارڈ مارلے کو بھیجا۔ اس میں پھر ہندوستانی ممبر کے تقرر پر زور دیا اور یہ خیال ظاہر کیا۔ کہ محکمہ قانون میں کسی ہندوستانی بیرسٹر کا تقرر کر دیا جائے اس کے لئے کوئی آئینی دقت سد راہ نہ تھی۔ اور نہ کسی جدید قانون کی ضرورت تھی۔ قانون کے شعبہ میں ہندوستانیوں نے کافی نام پیدا کیا تھا۔ اس لئے لارڈ منٹو کے نزدیک محکمہ قانون ہی سے ابتدا کرنا تھا۔ اسی مراسلہ میں انہوں نے مسٹر سنہا اور ڈاکٹر مکرجی کے نام تقرر کی غرض سے پیش کئے تین ہفتہ کے بعد ۲۱ جولائی ۱۹۰۸ء کو لارڈ مارلے نے یہ سلسلہ پھر چھیڑا اور مسٹر سنہا کے تقرر کی سفارش کی۔

بحیثیت ایڈووکیٹ جنرل وہ فی الحال ہمارے مشیر قانونی ہیں

---

[1] ممبر بورڈ آف ریونیو بنگال [2] رکن وزارت حضور نظام سابق ممبر امپیریل لیجسلیٹو کونسل

قومیت کے سوال سے قطع نظر قدرتی طور پر انہیں
حکومت کے اندرونی حلقہ میں شریک کرنا چاہئے"۔

اس مراسلہ میں لارڈ منٹو نے یہ بھی ظاہر کیا۔ کہ یہ تجویز اس رائے سے مختلف تھی۔ جو سابق میں پیش کی گئی تھی۔

"یہ تقرر اس سے قطعی مختلف ہوگا۔ جس پر اٹیڈن کمیٹی نے
غور کیا تھا۔ ان کے پیش نظر تو یہ مسئلہ تھا۔ کہ آیا ہم کو ایسے
ممبر کے تقرر کی ذمہ داری اپنے سر لینی چاہئے یا نہیں
لیکن سنہا کا تقرر کرنے میں ہم لوگ اپنے اختیارات
سے تجاوز نہیں کریں گے۔ کسی جدید قانون کی ضرورت
نہیں ہوگی۔ نیٹو کے تقرر کے خلاف کوئی قانون موجود
نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم اس عظیم الشان اصول
کو بھی تسلیم کر لیں گے جس پر بہت کچھ منحصر ہے۔ یعنی
کسی منٹو جنٹلمین کو حکومت میں حصہ لینے سے باز نہیں
رکھا جائے گا۔ اگر وہ اس عہدہ کے لئے مناسب اوصاف
سے متصف ہے"۔

۱۴ر اگست کو لارڈ منٹو نے اصلاحات کا جو خاکہ پیش کیا۔ اس میں بھی ایک وہ ہندوستانی ممبر کے تقرر کے متعلق رکھی۔ اس درمیان میں حالات اس قدر تبدیل ہو گئے تھے۔ کہ وائسرائے کو سوائے لارڈ کچنر کے اپنے اکثر رفقائے کار سے اس مسئلہ میں اختلاف رائے کی امید نہ تھی۔ اینگلو انڈین پریس کے متعلق بھی خیال تھا۔ کہ موافق اور مخالف آراء میں تقسیم ہو جائے گا۔ اس طور پر سرکاری رائے عامہ کی تائید کی توقع تھی۔ لارڈ مارلے نے بھی اب ایسی رائے قائم کر لی تھی۔ چنانچہ ۲۰ ستمبر کو وہ لکھتے ہیں۔

"جہاں تک آپ کی کونسل کے ہندوستانی ممبر کا تعلق ہے
بلاشبہ جگہ خالی ہونے پر وزیر ہند چاہے تو ملک معظم
سے کسی ہندوستانی کے تقرر کی سفارش کر سکتا ہے۔
آپ جانتے ہیں کہ اس مسئلہ میں مجھے آپ سے کس قدر
اتفاق ہے"۔

لارڈ منٹو اگرچہ ہندوستانی ممبر کے تقرر کے اس قدر موید تھے
وہ بھی اس کو مستقل بنانے کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ ۲۴ ستمبر کو
اصلاحات کے اعلان کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

"میں یہ مشورہ نہ دوں گا۔ کہ ہندوستانی ممبر کے تقرر کا اعلان
کسی فرمان کا جزو ہو۔ بلکہ یہ تقرر معمولی ضابطہ کے تحت میں
ہونا چاہئے۔ فرمان شاہی کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس
تقرر کی خبر بھی اخبارات میں شائع کر دی جائے۔ پریس
اور پبلک اس کارروائی کا منشا سمجھنے سے قاصر رہے گی
اگر اس کو فرمان کا جزو قرار دیا گیا تو یہ سمجھ لیا جائے گا
کہ وائسرائے کی کونسل میں ایک ممبر بہرصورت ہندوستانی
ہوا کرے گا۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے۔ کہ یہ عہدہ
صرف قابلیت کی بنا پر ملنا چاہئے"۔

جنوری ۱۹۰۹ء میں وائسرائے اور وزیر ہند دونوں نے کر لیا۔ کہ ہندوستانی ممبر کا تقرر کر دیا جائے۔ وزیر ہند کی کونسل امر خلاف تھی۔ ان کا خیال تھا۔ کہ والیان ریاست اس امر کو پسند نہ کریں گے کہ عوام میں سے کوئی شخص اس منصب پر فائز ہو۔ جہاں ان کے طے کئے جاتے ہیں۔ ہاؤس آف لارڈز (دارالامرا) سے بھی تجویز کے منظور ہو جانے کی توقع نہ تھی۔ مخالفت پھر شدید ہو گئی۔ چنانچہ ۴ر فروری کو لارڈ مارلے نے وائسرائے کو لکھا۔

"میں اسے سکون سے برداشت کر رہا ہوں۔ جب یہ
خبر عام ہوگی۔ اس وقت دنیا کو تعجب ہوگا۔ کہ آخر
اس قدر شور و غوغا کیوں تھا"۔

اور آخر یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں۔

"اگر یہ تجربہ کامیاب نہ ہوا۔ تو دوسرا وزیر ہند کالے کی
جگہ گورے کو دے سکتا ہے"۔

کبھی کبھی لارڈ مارلے کا ارادہ ہوتا تھا۔ کہ براہ راست بادشاہ کے حضور میں اپنی سفارش پیش کر کے اس قضیہ کا خاتمہ کر دیں اندیشہ تھا۔ کہ اگر اس کو بل کا جزو بنایا گیا۔ تو

سکے گا۔ لیکن چونکہ لارڈ لینسڈون Lord Lansdowne اپنے اختلاف رائے کی اطلاع انہیں دے چکے تھے۔ اس لئے دارالامرا کے مباحثے سے قبل یک لخت تقرر کر دینا بھی مناسب نہ تھا۔ اس کے باوجود لارڈ مارلے نے یہ تہیہ کر لیا تھا۔ کہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ دارالامرا سے اصلاحات کا بل پاس ہونے کے بعد ہی یہ تقرر کر دیا جائے۔ دارالعوام سے زیادہ مخالفت کی امید نہ تھی۔ بلکہ تائید کی توقع تھی۔

۲۴ر فروری کو ملک معظم سے لارڈ مارلے کی گفتگو ہوئی۔ مہنشاہ ایڈورڈ ہفتم نے بڑے خلوص سے اس رائے کی مخالفت کی لیکن لارڈ مارلے نے اسے قبول نہیں کیا اور جواب میں عرض کیا۔ کہ اب اس سوال کو واپس لینے کے معنی اصلاحات کی گاڑی کو بے کار کر دینے کے ہیں۔ ۱۰ مارچ کو لارڈ مارلے نے سوال کابینہ میں پیش کیا اور سنہا کے متعلق وائیسرائے کی رائے پڑھ کر سنائی۔ کابینہ نے بالاتفاق رائے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اسی دن لارڈ مارلے نے ایک مفصل عرضداشت ملک معظم کے حضور میں روانہ کی اور اس کے ساتھ وائسرائے کی تحریر بھی ملفوف کر دی۔ کابینہ کے متفقہ فیصلہ کا ذکر کیا۔ اپنی ذمہ داری کا اعتراف کیا۔ اور ملک معظم کے شکوک کے ازالہ کی پوری کوشش کی۔ ملک معظم نے اس تمام کارروائی کے خلاف بڑے جوش سے احتجاج کیا لیکن کابینہ کے متفقہ فیصلہ کے آگے وہ مجبور تھے۔ اس کے جواب میں وزیر ہند نے باضابطہ اپنی تجویز پیش کر دی۔ اور اس کے ساتھ ایک خط میں ملک معظم کو تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس تجویز کے خلاف معقول دلائل کے وزن کو تسلیم کیا لیکن یہ عذر کیا۔ کہ اس موقع پر حتیم پوشی کرنے سے ہندوستان میں اصلاحات کا خیر مقدم نہ ہوگا۔ اور عرض کیا۔ ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے وعدہ کا ایفا اسی تقرر سے ہو سکتا ہے۔

بالآخر ۲۴ مارچ ۱۹۰۹ء کو آنریبل مسٹر ستیندر پرسن سنہا کے تقرر کا سرکاری اعلان شائع کر دیا گیا۔ اور پہلی بار گورنر جنرل کی مجلس انتظامیہ میں ہندوستانی رکن مقرر ہوا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں بلا لحاظ ملت ہر طبقہ و فرقہ کے اشخاص نے اظہار شادمانی کیا مسلمانوں کے طبقہ سے کوئی قابل لحاظ مخالفت نہ ہوئی والیان ریاست نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ مہاراجگان بیکانیر اور گوالیار جب مسٹر سنہا کے تقرر کے بعد پہلی مرتبہ شملہ میں آئے۔ تو اول ہی دن ان سے ملنے گئے اور مہاراجہ بیکانیر کھانے میں بھی شریک ہوئے

مسٹر ایس پی سنہا جو کبھی انڈین نیشنل کانگرس کے صدر تھے۔ منٹو مارلے اصلاحات میں پہلے ہندوستانی ممبر قانون ہوئے مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے سلسلہ میں ہاؤس آف لارڈز کے پہلے ہندوستانی رکن قرار پائے۔ اور نائب وزیر ہند کے عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ اس کے بعد بہار کے پہلے ہندوستانی مستقل گورنر مقرر کئے گئے۔ اور آخر عمر میں پریوی کونسل کے رکن رہے۔

ہنڈن برگ

فیلڈ مارشل فان ہنڈن برگ آنجہانی کی خود نوشتہ سوانح حیات کا ایک ورق

مترجمہ
انیس الدین احمد رضوی امروہی ایم اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

آغاز

واقعات و سوانح، جو آئندہ صفحات پر درج ہیں مصنف بننے کی خواہش کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس کا مقصد۔ ان متعدد تحریکات و گزارشات کی تعمیل ہے۔ جو وقتاً فوقتاً مجھ سے کی گئیں۔

میرا مطمح نظر کوئی "تاریخی کتاب" لکھنا نہیں۔ بلکہ ان اثرات کی ترجمانی کرنا ہے۔ جن کے تحت میری زندگی بسر ہوئی ہے۔ اور ان اصول کی توضیح کرنا ہے جن پر سوچ سمجھ کر عمل کرنے کو میں اپنا فرض سمجھتا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ کوئی امر میرے ذہن سے بعید نہیں ہو سکتا۔ کہ کچھ "عذر گناہ" کے طور پر تحریر کروں۔ یا کوئی اخلاقی تصنیف، چہ جائے کہ خود ستائی میں صفحات رنگین کروں۔ میرے خیالات، میری حرکات، میری غلطیاں بہر حال انسانی تھیں۔ تمام عمر میرا نصب العین دنیا کی تحسین و توصیف نہیں۔ بلکہ دلی یقین فرض اور ضمیر رہا ہے۔

میری یادداشت کے آئندہ صفحات جو مادر وطن کے سب سے زیادہ المناک ایام میں تحریر کئے گئے ہیں مایوسی اور ناکامی کے تلخ، ناقابل برداشت روحانی بار کے زیر اثر معرض وجود میں نہیں آئے۔ میری نگاہ مسلسل اور متواتر آئندہ کی طرف اور باہر کی طرف لگی ہوئی ہے۔

میں شکریہ کے ساتھ اپنی کتاب کو ان تمام لوگوں کے نام معنون کرتا ہوں۔ جو سلطنت جرمنی کی بقا اور عظمت کے لئے وطن کی سرزمین پر اور میدان جنگ میں میرے دوش بدوش برسر پیکار رہے ہیں۔

ستمبر ۱۹۱۹ء

ایام طفلی

۱۸۵۹ء میں جب میں صرف گیارہ برس کا لڑکا تھا۔ موسم بہار کی ایک شام کو مدرسہ حربیہ واہلشتاٹ (صوبہ سلیشیا) کے پھاٹک پر میں اپنے والد سے جدا ہوا۔ اس وقت میں صرف اپنے عزیز باپ کو ہی نہیں۔ بلکہ اپنی تمام گزشتہ زندگی کو الوداع کہہ رہا تھا۔ ان جذبات و تصورات سے مغلوب ہو کر میں اپنی آنکھوں کو پرنم ہو جانے سے نہ روک سکا۔ میں نے آنسوؤں کو اپنی فوجی یونیفارم پر گرتے دیکھا۔ "اس لباس میں ہوتے ہوئے کسی مرد کو کمزور دل ہونا اور آنسو بہانا زیبا نہیں"۔ یہ خیال ایک دم میرے دماغ میں گونجنے لگا۔ میں نے زبردستی خود کو اپنی طفلانہ اذیت سے آزاد کیا۔ اور اپنے نئے ساتھیوں میں گھل مل گیا۔ گو ایک عجیب قسم کا خوف میرے دل و دماغ پر حاوی رہا۔

میرا فوج میں داخل ہونا کسی خاص ارادہ کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ واقعات کی روش پر منحصر تھا۔ جب کبھی بچوں کے کھیل میں حتیٰ کہ خود اپنے تخیلات میں بھی مجھے کسی پیشہ کا انتخاب کرنا ہوتا۔ تو میں ہمیشہ فوجی ملازمت کو پسند کرتا۔ اپنے بادشاہ اور اپنے وطن کی

میں اسلحہ سازی کا پیشہ ہمارے خاندان کی قدیم روایات میں داخل رہا ہے۔

ہمارے خاندان (ہنکن ڈارف) کا مبدا ایلمبارگ ہے جہاں ۱۲۸۹ء میں وہ اقامت گزیں ہوا تھا۔ وہاں سے نکل کر مرور ایام کے تحت یہ خاندان نبورمارک ہوتا ہوا پروشیا میں پہنچا۔ ان ٹیوٹانی بہادروں میں، جو کافروں سے اور پولستان سے لڑنے کے لئے بہ حیثیت "برادرانِ سلسلہ" یا "مہمانانِ جنگ" اس ملک سے باہر نکلے، متعدد ایسے بھی تھے جو اس نام کے حامل تھے۔ رفتہ رفتہ اراضیات ہمارے قبضہ میں آجانے کی وجہ سے ہمارے تعلقات مشرقی پروشیا کے ساتھ زیادہ مستحکم اور علاقہ مارچیز (MARCHBS) کے ساتھ زیادہ کمزور ہونے گئے۔ حتٰے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں بالکل ختم ہو گئے۔

ہم نے ہنڈن برگ کا خاندانی نام سب سے پہلے ۱۷۸۹ء میں اختیار کیا۔ نیومارک کے دورانِ قیام میں اس خاندان (ہنڈن برگ) سے ہم لوگ باہمی ازدواج کے ذریعہ متصل ہو گئے تھے۔ علاوہ ازیں میرے پردادا کی (جو فان ٹش بورل رجمنٹ میں رہ چکے تھے۔ اور مشرقی پروشیا کے قصبہ ہائی لیجن بیل میں سکونت اختیار کر چکے تھے) دادی ہینڈن برگ خاندان سے تھیں۔ ان خاتون کے مجرد بھائی نے جو ایک مرتبہ بہ حیثیت کرنل کے فریڈرک اعظم کے تحت جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ اپنی جائداد اس شرط کے ساتھ اپنی بہن کے پوتے کے نام وصیت کر دی کہ وہ دونوں خاندانی نام استعمال کریں گے۔ ان کی جائداد دو جاگیروں، نیوڈک اور لمبسی پر مشتمل تھی۔ جو روزنبرگ کے ضلع میں واقع ہیں یہ ضلع ۱۸۱۶ء میں مشرقی پروشیا کے ساتھ حکومت برنیڈن برگ کے حصہ میں آیا تھا لیکن بعد کو مغربی پروشیا سے ملحق کر دیا گیا۔ مذکورہ بالا وصیت پر شاہ فریڈرک ولیم ثانی نے اپنی رضامندی عطا فرما دی۔ اور رفتہ رفتہ دوہرے نام کے بجائے اختصاراً صرف ہنڈن برگ کا نام استعمال ہونے لگا۔

اس وصیت کی بنا پر ہائی لیجن بیل کی جائداد کو فروخت کر دیا گیا۔ علاوہ بریں جنگ آزادی (۱۸۱۳ء) کے بعد ضروریات سے مجبور ہو کر لمبسی کی جاگیر علیحدہ کرنا پڑی نیوڈک آج تک ہمارے خاندان کے قبضہ میں ہے۔ اس پر میرے ایک بھائی کی بیوہ قابض و متصرف ہیں۔ آنجہانی بھائی مجھ سے عمر میں پورے دو سال بھی چھوٹا تھا۔ گویا کہ اس قلیل عمری تفاوت کی بنا پر ہماری زندگیوں کے دور اخلاص و محبت کے رشتہ میں ہمیشہ منسلک رہے۔ وہ بھی فوج میں ملازم رہا۔ اور کئی سال تک صلح اور جنگ کے ایام میں بہ حیثیت ایک افسر کے اپنے بادشاہ کی خدمت کرتا رہا۔

میرے لڑکپن کے زمانہ میں میرے دادا اور دادی نیوڈک میں رہتے تھے۔ اب وہ میرے والدین اور دوسرے اعزہ واقربا کے ساتھ وہاں کے قبرستان میں آرام کر رہے ہیں۔ تقریباً ہر سال موسم گرما میں ہم دادا اور دادی کے پاس جایا کرتے تھے گو پہلے زمانہ میں گھوڑا گاڑی کے سفر کی صعوبات برداشت کرنا پڑتی تھیں ایک مرتبہ دادا صاحب نے جو ۱۸۰۶ء کے بعد سے فان لانجن کی رجمنٹ میں رہے تھے۔ یہ قصہ سنایا کہ ۱۸۰۷ء کے موسم سرما میں وہ بہ حیثیت زمیندار کے نپولین اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے جو قریب ہی فن کیس ٹین کے قلعہ میں مقیم تھا۔ اور اس سے ان محاصل کی واپسی کی درخواست کی جو باشندگان پر عائد کئے گئے تھے۔ لیکن انہیں نہایت سرد مہری کے ساتھ نفی میں جواب دیا گیا اس قصہ کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ اس زمانہ میں فرانسیسی افواج نیوڈک میں مقیم رہیں اور یہاں سے ہو کر گزری تھیں۔ میرے چچا صاحب ورگرو مین، ان لڑائیوں کے حالات سنایا کرتے تھے۔ جو ۱۸۱۳ء میں اس علاقہ میں ہوئی تھیں۔ روسی افواج نہر پسارج کے پل کے اوپر سے برابر دباتی چلی آ رہی تھیں لیکن آخر کار انہیں پیچھے ہٹا دیا گیا تھا۔ ایک فرانسیسی افسر جو اس تعلقہ کی مدافعت پر مامور تھا۔ ایک بالاخانہ کی دریچی سے ہلاک ہوا تھا اگر واقعات کی رفتار دوسری صورت اختیار کرتی۔ تو روسی اسی پل کو

۱۹۱۴ء میں دوبارہ عبور کر رہے ہونے۔

دادا اور دادی کے انتقال کے بعد میرے والدین ۱۸۶۵ء میں نیوڈک چلے آئے۔ وہاں اس شناسا سرزمین پر منتقل ہونے کے بعد ہم نے اپنے اجداد کا گھر حاصل کیا۔ اسی گھر میں جہاں لڑکپن کے زمانہ میں اس قدر مسرور ایام گزار چکا تھا۔ میں نے سنین مابعد میں اپنی بیوی اور بچوں کی صحبت میں محنت اور مشقت کے بعد آرام حاصل کیا ہے۔ اس طرح نیوڈک میرا گھر ہے۔ اور میرے خاندان کے لئے ایک ایسی مضبوط چٹان کی حیثیت رکھتا ہے جس سے ہم دل وجان کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں۔ کہ مادرِ وطن جرمنی کے کسی حصہ میں میری خدمات کے سلسلہ میں میری طلبی ہوئی ہو۔ میں نے خود کو ہمیشہ ایک قدیم پروشیائی ہی محسوس کیا ہے۔

میں ایک سپاہی باپ کا بیٹا ۱۸۴۷ء میں پوزن میں پیدا ہوا۔ میرے والد اس وقت نمبر ۱۸ پیدل رجمنٹ میں لفٹننٹ کے عہدہ پر ممتاز تھا۔ میری والدہ سرجن جنرل شویکارٹ کی دختر تھیں۔ جو خود اس زمانہ میں پوزن میں ہی مقیم تھے۔

پروشیا کے دیہاتی شریفوں کی سادہ اور سخت زندگی جو نامساعد حالات کے تحت بسر ہوتی ہو۔ یعنی ایسی زندگی جو تقریباً تمام تر محنتِ شاقہ اور ادائے فرائض سے عبارت ہوتی ہے ہمارے تمام خاندان پر اپنا نقش جمائے بغیر نہ رہی۔ میرے والد بھی دل و جان سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں منہمک رہتے تھے تاہم ہمیشہ وہ تھوڑا بہت وقت اس کے لئے نکال لیتے تھے۔ کہ والدہ کے ساتھ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کر سکیں۔ میرے عزیز والدین کے طریقہ ہائے زندگی، جو گہرے اخلاقی احساسات پر مبنی ہونے کے باوجود عملی مقاصد کے حصول کی طرف راجع تھے ظاہری و باطنی خصوصیات میں مکمل یکسانیت کے مظہر تھے۔ ان کے کردار باہم ہر حیثیت میں کامل تھے، والدہ کا سنجیدہ، بلکہ بعض اوقات اضطراب آمیز نظریہ حیات والد کی زیادہ خاموش اور متفکرانہ ذہنی کیفیت کا ہمسر تھا۔ دونوں ہم سے گہری محبت کرنے میں مساوی تھے۔ اور اس بنا پر اپنے بچوں کی روحانی اور اخلاقی تربیت پر پوری یک جہتی کے ساتھ مصروف کار رہتے تھے آج میرے لئے یہ کہنا سخت مشکل ہے۔ کہ اپنی تربیت کے لئے میں دونوں میں سے کس کا زیادہ احسانمند ہوں۔ یا یہ کہ ہمارے کردار کا کونسا رخ والد کی تعلیمات کا ممنون ہے اور کونسا رخ والدہ کی تربیت کا۔ دونوں نے اپنی کوششوں سے ہمیں ایک تندرست بنا اور ایک زبردست قوتِ ارادی کا مالک بنا دیا تاکہ اپنے دورِ حیات میں ان فرائض سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں جو ہماری راہ میں حائل ہوں لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے ہمارے انسانی جذبات کے نازک ترین پہلو کی نشوونما کر کے ہمیں وہ بہترین تحفے عطا فرمائے۔ جو والدین اپنے بچوں کو دے سکتے ہیں یعنی خدائے قادرِ مطلق کی ذات پر پُر اعتماد عقیدہ اور مادرِ وطن اور پروشیا کے شاہی خاندان سے، جو مادرِ وطن کے لئے رکنِ رکین اور ستون کی حیثیت رکھتا ہے بے اندازہ محبت۔

ہم بچے ہی تھے کہ والد نے ہمیں زندگی کی حقیقتوں سے آشنا کرانا شروع کر دیا۔ ہمارے باغ میں یا سیر و تفریح کے وقت وہ ہمارے قلوب میں فطرت کی محبت کے جذبات کو بیدار کرتے ہمیں دیہاتی مناظر دکھلاتے۔ اور لوگوں کو ان کی زندگی اور مشاغل سے جانچنا اور ان کی قدر کرنا سکھاتے تھے۔ اس سلسلہ میں "ہم" سے میری مراد صرف میں اور مجھ سے چھوٹے بھائی سے ہے میری بہن کی تربیت جو اس بھائی کے بعد پیدا ہوئی تھی زیادہ تر والدہ کے ہاتھوں میں رہی۔ اور میرا سب سے چھوٹا بھائی میرے فوج میں داخل ہونے سے کچھ پیشتر ہی عالمِ وجود میں آیا۔

فوجیوں کی خانہ بدوش زندگی میرے والدین کو پوزن سے کالون، گراڈینز، پٹین (صوبہ پوزن) گلوگاؤ۔ اور پھر کاٹوس لے گئی۔ اس کے بعد والد ملازمت سے کنارہ کش ہو کر ہوم آ گئے

اراضی کا موجودہ مالک میرے ایک اس زمانہ کے ساتھی کا لڑکا تھا۔ اس کا باپ پیشتر ہی اپنی طویل استراحت کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔

گلوگاؤ کے زمانہ قیام ہی میں میں مدرسہ حربیہ میں داخل ہوا تھا اس سے پیشتر دو سال تک ایک ثانوی مدرسہ میں اور پروٹسٹنٹ مکتب میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ گلوگاؤ والوں نے اپنی مہربانی سے مجھے یاد رکھنے کے لئے اس مکان پر جس میں ہم رہتے تھے، ایک تختی نصب کرکے وہاں ہمارے قیام کی یادگار قائم کی ہے۔ لعدہ جب میں قریب کے قصبہ فراسٹاٹ میں کمپنی افسر تھا۔ مجھے گلوگاؤ کو دوبارہ دیکھنے کا موقع ملا۔ اور میں اپنی دلی مسرت کا اظہار نہیں کرسکتا۔

اس زمانہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جس کا ذکر کرچکا ہوں میں وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری ابتدائی تربیت بہترین اور صحیح ترین اصول پر مبنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں اپنے والدین کے مکان سے رخصت ہوا۔ تو میں نے یہ محسوس کیا گویا کہ میں بہت کچھ پیچھے چھوڑے جا رہا ہوں بایں ہمہ بہت کچھ اپنے ساتھ بھی لئے جا رہا ہوں۔ تاکہ میں شاہراہ حیات پر جو میرے سامنے کشادہ تھی میرے لئے۔ رہنما کا کام دے سکے اور تمام عمر مجھے یہی احساس قائم رہا۔ ایک مدت مدید تک میں اپنے والدین کی متفکرانہ ابدی محبت کے مرہون منت رہا ہوں جو لعدازاں میری جانب سے میری اولاد کی طرف مبدل کردی گئی۔ میں رجمنٹ کا کماندار ہوا ہی تھا۔ کہ والدہ نے داغ مفارقت دیا۔ اور میرے چوتھی آرمی کور کا کمانڈر مقرر ہونے سے کچھ ہی قبل والد بھی ہمیں اس دنیا میں یکہ و تنہا چھوڑ گئے۔

بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان ایام میں پروشیا کے مدرسہ حربیہ کی زندگی عمداً سخت رکھی جاتی تھی۔ اس تربیت کا منشا یہ تھا کہ صحیح تعلیم کے علاوہ جسمانی نشو و نما اور ارادہ کی تقویت کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ وہاں قوت عمل اور عزم کی بھی اتنی ہی قدر کی جاتی تھی۔ جتنی علم کی۔ اس طریقۂ تربیت میں کسی تنگ نظری اور تعصب کو نہیں۔ بلکہ ایک خاص قوت کو دخل تھا۔ ہر فرد کو یہ کامل آزادی حاصل تھی۔ کہ اپنی صحت و توانائی میں بہرصورت اضافہ کرے اس طریقہ میں کسی حد تک "لورک" کی روح کارفرما تھی یعنی وہ روح جس کو سطحی مبصرین نے غلط نظر سے جانچا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لورک خود اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی ایک سخت مزاج سپاہی اور معلم تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے ماتحتوں سے اسی غیر محدود خود اعتمادی کے اظہار کا بھی خواہاں تھا جو ہر شخص سے معاملت کرتے ہیں خود اس کی فطرت کا خاصہ تھی اسی بنا پر یہ لورک کی روح" نہ صرف قوی تھی بلکہ اپنی آزادی میں بھی ہماری افواج کی سب سے زیادہ بیش قیمت خصوصیات میں سے رہی ہے۔

مجھے دوسرے مدارس کی نفسیات سے جہاں تک ان کا تعلق مردہ زبانوں سے ہے۔ بہت کم ہمدردی ہے۔ انسان کی زندگی میں ان زبانوں کی قدر و قیمت میرے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہی اگر کسی مقصد کے وسائل کی حیثیت سے انہیں دیکھا جائے۔ تو میری رائے میں مردہ زبانوں کے لئے بہت زیادہ وقت اور قوت عمل کی ضرورت ہے۔ اگر ان کو خاص مطالعہ کے لئے موزوں سمجھا جائے۔ تو ان کا مطالعہ زندگی کے آخری ایام کے لئے وقف ہونا چاہئے۔ اس خدشہ کے باوجود کہ مجھے جاہل مطلق سمجھا جائیگا میں اس رائے کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ کاش یہ مدارس موجودہ السنہ، موجودہ تاریخ جغرافیہ اور ورزشی کھیلوں کو اپنے نصاب میں نمایاں جگہ دیں۔ خواہ اس کے لئے لاطینی اور یونانی زبانوں کو نصاب سے خارج کرنا پڑے کیا یہ ضروری ہے۔ کہ ازمنۂ تاریک میں جس چیز پر تہذیب و تمدن کا مدار تھا۔ دور جدید میں بھی اسی کو انتہائی اہمیت کی نظر سے دیکھا جائے؟ کیا ہم نے ... سے اب تک شدید لڑائیوں اور پیہم کوششوں کے ... اپنا ادب اور اپنے فنون وضع نہیں کئے ہیں؟ اور ... تجارت میں ہمیں اپنی صحیح حیثیت قائم کرنا ...

زبانوں سے کہیں زیادہ ہمیں زندہ زبانوں کی ضرورت نہیں ہے؟

میں نے جو کچھ عرض کیا۔ اس سے میرا مقصد عصر عتیق کی تحقیر کرنا نہیں۔ بلکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اپنے بچپن ہی سے عہد قدیم کی تاریخ سے مجھے بے حد شوق تھا۔ بالخصوص تاریخ رومۃ الکبریٰ سرتاسر میرے دل و دماغ پر حاوی تھی۔ میری نظر میں وہ کوئی عظیم الشان، بلکہ دیوہیکل چیز تھی۔ اور جب مابعد میں جب ایک مرتبہ میں رومۃ الکبریٰ گیا۔ تو یہ تخیئلی اثر قوی ہو گیا جس کا ظہور اس طرح ہوا۔ کہ اس قدیم ابدی شہر کی یادگاروں نے میرے دل و دماغ پر طاری دور احیاء علوم کی عمارات کی بہ نسبت زیادہ اثر کیا۔

رومۃ الکبریٰ کی صفحات تاریخی میں سے قومی خصوصیات کے محاسن ومعائب کی دانشمندانہ تمیز، اس کی بے رحمانہ خود غرضی جس کے تحت اپنے مفادات کے پیش نظر دوست یا دشمن کسی سے معاملت کرنے کا کوئی طریقہ قابل ملامت نہ تھا۔ اس کا لائق تحسین غصہ۔ جس کا بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان مواقع پر اظہار کیا جاتا تھا جب دشمن اسی کے ہتھیاروں سے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ اس کا دشمن اقوام کی تمام کمزوریوں اور جہالت سے استفادہ کرنا (یہی طریقہ نہایت چالاکی کے ساتھ جرمن اقوام کے مقابلہ میں اختیار کیا گیا۔ اور اسلحہ سے زیادہ بااثر اور کامیاب ثابت ہوا) یہ تمام صفات جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ زیادہ خوبی اور صفائی کے ساتھ فی زمانہ برطانیہ کی سیاسیات کے آئینہ میں منعکس نظر آتی ہیں جس نے فن سیاست کے ان تمام پہلوؤں کو نفاست اور خود غرضی کے انتہائی معراج پر پہنچانے میں قابل رشک کامیابی حاصل کی ہے۔

حالانکہ عصر عتیق کی میری نگاہ میں بڑی وقعت تھی تاہم میں نے ہمیشہ اپنے ہم وطنوں میں ہی تلاش کیا کرتا تھا۔ میں علی الاعلان اس امر کے اظہار کرتا ہوں کہ کسی الکیبیادس یا تمیستوکل کسی کا تو یا ... کو سراہنے میں ہمیں اس حد تک تنگ نظر اور احسان فراموش نہ ہو جانا چاہئے۔ کہ ان افراد کو بالکل ہی نظر سے گرا دیں۔ جنہوں نے ہماری مادر وطن کی تاریخ میں ویسے ہی نمایاں اور عظیم الشان کام انجام دئے ہیں۔ جیسے ان افراد نے یونان یا رومۃ الکبریٰ کی تاریخ میں اس سلسلہ میں مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ کہ میں نے جرمن نوجوانوں سے گفتگو کرنے کے دوران میں اکثر اس امر کو محسوس کیا ہے۔ کہ ان کی تمام معلومات کے باوجود ان کے مطامح نظر میں کسی حد تک جہالت اور یادری پن کو دخل ہوتا ہے

مدرسہ حربیہ میں ہمارے معلمین اور مدرسین اس تنگ نظری کے خلاف ہماری محافظت کرتے تھے۔ اور آج میں ان کا ممنون اور متشکر ہونے پر خود کو مجبور پاتا ہوں۔ اس زمانہ کے لفٹننٹ فان وتیج بالخصوص میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ جب میں دہلشاٹ میں داخل ہوا تھا۔ تو میرے ایک عزیز نے ان سے میری سفارش کر دی تھی اور وہ میرے معاملات میں ہمیشہ ایک مخلصانہ اور خصوصی دلچسپی کا اظہار کرتے رہے۔ مدرسہ حربیہ کے نصاب کی تکمیل کئے انہیں صرف چند سال ہی گزرے تھے۔ اور خود کو بالکل ہم طالبعلموں کی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ ہمارے تمام کھیلوں میں ہم بالخصوص موسم سرما کے برفانی کھیلوں میں بڑی مسرت سے شریک ہوتے۔ وہ ایک زبردست کردار اور زبردست تخیل کے مالک تھے۔ مزید براں انہیں تعلم کا حیرت انگیز خداداد ملکہ حاصل تھا ۱۸۵۹ء میں انہوں نے ابتدائی جماعتوں میں مجھے جغرافیہ پڑھا اور چھ برس کے بعد برلن کے درجۂ خصوصی میں انہوں نے ہی پیالیس ریس کا سبق دیا جب میں چند سال بعد مدرسہ حربیہ نرقانیہ میں داخل ہوا۔ تو مجھے یہ معلوم ہو کر بے حد مسرت ہوئی جنرل اسٹاف کے میجر فان وتیج پھر میرے معلموں میں ہیں

فان وتیج کو اپنے لفٹننٹی کے زمانہ میں بھی تاریخ سے بہت دلچسپی تھی۔ اور جب کسی خوشگوار دن ہم سیر کو نکلتے تو اکثر وہ مناسب مقامات دیکھ کر ان لڑائیوں کا نقشہ اتارتے جو اسی زمانہ (۱۸۵۹ء) میں شمالی اطالیہ میں ہو چکی

مثلاً ماجنہ اور سالفرنیہ اور اس سے ہمیں تھوڑی مشق ہوتی رہتی تھی بعدازاں برلن میں جب میں کاڈِٹ ہو چکا تھا انہوں نے مجھے تاریخ حربیہ کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ اور میری توجہ ریلوے کی طرف مبذول کی۔ یہ ترغیبات میری آئندہ ترقی کے لئے بہت اہم ثابت ہوئیں اس میں کیسے شک ہو سکتا ہے کہ تاریخ حربیہ جنرل کے عہدہ کے لئے بہترین معلم ہے؟ جب بعد ازاں میرا تبادلہ جنرل اسٹاف کو ہوا۔ تو لفٹنٹ کرنل فان وینیخ ایک اہم ذمہ دارانہ عہدہ پر وہاں موجود تھے اور آخرکار ہم دونوں ایک ساتھ ایک آرمی کور کے کمانڈر (رجی او یں) مقرر ہوئے وابلشٹاٹ کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھنے والے لڑکے کے دل میں، جب کوہ بلانک اور کوہ روزا میں تمیز نہ کر سکنے کی سزا پر فان وینیخ کے ردل کی مشفقانہ ضرب اس کے کاندھوں پر پڑتی تھی۔ اس مستقبل کی حقیقت کا وہم بھی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

ہماری معلمانہ زندگی کی سخت تربیت بھی ہماری پرجوش خلقتوں کو دبلنے سے قاصر رہی۔ حتیٰ کہ میں اس امر میں بھی شک کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ کہ لہو ولعب کا طفلانہ شوق جو بعض اوقات جنون انگیز ہنگاموں کی حد تک پہنچ جاتا تھا ہم کاڈٹوں سے زیادہ کسی دوسرے مدرسہ کے متعلّمین میں نظر آ سکتا ہے۔ قسمت سے ہمیں استاد بھی ایسے ملے تھے۔ جو ہر بات کو سمجھنے والے، نرم دل اور منصف مزاج تھے۔

شروع میں خود میں بھی سب کچھ تھا لیکن نہ تھا تو وہ۔ جسے عام طور پر ارشد تلامذہ سے منتصف کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی ایام میں مجھ پر ایک خاص جسمانی کمزوری کا اثر تھا۔ جسے گزشتہ علالت کا ورثہ سمجھنا چاہئے۔ لیکن اسی صحیح اصول تربیت کے طفیل میں رفتہ رفتہ زیادہ تندرست ہو گیا۔ تاہم بالخصوص مطالعہ کی طرف میرا میلانِ خاطر بہت کم تھا۔ البتہ بتدریج اس طرف بھی میرا رجحان زیادہ ہو گیا ایسا رجحان جو ہر کامیابی کے ساتھ بڑھتا رہا اور آخرکار مجھے ایک ذہین اور طباع تلمیذ کی صفات سے ممتاز کر دیا۔ گو اس میں خود میرے ذہنی یا جسمانی کمال کو کوئی دخل نہ تھا۔

اس فخر و غرور کے باوجود جو خود کو "ملکی حربی صاحب علم" سے موسوم کرکے میرے دل و دماغ میں پیدا ہو جاتا تھا۔ میں تعطیلات کا ناقابل ضبط مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں سفر، بالخصوص موسم سرما میں کوئی معمولی کام نہ تھا۔ ہر شخص کی منزل مقصود کے اعتبار سے سست رفتار ٹرینیں (جنہیں گرم رکھنے کا کوئی انتظام نہ ہوتا تھا) اور اس سے زیادہ سست رفتار گھوڑا گاڑیاں یکے بعد دیگرے ذریعہ آمد و رفت تھیں لیکن یہ تمام مشکلات اپنے گھر، اپنے والدین اور اپنے بہن بھائیوں کو دیکھنے کی تمنا کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔ اپنے بیٹے کی گھر سے ایسی محبت کو دیکھ کر میری والدہ کا دل انتہائے مسرت سے باغ باغ ہو جاتا تھا۔ مجھے آج تک کرسمس کی تعطیلات میں اپنا پہلی مرتبہ گلوگاؤ کا آنا اچھی طرح یاد ہے۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ میں لائنیتز سے رات بھر گھوڑا گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ رات میں غیر متوقع برفباری کا طوفان ہماری اس تاخیر کا ذمہ دار تھا اور جب ہم گلوگاؤ پہنچے ہیں۔ تو ابھی خاصا اندھیرا تھا وہاں اس نام نہاد ویٹنگ روم کے اندر جہاں نہ روشنی کا کافی انتظام تھا نہ گرمی کا۔ میری پیاری والدہ میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی جراب بن رہی تھیں۔ گویا قدرتی تھیں کہ اپنے ایک بیٹے کو خوش کرنے کی فکر میں کہیں دوسروں کی ضروریات کی طرف سے غافل نہ ہو جائیں۔

مدرسۂ حربیہ وابلشٹاٹ میں میرا پہلا ہی سال تھا کہ ۱۸۵۹ء کے موسم گرما میں شہزادہ فریڈرک ولیم (جو بعد میں شہنشاہ فریڈرک ہوئے) اور ان کی بیگم صاحبہ نے اپنی آمد سے ہمیں مفتخر فرمایا۔ اس موقع پر پہلی مرتبہ ہم نے اپنے شاہی خاندان کے تقریباً تمام افراد کو دیکھا۔ اس دن سے بیشتر قواعد میں ہم نے اپنی ٹانگیں اتنی اونچی کبھی نہ اٹھائی تھیں اور نہ جنبا شک کے ایسے گردن توڑ کرتب کبھی دکھائے تھے اس کے بعد ایک مدت تک ہمارے درمیان اس شاہی جوڑے کی خوش اخلاقی اور خوش طبعی کے ہی چرچے ہوتے رہے۔

اسی سال اکتوبر میں شاہ فریڈرک ولیم چہارم کی سالگرہ [illegible] مرتبہ منائی گئی گویا اس طرح میں نے اپنی فوجی وردی اس بادشاہ کے دورِ حکومت میں زیب بدن کی۔ جسے سخت ترین [illegible]

[illegible]کرنا پڑا۔ اور یہ وردی جب تک جان باقی رہے۔ میرے جسم پر عزت [illegible] کا لباس بنکر زیب دیتی رہے گی۔ ۱۸۶۱ء میں مجھے اسی آنجہانی بادشاہ کی بیوہ۔ ملکہ الیزبتھ کا ملازمِ خاص مقرر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس زمانہ میں جو گھڑی علیا حضرت نے مرحمت فرمائی تھی۔ وہ تین لڑائیوں کے دوران میں میری وفادار رفیق رہی ہے۔

۱۸۶۳ء کے البسٹر میں مجھے درجۂ خصوصی میں ترقی دی گئی۔ اور برلن بھیج دیا گیا۔ برلن کا مدرسۂ حربیہ محلہ جدید فریڈرک اسٹراس میں الکزانڈر پلاٹز کے قریب واقع ہے۔ اپنی عمر میں پہلی مرتبہ مجھے پروشیا کے دارالسلطنت سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ اور آخر کار ربیع کے معائنہ کے موقع پر جب ہم لینڈن کے میدان میں پریڈ کر رہے تھے اور آوپرن پلاٹز سے مارچ کرتے ہوئے گزرے اور علیٰ ہذا القیاس خریف کے معائنہ کے موقع پر بھی جو ٹیمپلہوفر کے میدان میں ہوا۔ میں اپنے عالی مرتبت بادشاہ ولیم اول کو ایک نظر دیکھ سکا۔

۱۸۶۴ء کی ابتدا نے ہماری مدرسۂ حربیہ کی زندگی میں ایک پُرجوش گو کسی حد تک سنجیدہ فضا پیدا کر دی۔ اس سال ڈنمارک سے جنگ چھڑ گئی اور موسم ربیع میں ہمارے بہت سے ساتھی لڑنے والی فوجوں میں شرکت کرنے کی غرض سے ہمیں چھوڑ گئے۔ بدقسمتی سے میں اس وقت تک اتنا کم عمر تھا کہ اس قابلِ رشک گروہ میں شامل ہونے کے قابل نہ سمجھا گیا۔ یہاں میں ان پُرجوش الفاظ کو بیان کرنے کی کوشش کرنا ضروری نہیں سمجھتا جو ہمارے رخصت ہونے والے ساتھیوں نے کہا اور کہے گئے

اس جنگ کے سیاسی اسباب و علل کے متعلق ہم نے اپنے دماغوں کو کبھی زحمت دینے کی کوشش نہیں کی۔ بایں ہمہ ہمارے قلوب ان [illegible] جذبات سے مملو تھے کہ آخر کار ایک تازہ و خوشگوار نسیم نے جرمن اتحاد کے کمزور اور بوسیدہ ڈھانچے کو متحرک کر ہی دیا۔ اور اس سلسلہ میں صرف جنگ کا وقوع تمام تقاریر اور تمام سیاسی مسودات کی مجموعی حیثیت سے زیادہ [illegible] قیمت ثابت ہوا۔ ہم سب انتہائی بے چینی کے ساتھ حوادث جنگ کا مطالعہ [illegible] اور اختتام پر جب مفتوحہ توپیں شہر میں گشت کی گئیں اور عساکر منصورہ واپس آئے تو ہم ابھی جوشِ مسرت سے لرز لرز کر اس منظر کو دیکھ رہے تھے ہم سوچتے تھے کہ ہمارے یہ احساسات بیجا نہیں ہیں۔ کہ ہمارے قلوب میں بھی اسی روح کی کارفرمائیاں ہیں جس نے ہماری افواج کو ڈنمارک کے میدانوں میں فتح و نصرت کا راستہ دکھایا ہے کیا یہ تعجب کی بات ہے کہ اس وقت سے ہم سب بے صبری کے ساتھ اس دن کا انتظار کیا کرتے تھے۔ جب ہم خود بھی تجارب عساکر میں شامل ہوں گے۔

وہ دن آنے سے پیشتر ہماری خوش نصیبی سے ہمیں یہ شرف حاصل ہوا۔ کہ بادشاہِ معظم کے حضور میں پیش کئے گئے۔ ہم قلعۂ معلّٰی تک پہنچائے گئے اور وہاں اعلیٰ حضرت کو اپنے اپنے باپ کا نام اور عہدہ بتانا پڑا۔ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ ہم میں سے اکثر قلبی اضطرار کی بنا پر اول اول تو ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکے پھر بولے تو اس طرح کہ تمام الفاظ کو گڈمڈ کر کے ایک دم اُگل دیا۔ اس دن سے پیشتر ہمیں کبھی اپنے بادشاہ کا قرب حاصل نہ ہوا تھا۔ نہ کبھی اس کا موقع ملا تھا کہ ان کی شفقت و محبت سے لبریز آنکھوں سے اپنی آنکھیں دوچار کر سکیں۔ یا ان کی سامعہ نواز آواز سن سکیں۔ بادشاہ معظم بڑے اخلاص و محبت کے ساتھ ہم سے گفتگو کرتے رہے اور فرمایا کہ سخت ترین اوقات میں بھی ہمیں ادائے فرائض میں کوتاہی نہ کرنا چاہئے۔ بہت جلد ہی ہمیں اس فرمان کی عملی طور پر تعمیل کرنے کا موقع حاصل ہو گیا۔ اور آج ہم میں سے متعدد ہم جماعت اپنی وفاداری پر موت کی تصدیقی مہر ثبت کر چکے ہیں۔ میں نے ربیع ۱۸۶۵ء میں مدرسہ حربیہ کو خیرباد کہا۔ اپنے ذاتی تجربات اور رجحانات کی بنا پر مدت العمر اس حربی تعلیمی ادارہ کی طرف سے اپنے قلب میں جذباتِ تشکر اور تعلق خاطر محسوس کرتا رہا ہوں۔ آج بھی اپنے نوجوان ساتھیوں کا شاہی وردی میں تصور کر کے دل میں مسرت و ابتہاج کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں حتیٰ کہ جنگِ عظیم کے دوران میں بھی میں بڑی خوشی کے ساتھ اس موقع کا متلاشی رہتا تھا کہ اپنے ساتھیوں، شناساؤں اور معمول ہم درسوں کے لڑکوں کو اپنی میز پر بطور مہمان مدعو کروں۔ اپنی سترویں سالگرہ پر جو دورانِ جنگ میں واقع ہوئی۔ مجھے خوش نصیبی سے سالگرہ کی رسومات شروع کرنے کا اس طرح موقعہ حاصل ہو گیا کہ گرد و نواح کی سڑکوں سے مدرسہ حربیہ کے تین کم عمر طلبہ کو اپنی میز پر جو لذیذ اغذیہ و اشربہ سے لدی ہوئی تھی۔ مدعو کر لیا۔ تینوں لڑکے متبسم، بےخوف اور مطمئن گویا میری عین خواہش کے مطابق۔ ایام گذشتہ کا مجسمہ بن کر میں خود جو کچھ سوچ رہا تھا

جدید اصلاحات

صوبجاتی خود مختاری

(از جناب رام لال صاحب گپتا۔ ایم۔ اے۔ سونی پت)

جدید اصلاحات کا اہم ترین حصہ صوبجاتی خود مختاری ہے۔ اس کا مطالبہ ہندوستانی قائدین ایک عرصہ سے کرتے رہے ہیں ۱۹۲۸ء میں تو کانگریس و لیگ کی مشترکہ رپورٹ نے اس کا خاکہ بھی پیش کر دیا تھا۔ لیکن اصلاحات ۱۹۱۹ء نے ہندوستان صرف خود مختاری حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اور صوبوں میں دو عملی قائم کر دی

۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے ماتحت صوبوں کی آزادی و اختیارات مرکزی حکومت کی مہربانی پر منحصر تھے۔ مرکزی حکومت کو اختیار تھا۔ کہ وہ جس وقت چاہے صوبجات سے اختیارات واپس لے لے۔ صوبجاتی حکومتیں قانوناً و اخلاقاً دخیل نہ ہو سکتی تھیں۔ ان کی حیثیت بمنزلہ ایجنٹ کے تھی جس کو کمپنی اپنی تجارت و مفاد کے لئے کچھ اختیارات دے دیتی ہے۔ لیکن جس وقت کمپنی کو ضرورت محسوس ہو۔ وہ ایجنٹ سے ان اختیارات کو واپس لے سکتی ہے۔ ایجنٹ کمپنی کا ہر وقت مطیع و ماتحت ہے۔ لیکن اصلاحات ۱۹۳۵ء نے صورت حالات بدل دی ہیں۔ تمام حقوق مراعات اختیارات جو سکرٹری آف سٹیٹ۔ گورنر جنرل۔ مرکزی حکومت و صوبجات کو حاصل تھے۔ شہنشاہ نے واپس لے لئے۔ اور پھر ان کی تقسیم سکرٹری آف سٹیٹ۔ فیڈرل گورنمنٹ اور صوبجات میں کر دی۔ یعنی اب صوبجاتی حکومتوں کے اختیارات شہنشاہ کے عطا کردہ ہیں۔ جس میں فیڈرل حکومت کسی طرح دخیل نہیں ہو سکتی مثلاً جب کانگرسی وزراء نے صوبجات میں وزارت تشکیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تو چند سیاسی قائدین نے گورنر جنرل سے درخواست کی تھی کہ وہ اس تعطل کو ختم کرے لیکن گورنر جنرل نے آئینی حیثیت سے عاجزی ظاہر کر دی تھی۔ اس کا تعلق و ضبط صرف ان امور تک محدود ہے جن پر گورنر انفرادی یا شخصی حیثیت سے کاربند ہو سکتے ہیں۔

اصلاحات جدید کی رو سے برما ہندوستان سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اب وہ برطانوی ہندوستان کا صوبہ نہیں۔ بلکہ سلطنت برطانیہ کا جزو ہے۔ ہندوستان کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اور بلحاظ ہندوستان اسی صف میں شمار ہوتا ہے جس میں آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ۔ جنوبی افریقہ وغیرہ سندھ و اڑیسہ دو جدید صوبے تشکیل ہوئے ہیں۔ سندھی و اڑیسی ایک مدت سے کوشاں تھے۔ کہ ان کو ان کے صوبہ کی عنان حکومت عطا ہو اور وہ دوسرے صوبوں کے ماتحت نہ رہیں۔ ان کی سعی گول میز کانفرنس میں بار لائی۔ بمبئی صوبہ سے سندھ کا علاقہ جدا کیا گیا۔ اور اڑیسہ میں کچھ حصہ مدراس اڑیسہ اور کچھ حصہ متوسط صوبجات کا شامل ہے۔ گویا اب کل گیارہ صوبہ ہیں۔ (۱) مدراس (۲) بمبئی (۳) بنگال (۴) صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ (۵) صوبجات متوسطہ (۶) اڑیسہ (۷) بہار (۸) پنجاب (۹) صوبہ سرحد (۱۰) سندھ (۱۱) آسام

شمال مغربی سرحدی صوبہ کو ۱۹۳۲ء میں گورنر کے صوبہ کا درجہ حاصل ہوا تھا۔ اور اسی وقت سے وہاں اصلاحات ۱۹۱۹ء نافذ ہوئی ہیں ۱۹۳۵ء کی اصلاحات وہاں بھی دیگر صوبجات کی طرح یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو نافذ ہو گئی ہیں دفعہ ۲۹۰ شہنشاہ ہند کو اجازت دیتی ہے کہ وہ حسب ضرورت موجودہ صوبوں کی حدود و رقبہ میں کمی بیشی

یا کوئی جدید صوبہ قائم کرے۔ اور اس میں انتظام حکومت حسب مراتب تشکیل کرے

گیارہ صوبوں میں مکمل خود مختیاری حکومت رائج ہوگئی ہے۔ یعنی منتقلہ وغیر منتقلہ کی تعلیم دا منیا رختم ہوگیا ہے۔ اور صوبہ کل بندوبست وانتظام تکمیل وتشکیل ہے۔ پولیس و قانون وزرا کے زیر اعتبار رہے یہ وزرا صوبجاتی ایوانوں کے ممبر ہوں گے اور اسی وقت تک با اعتبار ہوں گے۔ جب تک کہ ایوانوں کو ان پر بھروسہ ہے۔ اور وہ ان کی تدبیروں و پالیسی سے اتفاق کرتے ہیں۔ ورنہ وہ تحریک عدم اعتماد کے ذریعہ ان کو عہدوں سے الگ کر سکتے ہیں ۱۹۱۹ء کی اصلاحات نے ضروری قرار دیا تھا کہ وزیر ایوان کا منتخب شدہ ممبر ہو لیکن ۱۹۳۵ء کی اصلاحات نے یہ قید اڑا دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایوان عام میں تو کوئی نامزد ممبر ہوگا ہی نہیں۔ ایوان خاص میں چند ممبر ہوں گے جو اس دفعہ کے ماتحت وزارت قبول کر سکتے ہیں۔ ایوان خاص صوبجاتوں میں اول مرتبہ تشکیل کئے جا رہے ہیں۔ اس کا مقصد وہی ہے جو انگلینڈ میں دارالامرا کا ہے۔ یا دیگر ممالک میں ایوان اعلیٰ کا۔ اس کا مقصد اسمبلی کی زود پسند تجاویز میں تاخیر ڈالنا ہے۔ کیونکہ ایوان عام عموماً ان لوگوں پر شامل ہوتا ہے جو قوم کے ہر طبقہ کے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کی مصائب و دشواریوں سے آگاہ ہوتے ہیں قدرتاً جب ان لوگوں کو اختیارات ملتے ہیں۔ تو وہ عوام کی اصلاح کے لئے ان کا استعمال کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات ان کی تجاویز حد سے گزر جاتی ہیں۔ آئینی ماہرین کے پاس اس کا ایک ہی علاج ہے۔ اور وہ تشکیل دارالامرا۔ تاکہ وہ ایوان عام کی انتہا پسند تجاویز کو جن سے نظام سوسائٹی کے درہم برہم ہونے کا اندیشہ ہو روک تو نہ سکیں البتہ ان کے نفاذ میں تاخیر ضرور کر دیں۔ تاکہ پبلک کو ان تجاویز سے پوری واقفیت ہو جائے لیکن صوبجاتی خود مختیاری چند تحفظات سے محدود ہے۔ جو ناقدین کی نگاہ میں اس کو بہت کچھ بے حقیقت بنا دیتی ہے۔

خصوصی تحفظات مندرجہ ذیل ہیں

(۱) جن امور پر گورنر کو انفرادی ذمہ داری حاصل ہے

(ا) انسداد تحریکات واقعات جو تشدد سے امن عامہ کو خطرہ میں ڈالیں یا جو گورنر کے خیال میں مروجہ حکومت کو بذریعہ تشدد ختم کرنا چاہیں اگر ایسی صورت حالات پیدا ہو جائے۔ تو گورنر مجاز ہے کہ کسی افسر کو اسمبلی کا ممبر نامزد کر دے جو اس کی ترجمانی کر سکے۔ اور اسمبلی میں اس کی بجائے حصہ لے سکے لیکن اس کو رائے زنی کا اختیار نہ ہوگا۔

(ب) گورنر کو یہ اختیار ہے کہ وہ ایسے قانون تشکیل کرے جس سے محکمہ کار خاص کے کاغذات متعلقہ تشدد پسند کارروائیوں یا اشخاص کے کسی غیر شخص کے ہاتھ میں نہ آ سکیں۔ ماسوائے ان کے جن کو انسپکٹر جنرل آف پولیس یا گورنر اجازت دے۔ یعنی وزرا کو اختیار نہیں ہے کہ وہ ان کاغذات کو بغیر گورنر کی مرضی کے دیکھ سکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مصنفان ایکٹ کو اندیشہ تھا کہ اگر عوام کے منتخب شدہ وزرا جو عموماً ترقی پسند طبقہ سے متعلق ہونگے۔ ان کی کاغذات تک غیر مشروط طریق پر رسائی ہوگئی۔ تو ممکن ہے کہ وہ محکمہ کار خاص کے ملازمین سے ماضی کے واقعات کا انتقام لیں۔ کیونکہ عوام عموماً انتہا پسند لوگوں کو جو دنیا میں ایک جدید دنیا کی تشکیل کا خواب دیکھا کرتے ہیں پسند کرتے ہیں۔ اور یہی انتہا پسند لوگوں کے خلاف ملازمین محکمہ کار خاص اطلاعات دیا کرتے ہیں جس سے ان کے رفیق وہ بسا اوقات وہ خود سرا یاب ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر برسر اقتدار ہونے کے بعد یہ اصحاب انتقام کے جذبے سے متحرک ہوں۔ تو جائے تعجب نہیں۔

(ج) اسی طرح گورنر کو مجاز ہے۔ کہ وہ صوبجاتی حکومت کے لئے ضوابط بنوائے۔ کہ کسی طرح وزرا کے مابین محکمہ جات حکومت منقسم ہوں گے۔ اور کس طرح وزرا، وسکرٹری اس کو ان معاملات سے متعلق کریں گے۔ جن پر وہ انفرادی حیثیت سے کاربند ہو سکتا ہے

(د) مخروجہ علاقوں کا کلی وجزی انتظام بندوبست

(س) اختیار رذلو (حاشیہ V) یعنی مندرجہ بالا امور پر گورنر انفرادی رائے سے عمل کر سکتا ہے۔ اور اسے وزرا کے مشورہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر کوئی تجویز دیوان عام نے قبول کر لی جو اسے پسند نہ ہو

...ر جسے وہ صوبہ کے مفاد کے خلاف سمجھتا ہو۔ تو وہ اسے رد کر سکتا ہے

۲۔ مندرجہ ذیل امور پر گورنر شخصی طور پر عامل ہوگا۔ یعنی ان امور کے
...وبست کے لئے وہ وزرا کے مشورہ حاصل کرنے کا پابند ہے لیکن
...س پر عمل کرنے کا پابند نہیں۔

(ا) صوبہ کے امن عامہ کا تحفظ۔
(ب) اقلیتوں کے جائز حقوق کا تحفظ
(ج) ملازمتوں کے حقوق میں مراعات کا تحفظ۔
(د) برطانوی رعایا کے ہندوستان میں داخلہ مراجعت۔ رہائش
...بارت۔ ملازمت وغیرہ برخلاف تعزیری قیود کا انسداد۔ ریاستوں
کے حقوق کا تحفظ۔

خصوصی اختیارات

گورنروں کو بھی گورنر جنرل کی طرح خصوصی اختیارات حاصل ہیں
(ا) وہ اسمبلیوں سے حسب منشا مطالبات حاصل کر سکتا ہے۔
...ب) گورنر ایکٹ نافذ کر سکتا ہے۔ (ج) اسمبلی بریزیڈنٹ کے مشورہ
...ے اسمبلی کے لئے قوانین وضوابط بنا سکتا ہے (س) صوبجاتی
...مبلیوں سے منظور شدہ قانون کو روک سکتا ہے۔ بالوالوں کو نظر
...نی کے لئے واپس کر سکتا ہے۔ گورنر جنرل یا شہنشاہ کی خوشنودی
...ے لئے محفوظ کر سکتا ہے۔ (ص) وقت ضرورت آئین کو تعطل میں
...ل کر کسی خاص صیغہ یا تمام حکومت کا بار اپنے کندھوں پر لے سکتا ہے
...ان اختیارات پر مفصل بحث "فیڈرل حکومت" میں کی گئی ہے

لیکن ان خصوصی ذمہ داریوں واختیارات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے
...گورنر جنرل وگورنر ہر وقت وزرا کی کارروائیوں میں دخیل ہوں گے
...شبہ کی بنا پر ہی کانگرس نے وزارت کی تشکیل سے انکار کر
...تھا لیکن وائسرائے کے پیغام نے مکدر فضا کو صاف کر دیا۔ آپ نے
...ات فرمایا تھا کہ ایکٹ کا یہ منشا نہیں ہے کہ صوبجاتی حکومتوں میں
...ر صیغہ جات گورنر کے لئے مخصوص کر دئے جائیں۔ اور ان کو
...عملی کی شکل دی جائے۔ بلکہ ۱۹۳۵ء ایکٹ کے ماتحت صوبہ کا
...م بندوبست وزیروں کے ہاتھ میں ہے۔ ہر امر میں آغاز وزرا

کریں گے۔ اور وہی اپنی پالیسی کے ذمہ دار ہوں گے۔ گورنر کسی معاملہ میں اپنی طرف آغاز نہیں کر سکتا۔ اگر گورنر یہ محسوس کرے۔ کہ وزرا کی زیر تجویز احکامات یا تدبیریں اس کی خصوصی ذمہ داریوں کے خلاف ثابت ہوں گی۔ تو وہ وزرا کو مدعو کرے گا۔ ان کے سامنے اپنے مطالبات وخیالات پیش کرے گا اور ہر ممکن طریق سے ان کو اپنا ہمخیال بنانے کی کوشش کرے گا۔ اور ان کے دلائل وبراہین کو ٹھنڈے دل سے سن کر غور کرے گا لیکن اگر پھر گورنر اور وزرا متفق نہ ہو سکے۔ تو گورنر اپنے راستہ پر گامزن ہوگا۔ اور وزرا اپنے پر۔ اگر وزرا خیال کریں۔ کہ ان کی حق تلفی ہوئی ہے۔ تو وہ مستعفی ہو سکتے ہیں۔ اگر گورنر خیال کرے۔ کہ وہ وزرا کے ساتھ کام نہیں کر سکتے وہ وزرا کو علیحدہ کر سکتے ہیں۔ اور یہ صورت حالات بھی چند امور تک محدود ہے۔ ورنہ وزرا کو مکمل آزادی ہے۔ اور ان کے روزمرہ کے امور میں کوئی دخیل نہ ہوگا۔

گورنر صوبہ پانچ سال کے لئے متعین ہوتا ہے۔ لیکن وزرا کے عہدہ کی کچھ میعاد نہیں۔ وہ کسی وقت علیحدہ کئے جا سکتے ہیں وہ اس وقت تک جب کہ ایوان عدم اعتماد کی تحریک پاس نہ کرے یا اسمبلی کی میعاد ختم ہو گئی ہو۔ یا وہ خود مستعفی ہو گئے ہوں۔ برسر اقتدار رہیں گے۔

گورنر صوبہ کے لئے ایڈوکیٹ جنرل مقرر کرے گا۔ جو صوبہ کا قانونی مشیر اعلیٰ ہوگا۔ یہ کونسل کی کارروائی میں ممبر کی طرح شریک ہو سکے گا لیکن اسے رائے دینے کا حق نہ ہوگا۔

صوبجاتی اسمبلی کو ماسوائے ان رقوم کے جو ایکٹ کے تحت صوبجاتی مالیات سے ضرور ادا ہونی ہے۔ اور وہ اسمبلی کے اختیارات سے باہر ہیں۔ ہر مطالبہ پر رائے دینے کا حق ہے۔ اور اس کی اجازت کے بغیر ایک پائی بھی خرچ نہیں کی جا سکتی لیکن گورنر اس کے تخفیف کردہ مطالبات کو رد کر کے ان کے اخراجات کی اجازت دے سکتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے۔ کہ ایکٹ ۱۹۳۵ء نے صوبوں میں چند تحفظات کے تحت مکمل آزادی قائم کر دی ہے۔ ہر صیغہ وزیر کے زیر [illegible] ہے۔ اور وہ صوبجاتی حکومت کو حسب منشا تکمیل تشکیل و ترکیب کر سکتے ہیں لیکن صوبجات کا آمدنی کا ایک معقول حصہ ملازمتوں کی تنخواہوں [illegible]

دیگر اخراجات کے لئے مقرر ہے۔ اصلی یا دزارت کو امپیریل ملازمتوں کے حقوق یا مراعات میں دست اندازی کرنے کی اجازت نہیں۔ دیگر ملازمتوں میں تخفیف مشکل ہے۔ وہ پہلے ہی شور مچا رہے ہیں۔ کہ امپیریل ملازمتوں کے مقابلہ میں ان کی تنخواہیں بہت کم ہیں۔ عوام پر ٹیکس کا بار ناقابل برداشت ہے۔ وہ ہر تالیت میں کمی کے لئے کوشاں ہیں۔ اضافہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صوبجاتی حکومتوں کی نصف سے زیادہ آمدنی مالیہ دلگان سے وصول ہوتی ہے گزشتہ چند سالوں کے ادبار و مصائب نے زمینداروں کی حالت کو بد سے بدتر بنا دیا ہے۔ وہ مشکل سے گزارہ کر سکتے ہیں۔ اور مستحق ہیں کہ محاصل میں کمی ہو۔ لیکن دوسری طرف ترقی پسند صیغہ جات میں روپیہ درکار ہے۔ اور صوبہ کی تعلیمی صنعتی دیگر اصلاحات کثیر مصارف کی طالب۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ روپیہ کا کیا انتظام کیا جائے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں بیکاری پھیلی ہوئی ہے۔ ہر طرف شور ہے مگر اس کے انسداد کی ترکیب کی جائے۔ وزرا کے پاس روپیہ کہاں۔ ہندوستانی صنعت کو فروغ دینے کا بھی وزرا کو محدود اختیار ہے۔ ایکٹ کی دفعات پر اگر لفظ بلفظ عمل کیا گیا۔ تو ناممکن ہے۔ کہ صوبجاتی یا فیڈرل حکومت ان دشواریوں کا کوئی علاج تلاش کر سکے۔ کیونکہ اب ماہران تعلیم و اقتصادیات کا متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ اصلاح صنعت کے فروغ سے ہی ہو سکتی ہے لیکن دیگر اقوام ہندوستان کہیں آگے بڑھی ہوئی ہیں خصوصاً برطانیہ جو صنعتی انقلاب کے بعد دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ اور صنعتی انقلاب کو آج ایک صدی ہو گئی ہے۔ اس حالت میں ہندوستانی صنعت کو خصوصی مراعات تفویض نہ کریں۔ اور درآمد پر تعزیری قیود عائد کر کے ان کی اشیا کی درآمد بند نہ کر دیں۔ لیکن ایکٹ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ مستقبل نزدیک کے واقعات ہی ثابت کریں گے کہ خود مختاری صوبجاتی حکومت سے ہندوستان کو کیا فائدہ ہو گا۔

اندر سبھا اور سلطان عالم حضرت واجد علیشاہ

(نوشتہ مسٹر شہنشاہ حسین رضوی ایم اے ایل ایل علیگ ایم او آر اے ایس ایڈووکیٹ لکھنؤ)

اندر سبھا دربار اودھ میں

اندر سبھا کی تحقیق کا شوق نہ معلوم کس کس دل میں ہے ؟ گاہے گاہے کسی ادبی رسالہ میں کوئی نہ کوئی اندر سبھا پر خامہ فرسائی کر ہی بیٹھتا ہے میری نظر سے بھی چند مضامین گزرے ہیں جن کو میں غیر دلچسپ کبھی نہیں کہہ سکتا۔ یوں تو اندر سبھا بحیثیت اردو ڈرامہ کی ایک صنف کے اردو کی ملک ہے اور ہماری زبان کو اس پر پیدائشی حق حاصل ہے لیکن جہاں تک اندر سبھا کا اودھ کے دربار اور تاریخ سے تعلق ہے یہ سوال کہ آیا اودھ کے آخری تاجدار حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کو اندر سبھا سے دلبستگی تھی اور مغفور نے اس کو ایک ڈرامہ کی صورت میں شاہانہ کروفر سے قیصر باغ کے اسٹیج پر کھیلا تھا یا نہیں ؟ غور طلب ہے یہ کہا جاتا ہے۔ کہ حضرت جنت مکان کے دور حکومت میں یعنی انتزاع سلطنت اودھ سے قبل غالباً سین ۱۸۵۲ء و ۱۸۵۵ء کے درمیان جو عروج اندر سبھا کو ہوا وہ کسی عہد میں نہیں ہوا لیکن اس کے خلاف ایک نظریہ یہ ہے کہ شاہ معزول کو اندر سبھا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ یہ واقعہ کہ اندر سبھا قیصر باغ میں کھیلی جاتی تھی۔ کچھ حقیقت رکھتا ہے۔

بہرکیف دو متضاد نظریات ہیں۔ اور ہر نظریہ کی تائید میں کچھ نہ کچھ شہادت بھی ہے۔ اب تنقیح مقصد طلب یہ ہے کہ کن شہادتوں کو قابل وثوق قرار دیا جائے اور کن کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اور اگر ایسا کیا بھی جائے تو کیوں اور کن وجوہ کی بنا پر ؟

اندر سبھا قیصر باغ کے شاہی اسٹیج پر کھیلی گئی یا نہیں۔ اور اس کو ہمارے مخدوم کی سرپرستی حاصل ہوئی یا نہیں۔ اس سے قطع نظر کرکے اور کامل قطع نظر کرکے اس امر کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ عیش پرستی کے نشہ میں سرشار لکھنؤ اندر سبھا پر جو روحانی تفریح کا جدید آلہ بن گئی تھی۔ ٹوٹا پڑتا تھا۔ اس وقت چار اندر سبھائیں مشہور تھیں۔ جن میں میاں امانت کی اندر سبھا مقبول ترین اور مداری لال کی اندر سبھا مقبول تر تھی۔ اندر سبھاؤں کی تاریخ خود ایک مستقل بحث ہے۔ اور دلچسپ بحث۔ کبھی موقع ملا۔ تو کوئی مقالہ سپرد قلم کرکے ناظرین نیرنگ خیال کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ موضوع زیر فکر کے تحت میں صرف اس قدر تحریر کرنا غالباً کافی ہوگا۔ کہ اگر اردو ڈرامہ کی ابتدائی تاریخ کا سراغ لگایا جائے۔ تو اندر سبھا غالباً نقش اول ثابت ہوگی۔ اور خطا معاف یہ سہرا بھی لکھنؤ ہی کے سر رہے گا۔ نیز اندر سبھا کے پیدائش کے زمانہ کے تعین کے ساتھ اردو ڈرامہ کی پیدائش کا زمانہ بھی متعین ہو جائیگا۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ آمدم برسر مطلب۔ خوش قسمتی سے عہد شاہی کو ابھی کچھ کم ایک صدی گزری ہے۔ واجد علی شاہ کے عہد حکومت کے کہن سال افراد ابھی ربع صدی قبل ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی طرح موجود تھے۔ کچھ ایسے گنے چند سال قبل لکھنؤ میں بھی زاویہ عزلت میں زندگی کے آخری دن گزار رہے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اودھ کے دربار کی دلفریب مناظر دیکھے تھے۔ اور ان کے نقوش ان کے لوح دل سے محو نہیں ہوئے تھے۔ ایسی عینی شہادت کی موجودگی میں نہ قیاسات کی کوئی جگہ ہے نہ کسی تھیوری یا نظریہ کی گنجایش، اگر شہادت موثق ہے تو ہم کو چار و ناچار اس کو قبول کرنا پڑے گا۔ اور اسی کے مطابق فیصلہ کرنا پڑے گا۔ تذکرے متعدد ہیں تاریخیں بے شمار نہیں۔ تو بھی [illegible]

لیکن ان کی عشق گردانی حیثیت۔ اندرسبھا کا ذکر کہیں بھی نہیں خود سلطان عالم نے اپنی متعدد تصانیف میں سے کسی ایک میں بھی اندر سبھا کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ یہاں امانت کو تہ خاک ہونے زمانہ گزرا۔ لیکن ان کا خاندان ہنوز باقی ہے۔ امانت کی کئی تصنیفیں جو خود میری آنکھ سے گزری ہیں اور ان کے ورثا کے پاس محفوظ ہیں غیر مطبوعہ[1] ہیں۔ امانت کا نام محور مالا تذکروں میں جابجا آتا ہے۔ اور ان کی اندرسبھا کی شہرت و مقبولیت کی طرف بھی اشارات ہیں لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ امانت کی اندرسبھا قیصر باغ کے سنہ ویر قسب ماہ میں کھیلی جاتی تھی یا نہیں۔

مجلہ جرنل آف دی مسلم انسٹیٹیوٹ کلکتہ جلد ۱۸ اشاعت اجولائی لغایت ستمبر ۱۹۲۹ء صفحات ۲۵ تا ۴۶ میں نواب زادہ خان بہادر ابو الفیض محمد عبد العلی ایم اے الف آر ایس ایل کیپر سرکاری ریکارڈ کلکتہ و نمبر ایک اور بزرگ نے ایک مضمون بعنوان میٹیا برج کا بے تاج بادشاہ ــــ تصویر کا دوسرا رخ ــــ تحریر کیا ہے جس میں اندرسبھا پر چند سطریں لکھی ہیں مضمون کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

> بحیثیت ڈرامہ کے اندرسبھا بلاشبہ بڑی اہمیت رکھتی ہے اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ یہ اپنی صنف میں اول ہے واجد علیشاہ نے اپنے شاہانہ اہتمام سے قیصر باغ میں اندرسبھا اس وقت میں کھلوائی تھی جبکہ دربار اودھ کی شان و شوکت کا شباب تھا۔ شاہ گلفام کا پارٹ کرتے تھے اور دیگر ارکین سلطنت کو دوسرے کیرکٹر دئے جاتے تھے قیصر باغ میں اس وقت کوئی باقاعدہ اسٹیج نہ تھا۔ غالبا اسٹیج کا خیال کسی کے دماغ میں اس وقت پیدا ہوا تھا لیکن بادشاہ نے اس کو حقیقت سے اس قدر مشابہ کر دیا تھا کہ سبزہ زاروں کو اس طرح سنوار دیا گیا تھا۔ کہ وہ ایک وسیع اسٹیج اور قدرت کے اسٹیج کا کام دیتے تھے۔ چمن کے ایک گوشہ میں سفید بارہ دری کے سامنے راجہ اندر کا دربار آراستہ کیا جاتا تھا۔ دوسرے گوشہ میں گھنی جھاڑیوں کا جنگل بنایا گیا جس کی بھول بھلیاں میں سبز پری اپنے محبوب کے فراق میں ماہی بے آب کی طرح نظر آتی تھی۔ اور پھر کبھی کلیجہ کو سنبھال کے اٹھتی اور کبھی جنگل میں بھٹکتی خاک چھانتی پھرتی۔ ایک طرف پرستان تھا جس میں مہوش پریاں اپنے نازو انداز سے مرغ دل کو بسمل کئے دیتی تھیں۔ اس طرح پورا قیصر باغ رشک فردوس معلوم ہوتا تھا۔ اور ایکٹر ایک طرف سے دوسری طرف اس طرح جاتے تھے۔ جیسے پردہ اٹھ گیا ہے۔ اور ایک سین کے بعد دوسرا سین آگیا ہے۔ مٹیا برج میں قیصر باغ کہاں؟ تاہم بادشاہ نے اپنے قیام[1] کے ابتدائی سین میں اندرسبھا کے بعض سین کھیلے تھے۔

واضح رہے کہ اس وقت تک اردو میں کوئی ڈرامہ نہ تھا۔ واجد علیشاہ کے اکثر بلکہ قریب قریب کل اہل دربار انگریزی و سنسکرت سے جن میں ڈرامہ نشو و نما پا چکا تھا۔ واقف تھے۔ سچ پوچھیں تو وہ یہ بھی نہ جانتے تھے۔ کہ ڈرامہ ہے کیا؟ سلطان عالم کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا اور انہوں نے اس کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ تمام اندرسبھائیں شاہ معزول کی پیداوار ہیں۔ مداری لال کی اندرسبھا کے متعلق تو یقین نہیں لیکن امانت کی اندرسبھا خود بادشاہ کے ایما سے لکھی گئی تھی۔ اور امانت شاعر دربار تھے بھی۔

خیر ڈرامہ کی تکمیل کے لیے راجہ اندر کا افسانہ تجویز کیا گیا حقیقت یہ ہے۔ کہ انتخاب بھی خوب تھا۔ کیا کہنا؟ میاں امانت نے بادشاہ کے

[1] ان تصانیف میں ایک مختصر مثنوی ہے۔ ایک دیوان ہے۔ اور بے شمار قصائد نعتیہ ہیں شاہ امانت کو آخر عمر میں سلام گوئی سے بھی شوق ہو گیا تھا چنانچہ ان کے چند سلام میری نظر سے گذرے ہیں لیکن کس کو غرض کہ وہ ان کو شائع کرے

[1] غالبا ۱۸۵۶ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان میں اس وقت تک مرزا حامد علی ولیعہد زندہ تھے لیکن حامد علی کی حسرت ناک موت کے بعد بادشاہ کے دل پہ اوس پڑ گئی۔ اور پھر مٹیا برج نے کبھی کسی نغمہ کی آواز نہیں سنی۔

The Uncrowned King of Matia burj - The other side of the picture

خیال کو مدنظر رکھ کر پورا قصہ نظم کیا۔ اور سر دربار سنایا۔ امانت کی اندر سبھا صرف عہد سلطنت ہی میں مقبول نہ تھی۔ بلکہ آج بھی اس کی مقبولیت اسی قدر ہے۔ جتنی ایک صدی قبل۔

راجہ اندر پریوں کا بادشاہ ہے۔ دوسرے کیرکٹر جی السان ہیں۔ بلکہ دیو پری اور جن ہیں۔ دربار کی ایک مہ جبین پری ایک نوجوان پر جس کا نام گلفام ہے عاشق ہوتی ہے۔ اور اس کو پرستان اڑا لے جاتی ہے۔ راجہ کو ایک دیو سے تمام واقعہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اور پری کی اس حرکت پر غضبناک ہو جاتا ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ گلفام ایک اندھے کنوئیں میں مقید کیا جائے اور سبز پری کے پر کاٹ کر اس کو نکال دیا جائے۔ عرصہ تک یہ نامراد حرماں نصیب اپنے دلدار کی تلاش میں جنگلوں، بیابانوں کی خاک چھانتی پھرتی ہے۔ لیکن آخر کار جوگن کے بھیس میں اندر کے حضور میں پیش ہوتی ہے۔ راجہ اس سے گانے کی خواہش کرتا ہے۔ پھر تو وہ نغمہ سرائی کرتی ہے۔ کہ راجہ وجد میں آ کر انعامات کی بارش کرنے لگتا ہے۔ لیکن سبز پری کو الٹ مرغ کرم سے کیا سروکار؟ جب اندر بہت مصر ہوتا ہے۔ تو وہ صداقت سے کہتی ہے جو مانگوں گی وہ مجھ کو عطا ہو گا۔ راجہ راضی ہو جاتا ہے۔ اور عہد کر لیتا ہے۔ سبز پری گلفام کو مانگتی ہے۔ مراد بر آتی ہے۔ گلفام آ کر ملتا ہے۔ اور اس طرح ڈرامہ کا پر سرور اختتام ہوتا ہے۔

فاضل مضمون نگار نے کسی تذکرہ یا کسی راوی کا حوالہ نہیں دیا ہے لیکن وہ اس جگہ بیٹھا ہوا لکھ رہا ہے۔ جہاں تاریخوں کے بے شمار نادر الوجود نسخے بیش بہا دستاویزات۔ فرامین۔ شقے محفوظ ہیں۔ ممکن نہیں کہ نو ابزادہ نے آنکھ بند کر کے خامہ فرسائی کی ہو۔ اس وقت یعنی ۱۹۰۵ء میں مٹیا برج ہی میں عہد واجدی کے بہت سے بڈھے حیات تھے۔ جنہوں نے یہ مناظر بچشم خود دیکھے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اندر سبھا کا قیصر باغ میں کھیلا جانا ان بڈھوں کی شہادت کی بنا پر تحریر کیا گیا ہو۔ بہرکیف جہاں تک دستاویزی اور قلمی شہادت کا تعلق ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقتباس بالا معتبر ترین شہادت ہے۔ اور مضمون اس شخص کا شاہکار ہے جس نے بلا تحقیق و تدقیق ایک سطر بھی کبھی تحریر نہیں کی۔ نواب زادہ کے تبحر علمی اور تاریخ دانی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اندر سبھا عہد سلطان عالم میں خود شاہی اہتمام سے قیصر باغ کے قدرتی اسٹیج پر کھیلی گئی اور خود بادشاہ و سر دگر ارکان و اعیان سلطنت نے حصہ لیا۔

اب ہم عینی شہادت کے فراہم کرنے کی کوشش کریں گے۔

داروغہ سید محمد عہد شاہی میں کسی محل کے داروغہ تھے اور ۱۳۲۱ھ میں جب ان کا انتقال ہوا تھا۔ انہوں نے سو سے اوپر عمر پائی۔ علامہ نظم طباطبائی سے بہت یارانہ تھا۔ بڑھاپے میں بھی سرخ و سفید۔ چوگوشہ ٹوپی سبز پتی کا نیچی چولی کا انگرکھا۔ نیچے گاڑھے کا کرتہ۔ گلشن سوت کا رومال۔ ڈھیلی مہری کا پاجامہ۔ نوکی کا جوتہ۔ اپنی وضع کے پابند۔ وضعداری پرانی چال اور عہد شاہی کی یادگار کی حیثیت سے یگانہ روزگار تھے۔ اس وضع کا کوئی بزرگ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ان کی گفتگو کا انداز، خلق و مروت، آداب و تہذیب سب اگلے زمانہ کے لوگوں کا سا تھا۔ ایک دن محفل میں کسی نے اندر سبھا کا ذکر چھیڑ دیا۔ بے اختیار آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ حق بجانب ہیں۔ جو انہوں نے دیکھا ہے۔ کاش ہم خواب ہی میں دیکھ لیتے۔

موصوف قبل غدر اور بعد غدر کے واقعات نہایت مفصل اور تعین زمانہ کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ انہوں نے ۱۲۶۸ھ و ۱۲۶۹ھ میں اپنی آنکھ سے قیصر باغ میں اندر سبھا دیکھی تھی۔ آپ بھی منظر کی دلفریبی سے محظوظ ہوجئے۔

اندر سبھا کا منظر

بادل بھری رات ہے۔ چاندنی سبزہ پر کیفیت کئے ہوئے ہے۔ نہر کا شفاف چشمہ آب اپنے مرمریں لبوں سے چھلک رہا ہے۔ اور اس آئینہ نور پر ماہ تاباں کا انعکاس عجب سرور سے طبیعت کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ سرو شمشاد جو نہر کے کنارے کنارے دور دور تک دو رویہ کھڑے ہیں۔ ان پر بادلا اس طرح

کہکشاں ستون نظر آ رہے ہیں۔ زمردیں سبزہ زار اندر سبھا کا اسٹیج ہے اور اس قدر وسیع اسٹیج ہے کہ سارے چمن کو محیط کئے ہوئے ہے۔ افشاں کی دھول اڑ رہی ہے۔ اکثر محول موتیوں کی بھبوت سے پر سلے ہوئے ہیں۔ اور ان کی روپہلی کارچوبی لونیاکیں نظروں کو خیرہ کئے دیتی ہیں۔ ہر سمت رنگ چاندی سونے ہیں اس طرح لدے ہوئے ہیں۔ کہ ان پر نقرئی دھلائی مٹرک بتوں کا سنہ ہوتا ہے۔ خوش پریوں کے پر جسب طور تو اور جواہر لٹا رہا ہے۔ زنانے پارٹ سب حسین لڑکیوں کو دئے گئے ہیں۔ اور مردانے پارٹ احسان سلطنت کو خود بادشاہ شہزادہ گلفام بنے ہوئے ہیں۔ میاں امانت مصنف سبھا چودھار ہیں ماں مسمار علد سارنگی مجیرا وغیرہ دربار کے مخصوص کامل اسمادر سار رہے ہیں۔ یہ مد نظر رہے۔ کہ تاروں بھری رات میں بجائے دھول کے افشاں اور اسی مناسب سے بجائے بھبوت کے محلول موتی چھنے گئے۔

پلاٹ

یہ امر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ جو اندر سبھا کہ کھیلی جاتی تھی وہ من وعن میاں امانت ہی کی اندر سبھا تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ کی طبیعت میں غضب کی ندرت تھی۔ جب مٹیا برج (نمونہ لکھنؤ) کے شاہی کبوتر خانہ کے ہزاروں کبوتروں میں ہر کبوتر کا نام تھا۔ اور سلطان عالم اس کبوتر کو اسی نام سے پکارتے تھے تو اندر سبھا میں جدت پیدا کرنا کون بڑی بات تھی۔ یہ ضرور ہے کہ رائج الوقت اندر سبھاؤں میں میاں امانت کی اندر سبھا کو حضرت ظل سبحانی کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا۔ کیوں؟ اس وجہ سے کہ امانت درباری شاعر تھے اور عجب نہیں کہ انہوں نے اندر سبھا خود بادشاہ کے حکم سے نظم کی تھی۔ بلکہ میں تو یہاں تک بلا تامل کہنے کو تیار ہوں۔ کہ خاص قیصر باغ میں کھیلے جانے کے لئے نظم کی تھی لیکن جب منظوم ہو کر حضور میں پیش ہوئی تو ڈرامہ کی ضروریات کے لحاظ سے اس میں بہت سی خامیاں تھیں۔ مکالمہ میں جا بجا تغیر کیا گیا تھا۔ [illegible] کو زیادہ دلچسپ اور عشق آمیز بنایا گیا تھا۔ یہ بھی ترمیم خود [illegible]

بادشاہ کی ہوگی۔ دوسرا نقص یہ تھا کہ امانت کی اندر سبھا میں گانے نہیں تھے یہاں پور دربار اندر کا اکھاڑا تو تھا ہی۔ ایک سے ایک یکتائے روزگار موسیقی والوں کا اجتماع تھا۔ صرف اشارے کی دیر تھی۔ اور بے شمار دادرے ہوری دھرپد۔ دادرے ٹھمریاں ٹپے خیال وغیرہ راگ راگنیاں داخل کر دئے گئے اور دو چار ریہرسلوں Rehearsals میں صاف کر لئے گئے۔ خود جان عالم اختر پیا دادرا ٹھمری گو تھے۔ ایک دو نہیں بے شمار دادرے ٹھمریاں ان کی اب تک مشہور ہیں۔ اور گائی جاتی ہیں۔ گانوں میں ممکن نہیں کہ بادشاہ کا کوئی دادرا یا ٹھمری داخل نہ کی گئی ہو۔ غدر کے چند سال پہلے کئی برس تک اندر سبھا کھیلی جاتی رہی اور اس میں شک نہیں کہ اندر سبھا واجد علی شاہ جنت مکاں کے عہد حکومت کا آخری سوق تھا۔ یہی تو وجہ ہے کہ حسا نواب زادہ ابو الفیض محمد عبد الحی اپنے مضمون میں جس کا اقتباس پیش کیا گیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ جب مٹیا برج میں اجڑا لکھنؤ نے جنم لیا ہے۔ تو جان عالم نے اثنائے قیام میں اندر سبھا کے کچھ حصے کھیلے تھے۔ مگر پوری اندر سبھا کبھی مٹیا برج میں نہیں کھیلی گئی۔

آخر الذکر کے متعلق تعین سنین نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے یہ واقعہ مرزا حامد علی ولیعہد سلطنت کی وفات سے قبل کا ہے حامد علی اقدس خوش بخت کی موت کے بعد مٹیا برج کی صحبتیں سرد ہو گئی تھیں۔ اور بادشاہ بھی بجھ کر شمع کشتہ ہو گئے تھے۔

خاتمہ

افسانہ لطیف ضرور تھا۔ مگر طویل ہو گیا۔ خوش ہوں کہ نتیجہ نکل آیا اور اندر سبھا کے پر سر در تذکرہ میں یہ امر بلا تامل کہا جا سکیگا۔ کہ محولہ بالا مرتوں وعینی شہادت کی بنا پر اندر سبھا کو قیصر باغ کے شاہی اسٹیج پر حضرت عالم واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کی سرپرستی کا ضرور شرف حاصل ہوا۔ اور "اختر پیا" نے بنفس نفیس گلفام کا پارٹ کر کے اسے عروج دیا جس پر اردو ڈرامہ جس قدر بھی ناز کرے کم ہے ۔

یاد ہیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں!

ممی خانے میں ایک رات

(از قلم مسز حجاب امتیاز علی)

اس شب میں اپنے اپریشن روم میں بہت دیر تک مُردوں کی چیر پھاڑ میں مصروف رہا۔

رات بہت گرم اور بعید سنسان تھی۔ دریچوں کے باہر اندھیرا۔ جیسے تھکان سے نڈھال ہوکر لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ نہ آسمان پر چاند تھا۔ نہ زمین پر کسی قسم کی آواز۔ دور دور تک تاریکی اور ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔

میں اپنے "لاشوں کے کمرے" میں جسے میں اپنا "ممی خانہ" کہا کرتا تھا۔ اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ ایک مردے کے پوسٹ مارٹم میں مصروف تھا۔ میں ہمیشہ رات کے سنسان گھنٹے اپریشن روم میں مردوں کی چیر پھاڑ میں بسر کرنے کا عادی ہوں۔

جس سنہ کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں گاؤں میں وبا اس شدت کی پھیلی تھی۔ کہ ہر ایک کا دل مُٹھی میں تھا۔ صبح جو آدمی ہنستا بولتا تندرست اُٹھتا۔ وہ شام تک قبر میں جا لیٹتا۔ صبح سے شام کرنا اور شام سے صبح کرنا جوئے شیر لانا تھا۔

مجھے ہمیشہ سے مردوں کی چیر پھاڑ میں دلچسپی رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہیضے کے مُردے کس بے دردی سے پھینک دیئے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں مجھے اپنے تجربات کے لئے لاشیں غیر معمولی کثرت سے دستیاب ہو رہی تھیں۔

میں اپنی تجربہ گاہ میں تھا۔ ممی خانہ بڑے بڑے برقی لیمپوں سے روشن تھا۔ کمرے کے درمیان میں میز پر ایک لاش پڑی تھی۔ میں اس کے چیرنے میں مصروف تھا۔ مجھے کمرے کے بند شیشوں کے دریچے ہوا کے لئے کھول رکھے تھے۔ دریچے کے پاس ناشپاتی اور املی کے منحوس اندھیرے درختوں پر شاید گوشت کی بُو سے بے تاب ہوکر اُلو اور گدھ آ بیٹھے تھے۔ اور تاریکی میں بار بار اپنے پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کی بیقراری اور بے تابی میری مصروفیت میں بار بار مخل ہوکر مجھے کھجا رہی تھی۔

میں نے بیزار ہوکر اسسٹنٹ سے کہا۔ "میرا دریچہ لگا دو۔ ان منحوس مردار خور پرندوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے"!

ابھی میرا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا۔ کہ ایک بڑا سا اُلو اپنے بوجھل پھول سے جیسے تاریکی میں تیرتا ہوا کمرے میں گھس آیا۔ اور میرے سر کے اوپر دائرے کی صورت میں گھومنے لگا۔ میں نشتر ہاتھ سے رکھ کر اسے باہر نکال دینے کے لئے ایک وحشیانہ انداز میں ہاتھ ہلانے لگا۔ لیکن اُلو میرے غصے اور پریشانی سے بے نیاز اپنے طواف میں مصروف رہا۔ طیش کی ایک لہر سے میری کنپٹیاں گرم ہوگئیں۔ میں نے کہا۔ "نحس چڑیا یہ اس طرح نہیں مانے گی"۔ یہ کہتے ہوئے میں نے ایک تیز چاقو اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ اتفاق سے وہ سیدھا اس کی آنکھ میں جا لگا۔ اور وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ پھڑپھڑا کر دریچے سے باہر بھاگ گیا۔ اور رات کی خوفناک تاریکی میں جذب ہوگیا۔

میں صبح تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ کوئی چھ بجے کے قریب ممی خانے سے تھکا ماندہ نکلا۔ اور اپنے کمرے میں گیا۔ ۔۔۔ بالکل غافل ہوگیا۔

(۴)

میں دن بھر سوتا رہا۔ اور میری نیند ختم نہ ہوئی۔ میری روح ممی خانوں کا گشت لگا رہی تھی۔ ڈراؤنے اور ہیبتناک خواب دیکھے۔ لاشوں کو چلتے پھرتے دیکھا۔ کبھی کفن میں لپٹے ہوئے جسموں کو مصروف رقص دیکھا۔ شام کے وقت جب بیداری کی سرحد کی مدھم آوازیں خواب کی دنیا میں رفتہ رفتہ نفوذ کر رہی تھیں۔ تو اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی اس زور سے بجی۔ کہ میں چونک پڑا۔ نیند اور غنودگی یکلخت اڑ گئی۔ ڈراؤنے خواب میرا منہ چڑاتے ہوئے غائب ہو گئے۔ اور میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ کھول کر باہر بھاگا۔ اور ٹیلیفون اٹھا لیا۔

"ڈاکٹر رہبری گھر پر ہیں؟"

"جی میں بول رہا ہوں۔"

"نمبرے اندھی باؤلی پر آج رات گیارہ بجے کے قریب ملیئے۔ ایک مریض آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ پتہ اپنی یادداشت کی کتاب میں لکھ لیجئے۔"

میں کچھ سوچ کر بولا۔ "مگر ذرا ٹھہرئیے ـــــ آج تو میرا ایک اور ـــــ"

مگر پھر آواز آئی! آپ کو ملنا ہوگا۔ مریض آپ کا منتظر ہوگا۔ نمبرے اندھی باؤلی۔"

ٹیلیفون بند ہو گیا۔ اور لامحالہ مجھے اپنی یادداشت میں رات کی ملاقات کا وعدہ لکھنا پڑا۔

گرمی کے دن تھے۔ سات تو بج ہی چکے تھے۔ رات ہونے میں کیا دیر تھی۔ جلد جلد میں نے غسل کیا۔ کھانا کھایا۔ فارغ ہوتے ہی بیگ لیکر ایک ٹیکسی کرایہ کی چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اور نمبرے اندھی باؤلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

گاڑیبان حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ "اندھی باؤلی! میرا تو خیال ہے۔ کہ وہاں کوئی نہیں رہتا۔ یہ سڑک شہر سے بہت دور ندی کے کنارے قبرستان ہے۔ اس سے لگی ہوئی ہے۔ پہلے وہاں اینٹوں کا ایک [illegible] تھا میرا خیال ہے۔ کہ اب وہ بھی اٹھ چکا ہے۔"

میں ہمیشہ ملازموں اور کمینہ لوگوں سے ڈانٹ کر بات کرنے کا عادی ہوں۔ طبعاً سخت آدمی ہوں۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"احمق! تمہیں اس سے کیا۔ چلو ہم جہاں کہتے ہیں۔"

رفتہ رفتہ گاڑی شہر سے باہر نکل گئی۔ اور ایک اجاڑ سڑک پر چلنے لگی۔ رات گہری اور اندھیری ہوتی جاتی تھی۔ ہر طرف ایک ویران سناٹا برس رہا تھا۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی خفیف آوازیں آ رہی تھیں۔ سڑک کی خاموشی پر گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز ایسی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے کسی جن کی بارات میں ڈھول بج رہے ہوں۔

میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ گیارہ بجنے میں چند ہی منٹ باقی تھے۔

میں نے گاڑیبان سے تیزی سے چلنے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہماری گاڑی پل سے نیچے اتر آئی۔ تو مجھے بڑا تعجب ہوا۔ "کیا یہی اندھی باؤلی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی۔" گاڑیبان نے سرد مہری سے جواب دیا۔ وہ مجھ سے چڑا ہوا تھا۔

"یہاں تو زندگی کے آثار ہی نہیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا۔" اس نے بے پروائی سے کہا

مجھے غصہ آیا۔ "گستاخ تم یہیں ٹھہرو۔ میں اتر کر وہ مکان تلاش کرتا ہوں۔ جہاں میرا مریض میرا انتظار کر رہا ہے۔"

یہ کہہ کر میں گاڑی سے کود پڑا۔ اور ہاتھ میں بیگ لیکر سڑک کے کنارے کنارے، نمبر کا مکان ڈھونڈتا ہوا آگے بڑھا۔ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتا ہوا بہت دور چلا گیا۔ کچھ دیر بعد مڑ کر دیکھا۔ تو اب گاڑی کی روشنیاں بھی نظر نہ آتی تھیں۔ چاروں طرف وحشتناک تاریکی کا سیلاب لہریں مار رہا تھا۔ یکلخت مجھے خوف سا معلوم ہوا۔ چاہتا تھا۔ کہ مڑ کر بھاگ جاؤں۔ کہ اچانک کسی کے درد و کرب سے کراہنے کی مدھم آواز آئی۔ میں تھم گیا۔ ہمت بندھی۔ کہ یہاں کوئی انسان موجود ہے۔ دفعتہً دور سے ایک روشنی نظر آئی۔ میں نے حوصلہ سے کام لینا چاہا۔ اس کی طرف بڑھا۔ مگر میرے قدم پیچھے ہٹ رہے تھے۔ آخر ہمت کر کے آگے گیا۔

ایک اجڑے مکان کے دروازے میں ایک دیا ٹمٹما رہا تھا۔ میں قریب پہنچا تو دیکھا۔ کہ بوسیدہ لکڑی کے دروازے میں ایک سو سال کی سفید رنگ بڑھیا ہاتھ میں مٹی کا دیا لئے جیب چاپ کھڑی ہے۔ منہ پر جھریاں۔ منہ میں دانت نہیں ٹھوڑی نکلی ہوئی۔ میرے دل میں ہیبت گہری اترنے لگی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مکان کوئی شکستہ اور پرانی قبر ہے۔ جس میں یہ بڑھی عورت مردے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ٹمٹماتے ہوئے دیئے کے شعلے کو ٹکٹکی باندھ کر گھور رہی تھی۔ غور سے دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ انسانی کھوپری میں دیا ٹمٹما رہا تھا۔ میرے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے ـــــ میں بھاگنے کا ارادہ کرنے لگا۔

مگر اسی پل بڑھیا نے کہا۔" ڈاکٹر صاحب آئیے۔ آپ ہی کا انتظار ہے"

بڑھیا کے حلق سے آواز نکلتی دیکھ کر میں سنبھل گیا۔ ذرا سے توقف کے بعد تردد سے اس کا چہرہ تکتے ہوئے میں نے اندر قدم رکھا۔ گھر کیا تھا۔ ایک ویرانہ تھا۔ کہیں دیواریں گر رہی تھیں۔ کہیں چھتیں غائب۔ چوکھٹ پر گھاس اُگ آئی تھی۔

میں نے کہا۔" معزز خاتون! مریض کہاں ہے ؟"

بڑھیا نے مجھے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔

زعفرانی رنگ کا لمبا کرتا پہنے۔ سفید بال گھٹنوں سے نیچے لٹکائے۔ دیا جو انسانی کھوپری میں جل رہا تھا۔ ہاتھ میں اٹھائے بڑھیا آگے آگے چلی جا رہی تھی۔ اور میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

آخر وہ حجرہ آیا۔ جہاں مجھے جانا تھا۔ یہاں پہنچکر بڑھیا دروازے پر رک گئی۔ اور مجھے اشارہ کیا۔ کہ اندر جاؤ۔" میں دل کڑا کر کے اندر چلا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک شکستہ چارپائی پر ایک ضعیف بڈھا کراہ رہا ہے۔ اور اس کی داہنی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اسی کے کراہنے کی آواز مجھے باہر سڑک پر آ رہی تھی۔ اس کی دوسری آنکھ لہو کی طرح سرخ ہو رہی تھی۔ اور غول بیابانی کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے ایک آنکھ سے گھور رہا تھا۔

"کیا یہی مریض ہے؟" میں نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں" بڑھیا نے کہا۔

"ان کی تو آنکھ پر کوئی زخم ہے۔ کیا تکلیف ہے؟" یہ کہہ کر میں مریض پر جھکا۔

دفعتہً بڑھیا نے دیا نیچے پٹک دیا۔ اپنا خوفناک لال کرتا سمیٹ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ اور خونخوار انداز میں مجھ پر جھپٹی۔

"ظالم سفاک ڈاکٹر۔ کیا تجھے یاد نہیں۔ کہ یہ زخم کسطرح یہاں لگا تھا! تو نے سمجھا۔ کہ تیرا یہ قصور معاف کر دیا جائے گا ـــ لے اب اپنے کئے کی سزا" یہ کہہ کر اس نے تیز چاقو اٹھایا۔ اور میری آنکھ کی طرف اس طرح جھپٹی۔ جیسے وہ اسے پھوڑ دینا چاہتی ہے۔

میں بے ہوش ہو گیا۔

دوسرے دن پولیس نے مجھے اندھی باؤلی کے کھنڈروں میں سے اٹھایا۔

بعض کہتے ہیں۔ مجھے کوئی ذہنی عارضہ ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ لاشوں کی دن رات کی صحبت نے میرا دماغ بگاڑ دیا ہے۔

برلعلامت

(۱) نغمۂ حیات

وڈزورتھ لونگ فیلو ۱۸۰۷ء میں اضلاع متحدہ امریکہ میں پیدا ہوا۔ اس نے ۱۸۸۲ء میں انتقال کیا۔ یہ امریکہ کا مشہور ترین شاعر ہے۔ اس کے مضمون کی امتیازی خصوصیت ان کی عبرت اور نصیحت ہے۔ ٹے نی سن کی طرح یہ شہرت سے گھبراتا تھا۔ اس کے مزاج میں حالی کی انکساری تھی اور کلام میں حالی کا درد ہے۔ مندرجہ ذیل اس کی ایک مشہور نظم سام آف لائف کا ترجمہ ہے یہ نظم درحقیقت ایک طویل نظم تخیلیا کا جزو ہے

۱- غم آمیز اشعار میں مجھے مت کہو کہ
زندگی ایک خواب پریشان ہے
درحقیقت مردہ خوابیدہ روح ہوتی ہے
اور اشیا ایسی نہیں جیسی نظر آتی ہیں

۲- زندگی ایک حقیقت ہے۔ زندگی ایک صداقت ہے
اس کی منزل مقصود قبر نہیں ہے
یہ روح کے بارے میں نہیں کہا گیا ہے
کہ تو مٹی ہے اور مٹی میں مل جائے گا

۳- نہ خوشی اور نہ غم
ہماری مقصود منزل ہے یا منزل مقصود ہے
بلکہ "عمل" کہ ہمارا کل
آج سے بہتر ہو

۴- دنیا کی وسیع رزمگاہ میں
زندگی کی ... ہو

بلکہ بہادرانہ شریک جنگ ہو

۵- مستقبل پر تکیہ نہ کرو۔ اگرچہ وہ کیسا ہی خوشگوار ہو
بےجان ماضی کے مردوں کو گڑے ہی رہنے دو
عمل کرو۔ زندہ زمانہ حال میں عمل کرو
دل میں ہمت رکھو اور خدا پر بھروسہ کرو

۶- تمام بڑے آدمیوں کی سوانحعمریاں ہمیں بتاتی ہیں
کہ ہم بھی اپنی زندگی کو اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا سکتے ہیں
اور سفر آخرت پر روانہ ہونے کے بعد
ریگ عالم پر نقش پا چھوڑ سکتے ہیں

۷- یہ نقش پا ایسے ہوں گے کہ شاید کسی بھائی کو
جس کا جہاز ڈوب چکا ہو۔ جو مایوسانہ
زندگی کے عبرت انگیز سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہو
انہیں دیکھ کر ڈھارس بندھے۔

۸- آؤ ہم تیار ہو جائیں اور کام کریں
ہمت سے اور بلالحاظ نتیجہ کے
ہمیشہ کچھ حاصل کرتے رہنا ہمیشہ کی کوشش میں رہنا
محنت کرنا۔ اور نتیجہ کا انتظار کرنے بیٹھنا

(۲) حیات

جیرامی ٹےلر۔ یہ بمقام کیمبرج ۱۶۱۳ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۶۶۷ء میں انتقال کیا۔ یہ ایک مشہور پادری تھا۔ اس نے عیسائی مذہب پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں خانہ جنگی کے زمانہ میں چارلس اول کا

بعد ڈبن یونیورسٹی کا وائس چیئرمین بنا دیا گیا۔ اس کی بہترین تصنیف ہولی لونگ اور ہولی ڈائنگ ہے

معلوم ہوتا ہے کہ زندگی ایک ملاح ہے
اور خود عرصار خیالات میں مصروف ہے
درازی روز وجہ خبر نہیں ہو سکتی
جب تک کہ اس کا استعمال نہ سمجھ لیا جائے
اگر ایک سال بھی نیک کام میں گزر جائے
تو وہ ایک عمر سے بدرجہا بہتر ہے
لیکن اگر ایک سال فضولیات میں گزر جائے
تو اندیشہ ہے کہ ایسے ہی ہزاروں برس گزر جائیں گے
عقلمندی سکھانے کے لئے وقت انتظار نہیں کرتا
زمانہ کے ساتھ ہمیں اپنی اصلاح خود کرنی چاہیئے

جیرامی ٹیلر

(۳) کوتاہی عمر

کوپر ۱۷۳۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۰۰ء میں انتقال کیا۔ یہ بچپن کے زمانہ ہی سے غمگین ہا کرتا تھا۔ آخر عمر میں تو مالیخولیا ہو گیا تھا۔ ان ومٹر" کے خاندان میں جب اس کی آمد و رفت ہوئی اس وقت کسی قدر اس کے مزاج کی اصلاح ہوئی۔ مسزان ونسزا اور لیڈی ولش کے اصرار پر ہی اس نے اپنی دو مشہور نظمیں "جان گلپن" اور "دی ٹاسک" لکھیں۔ اس کے خطوط دوستانہ مراسلت کا نمونہ ہیں۔ اور مختصر نظمیں ادب لطیف کی بہترین مثال ہیں

غروب ہونے والے آفتاب اور زوال پذیر ماہتاب
طلوع ہوتے ہیں اور بار بار ظہور میں آتے ہیں۔
جن ستاروں کو روز روشن چھپا دیتا ہے۔ انہیں
شب اپنی آمد پر منور کر دیتی ہے۔
نہلاتی چمن اور گلہائے باغ۔ خلاق رحمہ ارض کی
حسین ترین مخلوق۔ صرف چند روز کے لئے
باد خزاں کے ہلاکت انگیز تنفس سے
مردہ ہو جاتے ہیں۔
باد نسیم چلتی ہے۔ منور آسمان
زمین کو گرماتے ہیں۔ اور یہ پیدا ہو جاتے ہیں
مگر افسوس! ہم زمین کے مغرور بادشاہ!
ہم جو بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں
شباب زندگی کو بہت جلد کھو بیٹھتے ہیں
اور تھوڑی سی دیر میں کملا اور مرجھا جاتے ہیں
بہار آتی ہے مگر بہار تازگی نہیں لاتی
ہماری قبر میں خزاں ہمیشہ رہتی ہے

کوپر

(۴) ہر شے پر خدا کا نقش ہے۔

مسز اوپیی ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوئی۔ اور اس نے ۱۸۵۳ء میں وفات پائی۔ اس کی شادی مشہور مصور جان اوپیی سے ہوئی۔ زمانہ کتخدائی بہت خوش گزرا۔ یہ جان اوپیی کی صحبت ہی کا فیض تھا۔ کہ مسز اوپیی تصنیف و تالیف کی طرف رجوع ہو گئی۔ اس کی ایک ناول "پدر و دختر" بہت مشہور ہے۔ ۱۸۲۵ء میں سوسائٹی آف فرینڈز (بزم احباب) میں شریک ہو گئی۔ اس کے بعد سے اس نے بہت کم مستقل تصانیف کی جانب توجہ کی۔ البتہ ماہانہ رسالوں کے لئے مضامین لکھتی رہی۔ سطور ذیل میں اس کی ایک نظم کا ترجمہ ہے

۱۔ گلشن میں کوئی ایسا پتہ نہیں
درخت پر کوئی ایسا پرندہ نہیں
گل پر کوئی ایسا قطرۂ شبنم نہیں
جس پہ اے خدا تیرا نقش نہیں

۲۔ یہ قسم قسم کے پتے تیرے ہی ہاتھوں نے بنائے ہیں
پرندوں کو دل گداز آواز تو نے ہی دی ہے
تیری قدرت نے قطرۂ شبنم میں ایسے رنگوں کی آمیزش کی ہے
کہ وہ ہیرے کی طرح چمک اٹھتا ہے

۳. ہاں یہ قطرہائے شبنم برگہائے درخت۔ غنچے اور تمام
چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی اشیا
وسعت بر اعظم ۔ زمین کا عظیم الشان کرہ
ایک زبان ہو کر اسے بادشاہوں کے بادشاہ تیری شہادت
دیتے ہیں۔

شیر دلی

(۵) حمد خدا

آئی زاک واٹس ۱۶۷۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۴۸ء میں اس نے
وفات پائی۔ ایک پادری تھا۔ بچپن میں کثرت مطالعہ کی وجہ سے
صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اس شخص کا اکثر حصہ عمر زہد کی
عزلت میں گزرا۔ واٹس اپنی حمد کے لئے بہت مشہور ہے۔
مندرجہ ذیل ترجمہ اس کی ایک حمد کا ہے
۱۔ اے عظمت و شان والے خدا! تیری محبت کس قدر بے پایاں ہے
ہر شام تیری نئی نئی نعمتوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے
ہر صبح تیری رحمتیں شبنم کی طرح آسمان سے
آہستہ آہستہ برستی رہتی ہیں
۲۔ اے میری نیند کی ساعتوں کا نگران
تو میرے آرام کے واسطے شب کا پردہ ڈال دیتا ہے
پھر تیرا فرمان خسروی عالم کو روشن کر دیتا ہے
اور میری تمام خوابیدہ قوتوں میں روح پھونک دیتا ہے
۳۔ میری قوتیں تیری خدمت میں پیش ہیں۔
میں نے اپنے دن تیرے لئے وقف کر دئے ہیں۔
تیرے ہاتھوں سے ہمیشہ رحمتوں کی بارش ہوتی رہتی ہے
مجھے بھی چاہئے کہ سدا تیری حمد میں مصروف رہوں (آئی زاک واٹس)

(۶) یاد خدا وجہ تسلی ہے

ٹامس مور آئرلینڈ کا باشندہ تھا ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا
قومیت کی محبت اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاید ہی اس کی کوئی
[illegible]

طرح بہت مشہور ہے۔ یہ بھی تخیل کا بہترین نمونہ ہے۔ ٹامس مور بائرن کا بڑا دوست تھا
۱۔ اے اشکبار آنکھوں سے آنسو پونچھنے والے!
یہ دنیا کس قدر تاریک ہو جائے۔
اگر ہم غم خوردہ اور فریب خوردہ ہو کر
تیرے آغوش میں پناہ نہ لے سکیں
۲۔ تو شکستہ دل پر اس طرح مرہم کاری کرتا ہے۔ کہ
وہ ان درختوں کی مانند جو اپنے
زخم خوردہ حصہ سے خوشبو کی مہک پھیلا دیتے ہیں
اپنے غم سے دوسروں کے لئے باعث اطمینان ہوتا ہے
۳۔ غم تیرے مس سے درخشاں ہو جاتا ہے۔
اس کی کرنیں مسرت کی شعاعوں سے زیادہ روشن ہوتی ہیں
تاریکی میں ہم کو وہ تمام روشن دنیائیں نظر آتی ہیں
جو دن کی روشنی میں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ (ٹامس مور)

(۷) پرواز وقت

۱۔ اے دریائے رواں۔ دھیما دھیما چل
اے غائب ہونے والے خواب کے مانند
سمندر کی جانب بہنے میں ہمیشہ
اپنی خاموشی اور متانت کو قائم رکھ۔
وقت بھی ایسی ہی کم آواز حرکت سے
ہوا کے بازوؤں پر ایک نا پید بحر جاوید کی جانب
اڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور اپنا
تمام خزانہ وہاں دفن دیتا ہے۔
۲۔ گلاب کھلتے ہیں اور پھر کھلا جاتے ہیں۔
رخسار مسرور ہوتے ہیں۔ اور پھر مرجھا کر مرجاتے ہیں
نورانی صورتیں یہاں اڑ کر آتی ہیں۔
مگر پھر خواب کی مانند غائب ہو جاتی ہیں
جس طرح شام کے وقت بادل ہزاروں رنگ
مغرب کی جانب بکھرے ملتے ہیں۔ اسی طرح

ناگ رانی

از قلم جناب علامہ محمد الدین صاحب تاثیر ایم اے پی ایچ ڈی پرنسپل ایم اے او کالج امرتسر

آج سے چھ سال قبل ہم نے یہ نوٹ لکھا تھا۔

ہم یہ سلسلہ جو سالنامہ کی زینت ہے۔ بڑے فخر و ابتہاج سے پیش کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ دعوے ہے کہ مشرق و مغرب ہندی اور اردو کا اس سے لطیف تر امتزاج ناممکن ہے تشبیہات کس قدر رنگین ہیں۔ عبارت کتنی مترنم ہے!

لطف یہ ہے۔ کہ اضافت کا استعمال کہیں بھی نہیں کیا گیا۔ بظاہر یہ ایک ترجمے کا ترجمہ ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ ایک مستقل تصنیف ہے۔ جیسے فٹز جیرلڈ کا عمر خیام!

اور بہت سے التزامات کے علاوہ ایک یہ بھی ہے۔ کہ ہر روز سوالات (جو مستقل افسانے ہیں) پہلے سے زیادہ مشکل ہوتے جاتے ہیں۔ مگر رانی جواب باصواب دیتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ۔۔۔۔۔۔۔ مگر یہ کتاب کے چھپنے پر معلوم ہوگا۔ ہم خود بیتابی سے منتظر ہیں۔"

آج چھ سال کے بعد ہم ناگ رانی کی اوس کہانی کو سالنامہ میں دہراتے ہوئے دو نئی کہانیوں کا اضافہ کر رہے ہیں۔ تاکہ ناظرین اس دلچسپ سلسلہ سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں ناگ رانی چھ سال کے انتظار کے بعد اب زیور طبع سے آراستہ ہو کر ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچیگی۔ کارکنان ہاشمی بک ڈپو مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کہ انہوں نے علامہ تاثیر صاحب کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا ہے کہ وہ اس کتاب کو مکمل کر دیں۔

(ایڈیٹر)

بیان

سنہری کلسوں والے مندروں کے حسن و اسرار کے افسانے آخر مجھے بنارس لے گئے۔ وہاں میں مدتوں بھیس بدل بدل کر پھرتا رہا۔ اور اس شہر گردی میں ایک بوڑھے برہمن کو مجھ سے اُنس ہو گیا۔ برہمن کا نام بتلانے کا میں مجاز نہیں۔ کیونکہ یہ اس کے مرتے دم کی خواہش تھی۔ کہ یہ کتاب اُس کی یادگار رہے۔

بنارس دیکھنے کو تو بہت خوبصورت شہر ہے۔ مگر رہنے کو اس سے بُرا اور کوئی شہر نہ ہوگا۔ پوتر روحانی مقام مادی گندگی سے لتھڑے پڑے رہتے ہیں۔ اور ہر وبا کی پناہ ہیں۔ ان ہی دنوں پلیگ پھیل گئی۔ اور کئی سوختہ اختر سورج ڈوبنے کے بعد بھی مرگھٹ میں جلا دیئے گئے میرے بوڑھے ساتھی کا تمام خاندان موت کے اس طوفان میں بہہ گیا۔ اور ایک دن مجھے اُس کی طرف سے بھی سندیسہ آ گیا۔

بوڑھا برہمن ایک نیچی چھت والی کُٹیا کے گُریلے فرش پر لیٹا ہُوا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اور معذرت کے انداز میں بولا۔ "مجھے پلیگ نہیں۔ لیکن میری سانس کی گنتی ختم ہو چکی ہے۔ اور ایشور نے چاہا تو جنم

کا چکر بھی ختم ہو جائے گا۔ میں ایک چیز آپ کے سپرد کرنی چاہتا ہوں"۔
یہ کہہ کر اُس نے اپنے سرہانے سے ایک کرم خوردہ مسودہ نکالا "یہ کتاب انسانی یادداشت سے بھی پہلے سے ہمارے خاندان میں دست بدست چلی آتی ہے یہ تو اب میرا خونی رشتہ دار کوئی نہیں رہا۔ اب یہ آپ کی ملکیت ہے۔ اسے آپ لے لیں۔ نہیں تو یہ ایک باوفا عورت کی طرح میرے ساتھ ستی ہو جائے گی" یہ کہہ کر اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اور ہنستے ہوئے دانتوں میں سے آخری سانس نکل گئی۔ میں نے مسودے کو اُس کے بے جان ہاتھوں میں سے لے لیا اور اُس کے چہرہ پر اپنا رومال رکھ کر ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھتا ہوا سرنگون ہو کر دروازہ سے باہر روشنی میں نکل آیا۔

برہمن کی تعریفوں کے باوجود مجھے اس کتاب کی خوبی کے متعلق شک تھا۔ کیونکہ ایک ہندو اور برہمن مقدس زبان کی ہر کتاب سے عقیدت رکھتا تھا۔ جیسے مسلمان عربی سے! مگر جب میں نے اُس کی ورق گردانی کی اور مشکل مقامات کا ترجمہ ایک پنڈت سے سنا تو میں نے اپنے دوست کی یاد سے گڑگڑا کر معافی چاہی۔ واقعی اُس بوڑھے برہمن سے بڑھ کر حُسن کی، عورت کے حُسن کی دعاوت کے باکتاب کے حسن کی پرکھ اور کسی کو نہ تھی!

یہ کتاب ہندوستان کی مختصر سی "الف لیلہ" ہے۔ مگر اس کا ماحول بہت زیادہ دلفریب ہے۔ یہاں ویسی دہشتناک قتل اور بے اعتقادی کی داستان نہیں اور عورت سے نفرت اور محبت کے اتار چڑھاؤ کو لطیف تر پیرایہ میں بیان کیا ہے (تاثیر)

ابتدا ــــــــ عورت کی تخلیق

بڑی دیر کی بات ہے۔ کہ یہاں ہند میں ایک چکرورتی مہاراجہ تھا۔ چندر کانتی نامی۔[1] اُس کی فوج دلیری اور دانائی کی کمان میں ملک کے چاروں طرف پھیل گئی۔ اور پہلے دستے سمندر کی لہراتی ہوئی موجوں تک جا پہنچے۔ اس کا ذہن۔ علم و دانش کے ساتوں سمندر پار کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی چیز سے ناواقف تھا۔ تو وہ عورت اور اُس کی محبت تھی۔ یوں کہئے کہ وہ استری ویرکا اوتار تھا۔ خود حُسن کی مورت کہ جو عورت اس پر نگاہ ڈالے اُس کی تابش کی تاب نہ لا سکے۔ مگر دل برف کی طرح یخ کہ عورت کی گرم نگاہ سے بے خبر!

جوں جوں چاند کی عمر بڑھتی گئی۔ اس کے سرسپید وزیروں کی تشویش زیادہ ہوتی گئی۔ وہ اس اُدھیڑ بن میں تھے۔ مہاراجہ کا کوئی بیٹا نہیں اگر موت کا تیر نشانہ پر بیٹھ گیا۔ تو اس سلطنت کے پُرزے اُڑ جائیں گے۔ اس پھیلاؤ کو کون سمیٹے گا!

آخر اُنہوں نے سوچ سوچ کر ایک مشورے کی مجلس سجائی اور تمام ملک میں سے چُن چُن کر عورت کے روپ میں ڈھلی ہوئی دلفریبیاں جمع کریں۔ اور اس رنگ برنگ کی تاروں والے دام کو اپنے مہاراجہ کے راستے میں پھیلا دیا۔ مگر یہ سب کوشش بے سود تھی! عورت کی نظر کے تیر اُس کے دل میں یوں پھنس جاتے تھے۔ جیسے جنگل میں خزاں دیدہ پتے کسی مست ہاتھی کی لپیٹ پر سے۔

وزیر اس ناکامیابی پر بہت جھلائے۔ اور آپس میں گنگنانے لگے۔ نیکی کی بھی حد ہوتی ہے۔ ایک راجہ کو استریوں کے نیزوں کی بان سے اپنا دل بچانا چاہئے۔ مگر استری ویرین نہیں پاپ ہے۔ یہ راجہ ہے بیراگی نہیں۔ گرہستی کو برہم چریہ سے کیا کام!

اُنہوں نے پھر مشورہ کیا۔ اور سب کے سب راجہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور پردھان نے بڑھ کر کہا۔

مہاراج ادھیراج ہم آپ کے آگے شادی کی بنتی کرنے آئے ہیں۔ شری رام چندر جی نے سیتا جی کو شری کرشن بھگوان نے رکمنی جی کو بیاہا تو یہ کیا ضد ہے۔ کہ آپ سلطنت کے ورق ہوا میں بکھیرنا چاہتے ہیں؟
مگر مہاراجہ نے اُن کی بات پر دھیان نہ کیا۔ اور کہا تو یہ کہ اگر اُنہیں اپنے مہاراجہ کی زندگی میں کسی اور کو گدی پر بٹھانے کی فکر ہے۔ تو وہ ابھی سے راج پاٹ تیاگنے کو تیار ہے۔ یہ سُن کر سب وزیر واپس لوٹ آئے۔ اور ہار کر یہ دچار کیا۔ کہ ملک میں جاسوسوں کے ذریعہ خفیہ خفیہ یہ خبر پھیلا دی

---

[1] یہ چند سکانتی نام کی رعایت ہے۔

رباب کا ایک درد آمیز تار

کہ جو کوئی اس راج ہٹ کو مٹا دے گا۔ اُسے ایک کروڑ اشرفی انعام ملے گی۔
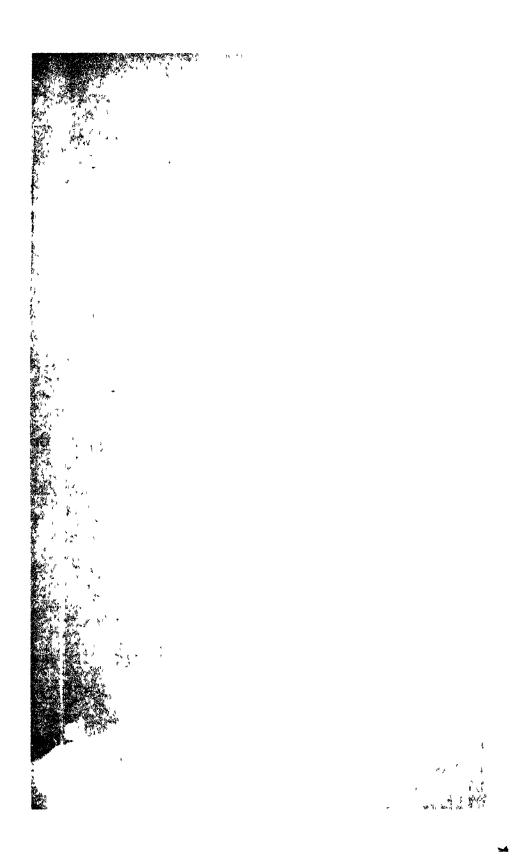
یہ سُن کر بڑے بڑے تانترک جوتشی جنتر منتر کرنے والے جمع ہوگئے۔ اور انہوں نے ہزاروں ہَوَن اور کیا کیا جتن نہ کئے۔ مگر راجہ کا عورتوں سے بیر بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ وہ ہر اُس استری کو جو اُس کی نظر کی حد میں آنے کی جرأت کرتی دیس نکالا دیدیتا۔ اور وزیروں نے اس خوف سے کہ کہیں تمام ملک عورتوں سے خالی نہ ہو جائے۔ راجہ کے ارد گرد جاسوس مقرر کر دیئے۔ جو اُس کے آگے آگے دوڑتے پھرتے اور عورتوں کو اُس کی راہ سے دھتکار دیتے۔ مگر یہ کام تلوار کی دھار پر ناچنے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ کیونکہ عورتیں جن کی فطرت دریا کے بہاؤ کے اُلٹ چلنا ہے۔ اس نفرت سے اُس کی طرف اور پروانہ وار کھنچیں۔ بھونرے کو پھول سے۔ چکور کو چاند سے روکنا سہل نہیں۔

ایک دن وہاں دار السلطنت میں ایک مصور آ نکلا۔ اُس نے شہر میں پہنچتے ہی ادھر اُدھر سے پوچھنا شروع کر دیا۔ کہ یہاں کیا کیا عجائبات ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ سب سے بڑا عجوبہ اُن کا مہاراجہ ہے کہ ہر چند وہ گدی کا مالک ہے۔ مگر عورتوں کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا اور اُن سے اس طرح دور رہتا ہے۔ جیسے طاؤس سے ناگ! اور وہ خود حُسن کے دیوتا کا اوتار ہے!

عجیب بات یہ ہے۔ کہ وہ جیسے کام دیوتا نے اپنے نیزوں کی انی اپنے تیروں کا پیکان بنایا کہ عورت کے سینے کو چھلنی چھلنی کر دے۔ اپنی طاقت آزمانے کا تمنائی نہیں!

کیا سورج کو گرمانے سے ہوا کو لہرانے سے انکار کر دینا چاہیئے؟

مصور یہ گفتگو بڑے شانت بھاؤ سے سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ اور آخیر میں کھل کھلا کر ہنس دیا۔ اور کہنے لگا۔ تمہارے راجہ کا دل لوہے کا ہے؟ میرے پاس مقناطیس ہے۔ اُس کا یہ دعوے وزیروں کے کسی جاسوس کے کان میں جا پڑا۔ اور وہ بھاگا بھاگم ان کے پاس گیا اور انہیں اس بڑے بول سے آگاہ کیا۔ انہوں نے فوراً مصور کو اپنے پاس بُلا بھیجا۔ اور اُس سے سوال جواب کئے۔ اور اُسے تمام حالات بتلائے اور انعام دینے کا وعدہ کیا۔ مصور نے کہا:۔

تم مجھے اپنے مہاراج کے آگے کسی نہ کسی طرح پیش کر دو۔ پھر میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔

پردھان راجہ کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ اور عرض کی کہ مہاراج اِس بستی میں ایک چتر ودیا (علم مصوری) کا ایسا ماہر مصور آیا ہوا ہے۔ کہ اُس کی مثال ملنی محال ہے۔ راجہ یہ سُن کر بہت مسرور ہوا۔ کیونکہ وہ خود اس فن کا اور دیگر جملہ فنون کا ماہر تھا۔ اور حکم دیا کہ مصور کو پیش کیا جائے۔

مصور جب روبرو ہوا۔ تو راجہ کا حُسن دیکھ انگشت بدنداں ہوگیا۔ اور کہنے لگا:۔

مہاراج آج میرا جیون سپھل ہوگیا۔ کہ آپ کے بے نظیر حُسن کا درشن نصیب ہوا۔ میں اپنے فن کا صلہ بھر پاؤں۔ اگر مجھ پر یہ دیا ہو کہ میں آپ کی تصویر کھینچ لوں۔ تاکہ عمر بھر اسے تکتا رہوں۔ کیونکہ سورج کی گرمی بیکار شیشے کے عکس سے بھی پہنچتی رہتی ہے۔ راجہ نے کہا کہ پہلے مجھے اپنے کام کے نمونے دکھاؤ۔ مگر خبردار عورت کی کوئی تصویر میری نظر نہ پڑے ورنہ مجھ سے بُرا اور کوئی نہ ہوگا۔ چنانچہ مصور نے اُس کے سامنے مختلف ممالک کے مرقعے اور مناظر پیش کئے اور ان میں چھپا کر ایک عورت کی تصویر بھی رکھ دی! مہاراجہ ورق اُلٹ پلٹ رہا تھا کہ ناگاہ اُس کی آنکھ اُس شبیہ پر پڑ گئی۔ اور جونہی اُس کی نگاہ پڑی وہ اُسے تکتے کا تکتا ہی رہ گیا۔ اور اُس کے ناطاقت ہاتھوں سے تصویر چھوٹ گئی۔ اور اُس پر ایک سکتے کا بیہوشی کا عالم چھا گیا۔

مصور نے کامرانی کا قہقہہ لگایا۔ اور وزیروں سے کہنے لگا:۔

لو اب راج ہٹ ٹل گئی۔ لاؤ وہ انعام دلاؤ۔ مگر وہ کہنے لگے کہ پہلے ہمیں اس کا یقین ہونے دو۔ مصور نے کہا:۔

اچھا یونہی سہی۔ جاؤ پہلے مہاراج کو ہوش میں لاؤ۔ اور پھر سنو کہ وہ ہوش میں آتے ہی میرے موجود نہ ہونے پر کیا کہتے ہیں۔ میں ساتھ کے کمرے میں ٹھہرتا ہوں۔

؎ یہ بھی چندرکانی نام کی رعایت ہے۔

وزیروں نے فوراً چاکروں کو بلایا۔ اور راجہ کو مور کے پروں کا پنکھا جھلایا گیا۔ اور اُس پر گلاب کا عرق چھڑکا گیا۔ اور اُس کے سر میں اور پاؤں میں صندل کا تیل ملا گیا۔ راجہ ہوش میں آتے ہی پکارنے لگا۔

مصور کہاں ہے۔ وہ مصور کہاں ہے؟

وزیروں نے کہا:۔ مہاراج وہ چلا گیا ہے۔ راجہ نے جونہی یہ سنا اُس کے چہرے کا رنگ دھنک کے رنگوں کی طرح بدلنے لگا۔ اور اُس کی آواز بربط کی تاروں کی طرح کانپنے لگی۔ اور اُس نے چلا کر کہا:۔

سنو اگر تم نے اس کو ابھی ابھی یہاں حاضر نہ کیا تو میں تمہیں اور تمہارے تمام کنبے کو کولھو میں پسوا دوں گا۔ وزیر بھاگے بھاگے گئے۔ اور مصور کو مہاراج کے آگے لے آئے اور وہ اُس کے قدموں پہ جا گرا اور التجا کرنے لگا۔ مہاراج میری خطا معاف کر دیجئے۔ مجھ سے بڑا دشٹ کارن ہُوا۔ میرے کرموں کا لکھا میرے پیش آیا کہ عورت کی شبیہ مناظر کی تصویر میں مل جل گئی۔ لیکن مہاراجہ کہنے لگا:۔

او مصوروں کے بادشاہ! تو نے مجھ پر بڑی دیا کی۔ کہ مجھے یہ تصویر دکھائی۔ تو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ گویا اندھے کو سورج کی روشنی دکھلائی۔ اب یہ بتا کہ یہ کس کی شبیہ ہے۔ کیونکہ فانی انسان کا ذہن تو ایسا لازوال حُسن پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ تو اُس سب کے بنانے والے کی اپنی کاریگری ہے۔ مصور یہ سُن کر مُسکرایا اور کہنے لگا:۔

مہاراج میری نصیحت مانئے اور اس عورت کا خیال دل سے نکال دیجئے۔ مجھے ڈر ہے۔ کہ کہیں میری غفلت آپ کی تباہی کا سبب نہ بنے۔ راجہ بے قرار ہو کر بولا:۔

مصور بس یہ دفترِ ٹے کر دے۔ تیرے سامنے دو راستے ہیں۔ ان میں سے ایک چن لے۔ یا تو مجھے اس کا نام پتہ بتا دے اور میں تمہیں زر و جواہر سے لاد دوں گا یا چُپ رہو۔ اور میں تجھے لوہے کی بھاری بھاری زنجیروں سے لاد دونگا۔ اور تجھے بھیانک تہ خانوں میں بے آب و دانہ پھینکوا دونگا کہ تیری ہاں اور بھوک پیاس سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تیرے پنجر کے ذرّہ ذرّہ کو کھولے۔ اس پر مصور بولا:۔ اچھا مہاراج اب چونکہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں اور آپ کے سیکھ ہی ہیں تو سن لیجئے۔ یہ شبیہ ناگوں کے بادشاہ وانگ راج کی اکلوتی بیٹی کی ہے۔ جسے سب ناگ رانی کہتے ہیں۔ وہ یہاں سے دو مہینوں کی مسافت پر جنگل میں اپنے محل کی ایکانت میں رہتی ہے۔ اس کی شکل و شباہت؟ اُس کا تجربہ آپ کو اس تصویر سے ہو چکا ہے۔ اور یہ تصویر اُس کی عالم افروز چمک کا ایک دُھندلا سا نقش بھی نہیں۔ کئی وصل کے آرزومند اُس کی صورت دیکھ کر موت سے واصل ہو گئے! مگر بنانے والے نے جب اسے یاقوت کی ڈبیا سا من موہنا بنایا تو اُس کے اندر ایسا پتھر کا دل رکھ دیا کہ کام دیوتا کے تیر اس پر پھول بن بن کر برستے ہیں۔ ملک کے کونے کونے سے ہزاروں دیکھنے والے آتے ہیں۔ اور شادی کا سندیسہ پہنچاتے ہیں۔ اور وہ سب پر ایک جیسی حقارت کی نظر ڈالتی ہے۔ مگر سب کی آؤ بھگت بڑے پریم سے کرتی ہے۔ اور اکیس دن تک اس شرط پر مہمان رکھتی ہے کہ ہر روز اُس سے ایک بجھارت ایک سوال کا جواب لیا جاوے۔ اور اگر کوئی اُمیدوار اُس سے ایسا پرشن کرنے میں کامیاب ہو جائے جس کا اُتر اُس کے پاس نہ ہو۔ تو اس کا انعام وہ خود ہوگی۔ اور اگر اس میعاد میں وہ ایسا لاجواب سوال نہ پوچھ سکے۔ تو پھر وہ اُس کا غلام ہو جاتا ہے۔ اور وہ جو چاہے اُس سے سلوک کرے۔ آج تک کسی کو اس پر کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اُس کی عقل اُس کے حسن سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے اور اُن اَن گنت ناکام طلبگاروں میں سے کچھ تو اُس نے دوسرے ملکوں میں غلام بنا کر بھیج دیئے ہیں۔ اور کچھ اپنے نوکر چاکر بنا لئے ہیں۔ اور وہ ہر روز اُس کے حسن کے سمندر کو موجزن ہوتے دیکھتے ہیں۔ اور اس بڑھتے ہوئے طوفان کے آگے بے دست و پا اور تشنہ لب کھڑے رہتے ہیں۔ مہاراج میں آپ سے بنتی کرتا ہوں۔ کہ آپ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت کے گڑھے میں مت پھینکیں۔ ابھی کچھ نہیں گیا۔ وقت ہے کہ آپ اس خیال کو بھلا دیں کیونکہ اُس سے زیادہ بدحال اور کون ہوگا۔ جسے معلوم ہو جائے۔ کہ اُس کی قسمت میں ہمیشہ ہمیشہ کی نامرادی ہے۔ جو اپنی مراد کو ہر وقت سامنے دیکھے۔ اور اُس تک پہنچنے کی امید تک نہ رکھتا ہو۔

مہاراجہ چکرورتی چندر کانتی نے قہقہہ لگایا اور کہا:۔

او بھولے مصور تیری رائے تیرے فن کی مہارت سے بہت پست ہے کیونکہ اس سے بھی زیادہ بد حال وہ شخص ہے۔ جو تمام عمر اسی افسوس میں گذار دے۔ کہ اگر وہ ہمت کرتا تو شاید اپنی مراد کو پا لیتا۔ بہتر ہے کہ میں اپنی زندگی اس سراب کو دیکھنے میں گزار دوں۔ اور بے ہمت بن کر کوشش نہ چھوڑ دوں۔ پھر راجہ نے اس سے وہ شبیہ لے کر اپنے پاس رکھ لی۔ اور اُسے تین کروڑ اشرفی انعام دی۔ اور اسے اپنی شبیہ کھینچنے کی اجازت بھی مرحمت فرما دی۔ وزیروں نے بھی اسے ایک کروڑ اشرفی انعام دی۔ کیونکہ اُنہوں نے یہ سوچا کہ اگر ہمارا خدا اپنی کوشش میں ناکام رہا تو سلطنت ضرور برباد ہو جائے گی۔ مگر یہ انجام تو اس طرح بھی ہونا ہی ہے۔ اس لئے بہتر ہے۔ کہ جو بُرائی کم نقصان دینے والی ہے اُسے چنا جائے۔

غرض راجہ کے سفر کا سب سامان تیار ہو گیا۔ اور اُس نے یہ وقت نہایت بے چینی سے کاٹا۔ سلطنت کا سب انتظام وزیروں کو سپرد کر کے اور اپنی محبوبہ کی شبیہ ساتھ لے کر وہ تن تنہا قسمت سے ہار جیت کا پانسہ پھینکنے کو نکلا ہی تھا۔ کہ اُس کا پُرانا رفیق بھاگیرت راستہ گھیر کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا:۔

کیا آپ اکیلے ہی جائیں گے؟ راجہ نے کہا:۔

اے منتر میرا اکیلا جانا ہی مناسب ہے۔ موت کے منہ میں دوسروں کو دھکیلنا کہاں کی دانشمندی ہے؟

بھاگیرت نے کہا:۔

اے راجہ تو کن خیالوں میں ہے۔ اگر تو مجھے چھوڑ گیا۔ تو گویا اپنے آپ کو پیچھے چھوڑ گیا۔ تو اور میں ایک قالب اور ایک جان تھے تیرے اور میرے خیالات اور کام ایک جیسے تھے۔ مگر اے راجہ اب تیرے دل اور جان پر کسی اور کا قبضہ ہے۔ تو صرف جسم ہی جسم رہ گیا۔ تیری روح تیرا ذہن تیری عقل اب میں ہی ہو سکتا تھا۔ اور مجھے تو پیچھے چھوڑ چلا ہے۔ اے راجہ اور اے مربی تو نے ابھی سے سوچ کو تیاگ دیا۔ اور یہ نہ دیکھا کہ تو نے وہاں جا کر عقل کا مقابلہ کرنا ہے۔ اگر تیرا ابھی سے یہ حال ہے۔ تو اُس کو دیکھ کر تجھ میں اکیس دن تک عقل آزمائی کی سکت کیسے رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سب پر غالب آ جاتی ہے۔ راجہ نے جب یہ تقریر سنی تو اُس نے اپنے رفیق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور کہا:۔

بھاگیرت تو نے جو کچھ کہا سچ کہا۔ لیکن اگر میں ناکام رہا تو تیرا کیسا حال ہو گا۔ بھاگیرت نے کہا:۔

راجہ ناکامی میں بھی دوست کا شریک ہونا بہتر ہوتا ہے اگر خوشی دوست کے بغیر دوبھر ہوتی ہے تو ناخوشی کا کیا پوچھنا۔

غرض دونوں دوست اکٹھے شہر چھوڑ کر جنگل کی طرف چل دیئے۔ جو درخت لنگوروں اور بھیلوں سے اس طرح بھرا ہوا تھا۔ جیسے سمندر جواہرات سے۔

لیکن راجہ پریم کی دھن میں مست نہ کچھ کھاتا اور نہ پیتا تھا۔ راجکماری کی تصویر سے دل بہلاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ اس کی جسم کی حفاظت بھاگیرت ہی کر رہا تھا۔ ایک دن جب وہ دوپہر کے وقت برگد کے پھیلے ہوئے سایہ میں ستا رہے تھے۔ راجہ اپنی محبوبہ کی تصویر کو دیر تک تکتا رہا۔ اور یکایک خاموشی کو یوں توڑا:۔

اے بھاگیرت یہ عورت ذات ہے۔ اور میں اسی ایک وستو سے نا آشنا ہوں۔ کیا تو بتا سکتا ہے کہ عورت کی فطرت کیا ہے؟

بھاگیرت مسکرایا اور کہنے لگا:۔

چندر کانتی جی یہ شہزادی کے لئے رکھ چھوڑیئے۔ کیونکہ یہ بڑا ہی ٹیڑھا سوال ہے۔ عورت عجیب الخلقت چیز ہے۔ سنئے اس کی بابت ایک کہانی سناتا ہوں:۔

ابتدا میں جب پرماتما نے عورت کے بنانے کا حکم دیا تو اُسے معلوم ہوا کہ تمام مسالا آدمی کے بنانے میں ختم ہو چکا ہے۔ اور کوئی ٹھوس مادہ باقی نہیں رہا۔ اس گومگو کے عالم میں اسے یہ ترکیب سوجھی۔ اُس نے چندر ما کی گولائی لی۔ عشق پیچاں کی جھپٹ شاخوں کی تو سیں۔ سبزے کے لہلہاہٹ۔ بادوں کی نزاکت۔ پھولوں کی رنگت۔ گنیش کی سونڈ کا چھیلا پن۔ ہرن کی نظر۔ بکھریوں کی تازگی۔ کرنوں کی شادمانی۔ بادلوں کی گریہ وزاری۔ ہواؤں کی بے ثباتی۔ خرگوش کی جھجک۔ طاؤس

کی ماں۔ طوطے کی سینے کی نرمی ہیرے کی کاٹ۔ شہد کی مٹھاس۔ چیتے کی بے رحمی۔ پرکاش کی گرمی۔ برف کی سردی۔ بلبلوں کے چہچہے۔ کوئل کے نغمے۔ بگلے کی بھگتی اور چکور کی وفا۔

ان سب کو لے کر اور باہم خوب ملا کر عورت بنادی۔ اور اُسے آدمی کے حوالے کردیا۔ مگر ایک ہی ہفتہ کے بعد آدمی لوٹ آیا اور کہنے لگا۔

ہے ایشور دیا دیو لو۔ یہ چیز جو تو نے مجھے دی ہے۔ اس نے مجھ پر زندگی ناگوار کردی ہے۔ یہ ہر وقت چڑ چڑ کرتی رہتی ہے مجھے تنگ کرتی رہتی ہے۔ پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہے۔ کبھی تنہا نہیں ہونے دیتی۔ مجھے ہر وقت اُسکی نگہداشت کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ کبھی ہنسنے لگتی ہے۔ کبھی مُنہ بسورنے لگتی ہے۔ اور تمام دن بیکار بیٹھی رہتی ہے۔ میں امانت واپس کرنے آیا ہوں میری اس سے گزر نہیں ہو سکتی۔

پرماتما نے "بہت اچھا" کہہ کر عورت کو واپس لے لیا۔ ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ آدمی پھر واپس آیا۔ اور کہنے لگا:۔

ہے ایشور مجھے لوٹنے پر معلوم ہوا کہ میری زندگی بہت اکارت جاری ہے میں اُداس رہنے لگا ہوں۔ اور مجھے رہ رہ کر وہی تیری دین یاد آتی ہے۔ وہ اس کا ناچنا پھرنا۔ نگہبازیاں کرنا۔ کھیلنا۔ چیٹ جانا۔ مجھ سے ڈرنا۔ اور میری ہی پناہ لینا۔ من کر بگڑنا اور بگڑ کر من جانا آنکھوں آگے پھرنے لگتا ہے۔ اُس کی ہنسی ایک گیت تھی۔ اُس کا بدن ملائم تھا۔ اور اُس کی سُندر صورت من موہنی تھی۔ مجھے پھر واپس دیدے"

پرماتما نے کہا بہت اچھا"

اور عورت پھر آدمی کے حوالے کردی۔ تیسرے ہی دن وہ پھر لوٹ آیا۔ اور کہنے لگا۔ ہے ایشور نہ جانے کیا بات ہے۔ مگر یہ آخری نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس سے راحت کم اور مصیبت زیادہ ہے۔ اسے واپس لے لیں؟

پرماتما کی آواز میدان میں گونج اُٹھی۔

"اسے فش جا۔ اب اس کا انتظام خود کر۔" آدمی بولا:۔

مگر میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔" پرماتما نے کہا "اور تو اس کے بغیر بھی نہیں رہ سکتا؟"

اور یہ کہہ کر اُس نے آدمی سے اپنا مُنہ موڑ لیا۔ اور کسی اور پرتھوی کے رچنے میں مصروف ہوگیا۔ آدمی گردن جھکائے سوچ رہا تھا۔ "کیا کروں۔ اور کیا نہ کروں میں نہ اُس کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ اور نہ اُس کے بغیر!"

بھاگیرت خاموش ہوگیا۔ اور راجہ کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن راجہ چپ چاپ ٹکٹکی جمائے ہوئے شہزادی کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ اور اس طرح وہ ہر روز پڑاؤ کرتے ہوئے جنگل میں سے گزرتے ہوئے ناگ رانی کے محل کے قریب آپہنچے۔

پہلا دن

جب صبح سویرے محل کی سنہری کلس درختوں کے جھنڈ میں سے سورج کی کرنوں سے جگمگاتے ہوئے نمودار ہوئے۔ مہاراجہ چندر کانتی یکایک پکار اُٹھا "میں برباد ہوگیا!"

بھاگیرت نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

راجہ نے کہا: "افسوس میں تمام راہ دن رات سوتے جاگتے اپنی محبوبہ کی مورت ہی تکتا رہا ہوں۔ اور مجھے اور کسی چیز کا دھیان نہیں رہا۔ ہم سفر کی انتہا تک تو پہنچ گئے مگر ہماری مصیبتوں کی ابتدا ابھی ہونے والی ہے۔ راجکماری سے کیا سوال کروں گا؟ میرے دل میں اُس کا جھلکتا ہوا سا خیال بھی نہیں ہے اور اگر اس کے تصور ہی نے مجھے ایسا موہ لیا ہے۔ تو کیا جانے اس کی مرگ لوچن نین کو دیکھ کر مجھ پر کیا حالت طاری ہو۔ میرے ہوش و حواس ابھی سے گم ہو رہے ہیں۔ ایسی دن کی کھینچا تانی کی مجھ میں سکت کہاں سے آئے گی؟"

بھاگیرت بولا "مہاراج! اسی کے توڑ کے لئے تو میں آپ کے ہمراہ ہوں۔ جب ہم راجکماری کے سامنے پیش ہوں۔ تو آپ کہہ دیں کہ آپ میرے مُنہ سے گفتگو کریں گے میں سب کچھ دیکھ لوں گا۔"

راجہ کو اس سے اطمینان ہوا اور وہ پھر دین و دنیا سے بے خبر ہو کر اپنی محبوبہ کے دھیان میں مگن ہوگیا۔

آخر کار دونوں محل کی حدود میں داخل ہوگئے۔ اور اُن کے استقبال کے لئے سنہری وردیوں والے چوبدار آگے بڑھے۔ راجکماری کو خبر کردی گئی۔ کہ مہاراجہ چندر کانتی اپنی قسمت آزمانے آئے ہیں۔ اُس نے اپنے

خاص خادم جن کے مُنہ سرسوں سے بھی زیادہ زرد اور جن کی آنکھیں ناگوں سے بھی زیادہ سُرخ تھیں بھجوا دیئے۔ جو ان دونوں کو سنگِ مرمر کے مہمان خانے میں لے گئے۔ جس کے چاروں طرف ایک دلکشا باغ تھا۔ جو ٹھہرے ہوئے پانی والی جھیل اور بلوری غسل خانوں اور سایہ دار درختوں سے مزین تھا۔ جہاں ہوائیں رنگ برنگ پھولوں کی مہک سے گراں بار تھیں۔ اور شاخیں ان گنت پرندوں کے چہچہے سے لرزہ براندام تھیں۔ انہوں نے تمام دن وہیں گذارا۔ مگر راجہ ناگ رانی کے دیدار کی تمنا میں ایسا بیکل ہو رہا تھا۔ کہ اُس کی شبیہ کے سوا اُسے اور کچھ نہ سوجھتا تھا۔

جب دھوپ ڈھل گئی۔ مہاراجہ چندر کانتی اور بھاگیرت دربار میں طلب کیے گئے۔ دونوں عام ایوان میں سے گذر کر خاص بارگاہ میں پہنچے۔ جہاں فرش سیاہ مست نیلاہٹ والے بلوروں کے ٹکڑوں سے آراستہ تھا۔ اور دیواریں جواہرات سے جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ چھت سے فانوس لٹک رہے تھے۔ اور اُس کی جھلملاتی ہوئی روشنی تمام منظر کو دھنک کے رنگوں میں رنگ رہی تھی اس نور اور سایہ کے تلاطم میں نظر بے کار تھی۔ جب چندر کانتی اور بھاگیرت کی چندھیائی ہوئی آنکھوں کو قرار آیا۔ اُنہیں سامنے ایک سنہری تخت پر ناگ رانی جلوہ افروز دکھائی دی۔ اُس نے کائی کا سا سبز لباس پہنا ہوا تھا۔ اور مونگوں سے جڑی ہوئی ساری جیسے لکشمی سمندر سے ابھی ابھی باہر نکل رہی ہو۔ مدھ بھری آنکھیں شہد کی رانیوں کی ایک قطار تھیں اور لانبی لانبی مژگاں ان پر مدہوش ہو ہو کر گری پڑتی تھیں۔ ہونٹ پردے میں لرزنے والی گلاب کی پنکھڑیاں تھے۔ اور اُبھرے ہوئے سینے سے صندل کی مہک آ رہی تھی۔ نازک کمر کے اردگرد ایک جڑاؤ کمربند تھا۔ اور پاؤں حنا سے رنگے ہوئے تھے۔ رات کی طرح تاریک بالوں میں ایک سونے کی پٹی تھی جس کی شکل سانپ کی طرح تھی۔ آنکھیں لعلوں کی اور زبان زمردی:۔

حسن کی اس تابش میں ناگ رانی نے راجہ پر ایک حقارت کی نظر ڈالی اور مُنہ موڑ کر کہا "کہئے کیا پوچھتے ہو؟"

لیکن راجہ کو اُس کے دل پر مبہوت کر دینے والا حسن بجلیاں گرا رہا تھا۔ سامنے سنہاسن پر کانپتا ہوا گر پڑا اور اُسے یُوں تکنے لگا۔ جیسے کبوتر سانپ کو!"

بھاگیرت جُھک کر آداب بجالایا۔ اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"سرکار۔ مہاراج کی زبان یہ داس ہے۔ حکم ہو تو کچھ کہے" راج کماری نے کہا "کہو" بھاگیرت پھر آداب بجالایا۔ اور کہنے لگا۔

"سرکار مدت کی بات ہے۔ ایک ملک میں ایک ناستک رہتا تھا۔" اُس کی شادی ہونے والی تھی۔ اور وہ طیاریوں میں معروف تھا۔ اُس کا ایک دوست اُس کے پاس آیا۔ اور اُسے یہ صلاح دی کہ وہ گنیش مہاراج کے مندر پر چڑھاوا چڑھائے۔ تاکہ شادی بخیر سرانجام ہو۔ وہ ناستک کھل کھلا کر ہنسا اور دیوتاؤں کا مذاق اُڑانے لگا۔ یوں کہتا تھا۔

"واہ گنیش کی بھی ایک ہی کہی۔ اے میاں سوچ کیا آدمی کی بھی سونڈ ہوتی ہے۔ اور اُسے میری شادی سے کیا مطلب؟ جو کام بھی سوچ سمجھ کر کیا جائے بخیری سرانجام ہوتا ہے! چھوڑو ان وہموں کو۔ میں نے وید بھی پڑھے ہیں۔ پیٹ کے پجاریوں کے ڈھکوسلے ہیں ڈھکوسلے!"

غرض وہ یوں ہی باتیں بناتا گیا۔ اور اس کی بھنک گنیش جی کو بھی پڑ گئی وہ آپ ہی آپ سونڈ ہلا کر ہنستے رہے۔ اور ناستک شادی کی تیاریاں کرتا رہا۔ جب سب کچھ تیار ہو گیا۔ اور بیاہ کی تاریخ آ گئی۔ گنیش جی نے صبح صبح ایک گئو کو جو بازاروں میں پھرا کرتی تھی۔ کہہ دیا کہ وہ اپنا پوتر گوبر ناستک کی دہلیز پر پھینک آوے۔ گئو نے ایسا ہی کیا۔ اور جب ناستک نے دروازے سے باہر پاؤں نکالا۔ وہ گوبر پر سے پھسل پڑا اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اور ابھی وہ بستر سے نہ اُٹھا تھا کہ اُس کی منگیتر مر گئی۔ اُس کا دوست پھر اُس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"دیکھا گنیش جی سے بغاوت کا نتیجہ!"

لیکن ناستک بولا "جاؤ ہوش کے ناخن لو۔ یہ کسے معلوم تھا۔ ایک منحوس گائے میری دہلیز پر گوبر پھینک جائے گی اور گنیش کا اس سے کیا تعلق ہے۔ کیا دنیا بھر کے گئوؤں کے گوبر کا انتظام اسی کے سپرد ہے۔ اور وہ دیکھتا پھرتا ہے۔ کہ کون گائے گوبر ڈالتی ہے؟"

"واہ کیا پوتر خیال ہے۔!"

جب اُس کی ٹانگ درست ہوگئی اُس نے ایک اور جگہ شادی کا سندیسہ بھیجا اور تیاریاں کرنے لگا۔ اور ایک دستہ مہتروں کا نوکر رکھ لیا۔ جب کبھی وہ باہر نکلتا وہ آگے آگے صفائی کرتے جاتے۔ جب بیاہ کا دن آگیا۔ گنیش جی مہاراج نے ایک کوّے کو بُلایا۔ جو اُن کے مندر سے ہر روز پرشاد اُٹھا تا تھا۔ اور یہ کہا۔

کوّے آج ایک ناستک کا بیاہ ہے اور جس راستے سے اُس نے گزرنا ہے وہاں ایک محراب ہے۔ جس پر ہماری ایک پتھر کی بہت پرانی مورت ہے۔ جسے بارش اور دھوپ نے اپنی جگہ سے اُکھاڑ دیا اور وہ بالکل گرنے کے کنارے پہنچی ہوئی ہے۔ تم دھیان رکھو۔ جب ناستک نیچے سے گزرے تم ہمارے اوپر بیٹھ جانا۔ ہم اُس پر جا گریں گے۔ کوّے نے ایسا ہی کیا۔ اور ناستک کا کندھا ٹوٹ گیا۔ اور بستر سے اُٹھنے سے پہلے اُس کی دلہن مرگئی۔

اُس کا دوست پھر اُس کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔

"اب تو کوئی شک نہیں رہا کہ تمہاری تجویزوں کا گنیش جی ہی ستیاناس کر رہے ہیں"۔

ناستک کو بڑا طیش آیا۔ اور کہنے لگا "تمہارا گنیش ناک رگڑ رگڑ کر سونڈ توڑے۔ مگر میں شادی کر کے رہوں گا۔ یہ شہر ہی ایسا ہے۔ جہاں گائیں گوبر کرتی پھرتی ہیں۔ اور مکان گر گر پڑتے ہیں۔ اب کے میں پورا انتظام کرونگا"

تندرست ہو کر ناستک نے ایک اور دلہن چن لی۔ اور پھر تیاریاں کرنے لگا۔ اور دلہن کے گھر ایک دور کے راستے سے چکر کاٹ کر کھیتوں میں سے ہوتا ہوا چلا۔ لیکن گنیش مہاراج نے اس کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا۔ انہوں نے اندر دیوتا سے کہہ رکھا تھا کہ جب ناستک ایک خشک نالے سے گذرے۔ بادل چاروں طرف سے آ کر اُسے پانی سے بھرپور کر دیں۔ اندر دیوتا نے ایسا ہی کیا۔ اور جب ناستک گزرنے لگا نالہ یکا یک امڈ آیا۔ اور اُسے دھارے میں بہا کر لے گیا۔

گنیش جی اس کی تباہی دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے۔ اور پھر یکا یک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

اے راج کماری اُس کا اُتر دیجئے کہ وہ مسکرائے کیوں اور پھر رونے کیوں لگے؟

بھاگیرت یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ ناگ رانی بولی۔

"وہ مسکرائے تو اُس کی نادانی اور غرور پر لیکن جب انہیں اس خوفناک سزا کا خیال آیا جو اس نادان ناستک کے لئے اگلی زندگیوں اور اگلی دنیاؤں میں تیار ہے۔ تو ان کا دل رحم سے چھلکنے لگا اور وہ رونے لگے"۔

راج کماری یہ کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور راجہ پر نگاہ ڈالے بغیر یوں ہی ہاتھ کے اشارے سے محفل برخواست کر کے چلدی اور راجہ کا دل بھی ساتھ ہی سینہ سے باہر نکل گیا۔

راجہ نے بھاگیرت سے کہا۔ اے متر راجکماری نے تیرے سوال کا جواب دے دیا اور میرا ایک دن یوں ہی برباد ہوگیا۔ مگر مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں میں تمہیں معاف کرتا ہوں اس ادا کے صدقے جس ادا سے اس نے جاتے ہوئے اپنے نازک ہاتھ کو لچکا دیا۔ یوں تھا۔ جیسے پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی پُروے میں جھوم رہی ہو۔ یہ تصویر نہ ہوتی تو کل تک انتظار نہ ہو سکتا۔ اب میں اسی کو دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں۔ راجہ نے رات اسی مستی[1] میں گذار دی

راج کماری کے روپ میں چور ہو کر تصویر کو گھور گھور کر کہنے لگا۔ یہ مصوّر کتنا کاریگر استاد تھا۔ یہ تصویر نہیں آئینہ ہے۔ لبوں پر وہی ہلکی سی حقارت دبی ہوئی شرارت ہے۔ اور بدن کے روئیں روئیں سے ایک ہی بات پھوٹ رہی ہے۔ ایک منہ سے نہیں بول سکتی اور سب بات وہی جیتی جاگتی مورت کی سی ہے۔

آخر سورج نکلا۔ راجہ بستر سے اٹھا اور بھاگیرت کے ساتھ باغ میں گھومنے لگا یوں تڑپ کر جدائی کی گھڑیاں کاٹنے لگا۔"

بھاگیرت نے کہا "میں نے دھرم دیا کا سوال اس لئے کیا تھا کہ حسن والے ان باتوں سے کورے ہوتے ہیں"

راجہ بولا "بھاگیرت یہی تو مشکل ہے کہ یہاں حسن اور عقل' دین و دنیا' سب کا سماں ندھ ہے۔ شام کے وقت دونوں دربار میں حاضر ہوئے۔

---

[1] جسطرح ہر روز راجکماری کے لباس کا رنگ بدلتا رہتا ہے راجہ کی حالت بھی بدلتی رہتی ہے

وہاں راج کماری لال لباس پہنے ہوئے تھی۔ اور سر سے پاؤں تک لعل و جواہر جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ راجہ نے تاج اور تخت۔ لباس اور جواہر کو تو کیا دیکھنا تھا۔ اُس کی نگاہ راج کماری کی مدھ بھری آنکھوں میں الجھ کر رہ گئی۔ اور وہ نشیلا سا بے سکت سا ہو کر ایک کونہ میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ مگر بھاگیرت لپک کر آگے بڑھا۔ اور کہنے لگا:۔

اے راجکماری! دیر ہوئی راجہ دھرم آسنا کے دیس میں ایک بوڑھا برہمن رہتا تھا جس کے تین بیٹے تھے لے دے کر اس کا سارا دھن اُنیس گائیں تھیں اور بس۔ جب وہ مرنے لگا تو اُس نے اپنے بیٹوں کو اپنے پاس بلا کر یہ کہا۔

میں اب موت کے مُنہ میں جا چکا ہوں۔ اس لئے میں جو کچھ کہنے والا ہوں اسے غور سے سُنو۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لئے صرف یہ گائیں ہی ہیں۔ تم یہ آپس میں بانٹ لینا۔ بڑے کے لئے آدھی منجھلے کے لئے چوتھائی اور چھوٹے کے لئے پانچواں حصہ اگر کوئی گائے بچ جائے۔ تو سب مل کر اسے کھا لینا یہ نہیں تو پھر ساری گائیں راجہ کے گئو شالہ میں داخل کر دی جائیں۔ یہ میرے مرتے دم کی اچھیا ہے۔ دیکھنا نافرمانی نہ کرنا۔ ورنہ اس چکر سے کبھی چھٹکارا نہ ہو گا۔"

بوڑھا باپ یہ کہہ کر مر گیا۔ بیٹوں نے جب سب رسمیں ادا کیں تو اکٹھے ہو کر جائداد بانٹنے لگے۔ بڑے نے کہا آدھی میری ہیں انیس کل ہوئیں۔ تو میرا حصہ ساڑھے نو گائیں ہوا۔ منجھلے نے کہا۔ چوتھائی چار گائیں اور تین چوتھائی (¾) بنتی ہیں۔ چھوٹا بولا۔ مجھے پانچواں حصہ تین گائیں ایک اور ایک گائے کا چار بٹہ پانچ ملنا چاہیئے۔

بڑا سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ دیر کے بعد سر اُٹھا کر کہنے لگا یہ حصے سب ٹھیک ہوئے۔ مگر ان سب کو جھوڑ دو۔ تو اٹھارہ گائیں اور ایک گائے کا کچھ حصہ بنتا ہے۔ انیس پوری نہیں ہوتیں۔ اس صورت میں ہمیں باقی کا ماس کھانا پڑے گا۔ اور یہ برہمن تو کیا شودر بھی نہیں کر سکتا۔ اور اگر سب حصے ملا کر انیس گائیں بھی بن جاتیں۔ تو کیا ہوتا۔ یہ آدھی اور تین چوتھائی اور چار بٹہ پانچ کی بانٹ کس طرح ہو سکتی ہے۔ گئو ہتیا کون کرتا؟

اب کریں تو کیا کریں؟

اگر پورے پورے حصے نہ بانٹے گئے تو ساری گائیں مفت میں راجے کے ہاتھ میں چلی جائیں گی۔ اس کے پاس آگے تھوڑا دھن ہے جو ہماری پونجی بھی اس کا مال بن جائے۔ باپ کی اچھیا نہ پوری کی گئی۔ تو بڑا پاپ ہو گا۔ مگر اس گورکھ دھندے سے نکلنے کا کوئی راستہ ضرور ہو گا۔ ہمارے باپ نے کچھ سوچا ہی ہو گا نا؟

اسی ادھیڑبن میں کئی دن اور راتیں گزر گئیں۔ اور فیصلہ کچھ بھی نہ ہو سکا۔

اب راجکماری جی آپ بتائیں کہ بوڑھے باپ۔ تین بھائیوں اور راجہ کا یہ الجھاؤ کیسے دور ہو سکتا ہے؟

ناگ رانی نے سوچ میں سر جھکا لیا۔ اور کچھ دیر خاموش رہی چندر کانت کا دل منہ کو آ رہا تھا۔ سر پر سے آتما نکلی جا رہی تھی۔ آخر راجکماری نے سر اُٹھایا اور بے جھجک یہ جواب سنایا۔

تینوں کو ایک اور گائے مانگ لینی چاہیئے۔ ان بیس میں سے آدھی یعنی دس گائیں بڑا لے لے۔ منجھلا پانچ یعنی بیس کا چوتھا حصہ اور چھوٹا چار گائیں۔ پانچواں حصہ۔ دس۔ پانچ اور چار۔ انیس گائیں ہوئیں۔ جو گائے مانگی تھی اُسے واپس کر دیں سارا جھگڑا ختم ہو گیا باپ کی اچھیا پوری ہو گئی۔ سب گائیں پوری طرح بٹ گئیں بھائیوں کو اپنی بانٹ سے بڑھ کر حصہ ملا۔ اور راجہ تو ضرور ہی خوش ہو گا جس کا نام دھرم آسنا ہے۔ اگر وہ اس طرح کھلم کھلا لوگوں کا مال لینا شروع کر دے تو لوگ یا تو چھپ چھپ کر پاپ کرنے لگیں۔ . . .

۔۔ اور برہمن تک گئو ہتھیا کرنے پر مجبور ہو جائیں یا کھلم کھلا بغاوت ہو جائے۔ راجاؤں کا راج جبھی تک چلتا ہے۔ کہ لوگوں میں بھرم بنا رہے۔"

یہ کہہ کر راجکماری راجہ پر ایک نظر ڈالتی ہوئی باہر چلی گئی اور اپنے ساتھ راجہ کا دل بھی لیتی گئی۔ چندر کانت اور بھاگیرت واپس لوٹ آئے

تیسرا دن

راجہ بھاگیرت سے کہا: "اے میرے متر! راجکماری نے پھر تیرے سوال کا جواب دے دیا۔ اور ایک اور دن برباد ہو گیا۔ مگر مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ اس جاتے جاتے نظر ڈالنے کی ادا کی خاطر۔ کوئی نگاہوں کے بان اور تیر دپکان کا رونا روتے ہیں۔ مگر میرے جلتے ہوئے دل و جگر پر اس نظر نے وہ کام کیا ہے۔ جو برسات کی بوندیں تپتی ہوئی زمین پر کرتی ہیں۔ سوئی مری ہوئی زمین دوبارہ جاگ جی پڑتی ہے پھول اور کھیت لہلہانے لگتے ہیں۔ اسی طرح میری برباد آرزوئیں اُس جھجھلتی ہوئی نظر نے دوبارہ آباد کر دیں۔

بھاگیرت پہلے تمہارا ساتھ اور یہ تصویر میری زندگی کا بہانہ تھا اور اب اس نظر کی یاد میری مددگار اور غمگسار ہے۔ راجہ یونہی اپار دنا روتا رہا۔ اور تصویر کو تکتے تکتے رات گزار دی۔

آخر سورج نکلا۔ اور راجہ اور بھاگیرت باہر باغ میں نکل آئے بھاگیرت ہزار جتن سے جیندر کانت کا دل بہلاتا رہا۔ پھر شام ہو گئی اور دونوں دربار میں حاضر ہو گئے۔ وہاں راجکماری زرد لباس پہنے ہوئے زر و جواہر میں جھلمل جھلمل کرتی تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے راجہ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ اور وہ مدہوش سا ہو کر رہ گیا۔

بھاگیرت آگے بڑھا اور پھر ایک کہانی شروع کر دی:۔

اے راجکماری۔ دیر ہوئی ایک راجہ تھا جو پرجا کا مال کھا کھا کر پھوٹ کر مر گیا۔ اُس کا ایک بچہ تھا۔ ننھا سا جو نہ چل سکتا تھا نہ بول سکتا تھا۔ اس راجہ کا ایک بھائی بھی تھا۔ جو راجدھانی پر اپنا قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کام کے لئے ضروری تھا۔ کہ ننھے راجے کو ایک طرف کیا جائے۔ راجہ کے بھائی کو اس میں کیا شرم تھی۔ راجہ لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں۔ اور پھر سامنے تھا بھی ایک بچہ۔ چچا نے سوچا بے زبان بھتیجے کو ایک نہیں ہزاروں راہوں سے موت کے کنارے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک دن اس نے ننھے کے چاکروں کو بہت سا لوبھ دے کر اس پر منا لیا۔ کہ وہ آدھی رات کے وقت کچھ دیر کے لئے ادھر اُدھر ہو جائیں۔ اور ایک قاتل کو تیار کر لیا۔ کہ وہ آدھی رات کو اس کمرے میں گھس کر راجہ کا کام تمام کر دے۔ مگر یہ قاتل دکنی راجپوت تھا۔ جو شہر میں ابھی ابھی آیا تھا۔ اور نہیں جانتا تھا کہ راجہ کون ہے۔ آدھی رات کے وقت قاتل راجہ کے کمرے میں آ گھسا۔ اور لگا ادھر اُدھر راجہ کی تلاش کرنے۔ مگر اسے ایک ننھے سے بچے کے سوا اور کوئی نظر نہ آیا۔ اور اُسے معلوم نہیں تھا۔ کہ راجہ یہی ننھا نادان ہے۔ جو فرش پر سیب سے کھیل رہا ہے۔

سیب اس کے ہاتھوں سے پھسل کر لڑھکتا ہوا قاتل کے پاؤں تک جا پہنچا۔ ننھے راجے نے ہاتھ پھیلا کر رونا شروع کر دیا۔ قاتل نے سیب اُٹھا کر اُس کی طرف لڑھکا دیا۔ اور ننھا ہنستے لگا تالیاں بجانے لگا۔ دونوں اس کھیل میں لگے رہے۔ اتنی دیر میں نئے چاکروں کی چوکی کا وقت آ گیا۔ اور اُنہوں نے قاتل کو پکڑ لیا۔ جب قاتل سے پوچھا۔ کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ تو اس نے کہا میں اپنے آقا کی طرف سے راجہ کے نام ایک سندیسہ لایا ہوں۔ اس پر سب ہنسنے لگے۔ اور بولے:

"راجہ مر چکا ہے۔ اب یہی راجہ ہیں"

قاتل کھسیانا سا ہو کر کہنے لگا۔ تو پھر میں لوٹ جاتا ہوں۔ اور اپنے آقا کو خبر دیتا ہوں۔ کیونکہ میرا سندیسہ راجہ ہی کے لئے تھا۔ اور یہ راجہ تو ابھی ننھے نادان ہیں"۔

چاکروں نے اُسے جانے دیا اور وہ اپنی جان کی خیر مناتا راتوں رات شہر سے بھاگ گیا۔

موذی چچا نے جب یہ ترکیب بگڑتی دیکھی۔ تو اُس نے ایک اور چال سوچی اور ایک قاتل کی جگہ ڈاکوؤں کا بڑا جتھہ تیار کیا موقع پا کر اس نے انہیں ایک درختوں کے جھنڈ میں چھپا دیا۔ جو اس سڑک کے پاس تھا۔ جہاں سے ننھا راجہ اور اُس کے چاکر پوجا پاٹھ کے لئے مندر کو جایا کرتے تھے۔ اس نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ راجہ ننھا سا

بچہ ہے۔ اور ہیرے جواہرات میں لدا ہوا چاکروں سے گھرا ہوا رہتا ہے۔ کرنا پرماتما کا یہ ہوا کہ یہ ڈاکو تو چھپے بیٹھے رہے۔ اور ان تک پہنچنے سے پہلے راجہ اور اس کے محافظوں پر کسی اور ڈاکوؤں کے جتھے نے حملہ کر دیا۔ اور ایک کے سوائے سارے چاکروں کو مار ڈالا۔ اور ننھے راجے کے جواہرات اور کپڑے اتار کے اُسے سڑک پر پھینک دیا۔ اور چلتے بنے۔ جو نوکر بچ گیا۔ اُس نے راجہ کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور مندر میں لے گیا۔ راستہ میں وہ ڈاکو جن کا جھنڈ بھی آیا۔ جہاں دوسرے ڈاکو چھپے ہوئے تھے۔ مگر اُنہوں نے سمجھا کہ یہ کوئی بھیک منگے ہیں۔ اس لئے اُنہیں نہ لُوٹا۔ اس طرح دوسری بار ننھے راجہ کی جان بچ گئی۔ مگر چچا کو پھر بھی چین نہ آیا۔ راجکماری جی حکومت کا لالچ بُرا ہوتا ہے۔ بڑے لوگ بڑائی کے نشہ میں دھرم درم سب بھول جاتے ہیں۔ چچا نے اب ایک رسوئی سے ساز باز کی اور راجہ کے دودھ میں زہر ملوا دیا۔ دودھ دودھیا پتھر کے پیالہ میں لایا گیا۔ اور ننھے راجہ نے ضد کرکے دونوں ہاتھوں سے اُٹھا لیا۔ کرنا پرمیشور کا کیا ہوا کہ ایک چاکر کو اُسیوقت چھینک آگئی۔ بیچارہ بہتیرا روکتا رہا۔ مگر بس کی بات نہ تھی روکنے سے اور زور بڑھ گیا۔ اور چھینک کا ایسا دھماکا اٹھا کہ ننھے راجے کے ہاتھ سے پیالہ گر گیا۔

یہ تو خیر ہوئی۔ کہ راجہ ننھا نادان تھا۔ ورنہ چھینک کی سزا نہ جانے کیا ملتی۔ ننھا کھا کھ ہوتا۔ اُلٹا خوشی سے چلانے لگا۔ تالیاں بجانے لگا۔ دودھ فرش پر پھیل گیا۔ ننھی ننھی لہروں کی طرح اور نازک پتھر کا پیالہ پاش پاش ہو گیا۔ یوں تیسری بار اُس کی جان بچی اس کے چچا نے اب کوئی چال چلنی تھی۔ مگر وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک کھتری ذات کی استری کے پتی نے اسے جان سے مار ڈالا۔ کیوں کہ اس نے اس کی دھرم پتنی کی بے آبروئی کرنی چاہی تھی۔

اے راجکماری اس کا اُتر دیجئے کہ ایک ننھا نادان ایسے چالاک مکار کے پھندوں سے کیسے بچ گیا۔

بھاگیرت خاموش ہو گیا۔ اور راجکماری کہنے لگی:۔

یہ بچہ کی نادانی تھی۔ جو اس کے کام آئی۔ جیسے ایک باہر پڑا ہوا پتھر اس قیمتی ہیرے سے جو کئی صندوقوں میں بند ہو زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نکما معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک ننھا بیکس بچہ اپنی ناطاقتی کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔ سب سے اچھا تریاق زہر کا نہ ہونا۔ سب سے بڑھیا خوبی حسن کا نہ ہونا سب سے طاقتور دمدمہ دشمن کا نہ ہونا۔ اور سب سے کار آمد محافظ بچہ کی بیکسی ہے۔ بھلا نازک کنول کے پھول کا بھی کوئی بیری ہوگا۔

یہ کہہ کر راجکماری اٹھی۔ اور باہر چلی گئی اور مڑ کر راجہ پر ایک نظر ڈالتی گئی اور ساتھ ہی اس کا دل بھی لیتی گئی۔ بھاگیرت اور راجہ لوٹ آئے۔

چوتھا دن

راجہ نے بھاگیرت سے کہا:۔ بھاگیرت راجکماری نے پھر تمہارے سوال کا جواب دے دیا۔ اور اب میرے تین دن جاتے رہے۔ مگر میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ اس نظر کے صدقے جو اس نے گردن کو پھیر کر جاتے جاتے مجھ پر ڈالی۔ ہائے بھاگیرت میرا ہر۔ یوں اُلجھ کر رہ گیا جیسے مچھلی جال میں!

یہ تصویر نہ ہوتی تو جینا اجیرن ہو جاتا۔ پوچھنے سے پہلے میرا دم نکل گیا ہوتا۔ راجہ نے رات محبت بھری یادوں میں گزار دی۔ نیند کا بیری صبح تک تصویر کو تکتا رہا۔ سورج نکلا۔ تو یہ بھی باہر آیا اور جوں توں کرتے بھاگیرت اور باغ کے آسرے مرتے پڑتے دن کاٹا۔ اور شام ہونے پر راجکماری کے دربار میں پہنچے۔ وہاں راجکماری سرمئی لباس پہنے تھی۔ اور سرمئی جواہرات میں جھلمل کر رہی تھی۔ اس نے راجہ کو مہربانی کی نظر سے دیکھا۔ اور راجہ بے سکت ہو کر رہ گیا۔ بھاگیرت آگے بڑھا اور کہنے لگا:۔

"راجکماری کسی دیس میں دو برہمن رہتے تھے۔ سگے بھائی جوڑے۔ ایک کا نام بمبا تھا۔ اور دوسرے کا پرتمبا۔ بنانے والے نے انہیں کسی نتھری ہوئی جھیل کی تہوں میں بیٹھ کر بنایا ہوگا کہ چاند سے چاند کا عکس پانی میں اور ایک ٹہنی کا پتا دوسرے سے اتنا ملتا جلتا نہیں ہوتا جتنا ایک بھائی دوسرے سے۔ بچپن میں ان کی ماتا نے ایک کے گلے میں ایک ٹوٹکا باندھ رکھا تھا تاکہ دودھ پلاتے وقت دونوں کی پہچان ہو سکے۔ اور جب اُن کے ماں باپ مرگئے۔ تو کسی کو یہ پہچان بھی نہ رہی۔ دیکھنے والے یہ سمجھتے تھے۔ کہ اس کی آنکھیں ان کے ساتھ دغا کر رہی ہیں۔ اور ایک ہی چیز کے دو دو عکس دکھا رہی ہیں۔ اور جیسی ان کی صورت تھی ویسی ہی ان کی آواز تھی۔ اور ویسی ہی سیرت تھی۔ ان کا رواں رواں ملتا جلتا تھا بدن کے کھال سے لے کر ہردے کی گہرائیوں تک۔

ایک دن کیا ہوا کہ بسنت کے میلے پر بمبا کی نظر ایک من موہنی صورت والی عورت پر پڑ گئی۔ اس نے بھی بمبا کو اسی آن دیکھا۔ اور کام دیوتا نے اپنی مان سنبھال کر ان دونوں کی نگاہوں ہی کو اپنے تیر بنا لیا۔ بمبا نے اپنی پیاری کا نام پتہ پوچھ لیا۔ اور ہفتہ میں تین دن اس کے گھر گذارنے لگا۔ پریم کی مستی کا متوالا بمبا اپنی خوشی کو سنبھال نہ سکا۔ اور اپنی پیاری کے روپ کے غرور میں آکر پرتمبا کو سارا بھید بتا دیا۔ اور ایک دن دور سے اپنے بھائی کو اسے دکھا بھی دیا۔ پرتمبا کیا کرتا۔ وہ ہر طرح اپنے بھائی کا عکس تھا۔ وہ بھی اس کی محبت میں دیوانہ ہوگیا۔ اور شرم حیا کو ایک طرف کرکے۔

بھلا محبت میں شرم و حیا کیا اور بھائی کیا۔

ہفتے کے باقی دنوں میں آپ وہاں جانے لگا۔ وہ بچاری ناری بھی خوش ہوئی۔ کہ بمبا ہفتہ میں تین دن کی بجائے چھ دن آنے لگا۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ بمبا نہیں پرتمبا ہے۔

یوں ہی دن گذرتے گئے۔ ایک دن کیا ہوا کہ بمبا پریت کے جوش میں آکر نہ رہ سکا۔ اور اپنے بھائی کے باری کے دن اپنی پیاری کے گھر جا پہنچا۔ اور کیا دیکھا کہ پرتمبا سیج پر لیٹا ہوا ہے۔ اور اس کی پیاری مورچھل ہلا رہی ہے۔ جون ہی اسے بمبا نظر آیا۔ وہ چیخ اُٹھی۔ اور پرتمبا گھبرا کر بستر سے اُٹھ بیٹھا وہ بچاری ایک سے دوسرے کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ اور وہ دونوں دیکھتے دیکھتے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ یہ چیخ پکار سُن کر راجہ کے سپاہی آ پہنچے۔ اور تینوں کو پکڑ کر پنچوں کے پاس لے گئے۔

اب بمبا کہتا ہے۔ یہ میرا بھائی ہے۔ اس نے میری پیاری مجھ سے چھین لی ہے۔ اور پرتمبا کہتا تھا یہ میری ہے اور میرے بھائی کا جی للچا پڑا ہے۔

بمبا کہتا تھا میں نے اسے پہلے دیکھا تھا۔ پرتمبا بھی ہو بہو یہی دہراتا تھا۔

پنچوں نے عورت سے پوچھا۔ کہ تمہارا چاہنے والا کون ہے۔ تمہارا جوڑ پہلے کس سے ہوا۔

عورت بچاری کیا کہتی۔ اسے دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا وہ کہنے لگی مجھے تو آج پتہ چلا ہے کہ یہ ایک نہیں دو ہیں۔

اے راجکماری اب آپ بتائیں کہ فیصلہ کرنے والے کس طرح جانچیں کہ کون سچا ہے؟

بھاگیرت چپ ہو گیا۔ تو راجکماری بولی:-

تینوں کو الگ الگ لے جا کر پوچھا جائے کہ ان کی پہلی ملاقات کن حالات میں ہوئی۔ ایک ایک بات پوری طرح سنی جائے۔ چھوٹے بھائی نے یہ تو سُنا ہوگا کہ بسنت کے میلے پر دونوں کی یاری ہوئی۔ مگر دیکھنے والی آنکھ اور یاد رکھنے والا دل گڑ بڑا کر نری سنی سنائی کان کی بات کو جھٹلا دیں گے۔

یہ کہا اور راجکماری مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی اور راجہ کا دل ساتھ لیتی گئی۔ بھاگیرت اور راجہ چپ چاپ واپس لوٹ آئے۔

طالب بنارسی کا لیل و نہار

(از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے۔

منشی مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی نے رومیو جولیٹ کے علاوہ شکسپیر کے ہملٹ کو خون ناحق کے نام سے۔ ٹولفتھ نائٹ کو بھول بھلیاں کے نام سے اور مرچنٹ آف وینس کو دلفروش کے نام سے از سرِ نو اردو میں سلیقہ سے لکھا۔ چندراولی نامی ایک طبعزاد ڈراما بھی تصنیف کیا۔ جسے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن ہر کھیل میں پلاٹ اور کیرکٹروں سے نپٹنے کا ڈھب اور ان کا انداز بیان ایک ہی سا رہا۔ وقت اور تجربے نے اُن کے ابتدائی دور کے دوسرے ڈراموں میں کوئی مزید تبدیلی یا خصوصیت پیدا نہ کی۔ یا انہیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ اور یا حالات کو دیکھتے ہوئے اس کی جرأت نہ پڑی۔ البتہ بہت عرصہ کی خاموشی کے بعد انھوں نے جو نئے ڈرامے لکھے۔ ان میں بعض ایسی نئی خصوصیات ضرور نظر آتی ہیں۔ جو ان کے ابتدائی ڈراموں میں موجود نہ تھیں۔

لیکن احسن صاحب کو ڈراما نویسی کے ابتدائی زمانہ میں اُن ہی کے ایک ہمعصر نے ڈراما کو نامناسب تصنع سے پاک کرنے اور زندگی سے قریب تر کر دینے کی ایک ایسی مہتم بالشان کوشش کی۔ جو آج تک اُردو ڈراما کی تاریخ میں بہت نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے۔

یہ ڈراما نویس منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی ہیں۔ اور ان کے جس ڈرامہ کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ وہ "لیل و نہار" ہے۔

طالب بنارسی اپنے وقت میں اُردو کے مشاق شاعر اور نثر نویس تھے۔ اس زمانہ کے کئی ادبی رسائل میں بھی اُن کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ لیل و نہار سے پہلے یہ دلیر دلشیر۔ نازاں اور کئی ڈرامے تصنیف کر چکے تھے

لیکن ان ڈراموں میں اپنے زمانہ کے دوسرے ڈراموں سے جدا کوئی نمایاں اور غیر معمولی بات نہ تھی۔ ان کی ڈرامہ نویسی کے جوہر لیل و نہار میں ہی کھلے۔ جو اگرچہ ان کا آخری ڈراما ہے۔ مگر اُردو کے پرانے ڈراموں میں سے ہے۔

سنا ہے۔ اس کھیل کا پلاٹ انہوں نے لارڈ لٹن کے ناول مارننگ اینڈ نائٹ سے اخذ کیا تھا۔ پلاٹ کہیں سے لیا ہو۔ یا ان کا طبع زاد ہو۔ بہرحال طویل اور پیچیدہ ہے۔ مگر اس کے مناظر نہایت ہوشمندی سے اس طرح قائم کئے گئے ہیں۔ کہ باوجود اپنی پیچیدگی کے افسانہ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اور وضاحت کے لئے نہ غیر ضروری مناظر کی کثرت ہے۔ اور نہ تفصیلی انداز کی تقریروں کی۔

پلاٹ بہت ہی مختصر طور پر یہ ہے۔ کہ جہاں سیر کے چچا نے یہ کہہ رکھا تھا۔ کہ اگر جہاں سیر نے اس کی مرضی کے خلاف شادی کی۔ تو حصے ترکے سے ایک کوڑی بھی نہ پائے گا۔ پردیس میں جہاں سیر نے چچا سے پوشیدہ شادی کر لی۔ اور اسے اس خوبی سے چھپایا۔ کہ اس کا بڑا لڑکا جوان ہو گیا۔ مگر وطن میں کسی کو اس کی خبر تک نہ ہونے پائی۔

چچا کا ورثہ پا چکنے کے بعد گھوڑے سے گر کر جہاں سیر کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کی بیوی بچوں نے اپنے آپ کو جہاں سیر کا وارث کہا۔ مگر جہاں سیر کے بھائی فلک سیر نے سب کچھ جانتے ہوئے شاہناز کو جہاں سیر کی بیاہتا بیوی ماننے سے انکار کر دیا۔ نکاح نامہ کی تلاش ہوئی قاضی اور گواہ ڈھونڈھے گئے۔ لیکن اتفاق سے کچھ بھی نہ ملا۔ اور ثبوت نہ ہونے کی صورت میں جہاں سیر کے بیوی بچے گھر سے نکال دیئے گئے۔

صدمے اور غربت کی مصائب نے شاہناز کا کام تمام کردیا بچے طرح طرح کی مصائب میں گرفتار ہوئے۔ اور جب ان کی مشکلات انتہا کو پہنچ گئیں تو محض حسن اتفاق کی بدولت نکاح نامہ مل گیا۔ جسے دکھا کر جہاں سیر کی اولاد اس کی جائیداد کی وارث قرار پائی۔

پلاٹ کی بنیاد کسی اہم بات پر نہیں۔ بلکہ محض ایک حادثہ پر قائم ہے کہ ایک وقت نکاح نامہ نہیں ملتا۔ اور دوسرے وقت اتفاق سے مل جاتا ہے۔ لیکن اگر اس بنیادی کمزوری سے قطع نظر کرلیا جائے۔ تو۔ ڈرامہ اپنے زمانے کے ڈراموں میں بیحد ممتاز معلوم ہوتا ہے۔

اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اُردو کے پہلے ڈراموں کی طرح اس کا تعلق بادشاہوں اور نوابوں کی زندگی سے نہیں۔ بلکہ ایک متمول شخص کے خاندانی حالات سے ہے۔ اور وہ سب حالات اِسی نوع کے ہیں۔ جن میں کوئی بھی انوکھی یا عجیب بات نہیں۔

ایسے زمانہ میں جب کہ لوگ رومانوی انداز کے واقعات دیکھنے کے عادی اور متمنی تھے۔ طالب کا اِس حد تک سادہ ڈرامہ لکھ دینا ایک ایسا اقدام تھا۔ جس کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ ان کی طبیعت میں اس زمانہ کے رومانوی ڈرامہ کے خلاف ردعمل پیدا ہوا اور انہوں نے پوری کوشش کی۔ کہ لیل و نہار کو اس قسم کے تمام اثرات سے پاک رکھیں۔

اس خیال کو اِس بات سے اور بھی تقویت پہنچتی ہے۔ کہ اِس کھیل میں عشق و محبت کے جذبات اِس مقدار میں ہیں۔ جیسے آٹے میں نمک۔

تین ایکٹ اور اٹھارہ سین کے ڈرامہ میں صرف دو طویل مناظر کے دیدا سے بچتے ہیں۔ جن میں ہیرو اور ہیروئن عشق و محبت کے گنتی کے چند فقرے بولتے ہیں۔

ڈرامہ کی یہ خصوصیت واضح طور پر یہ کہتی ہے۔ کہ طالب تمام مروجہ مقبول باتوں سے بچ کر ایک نئے انداز کا ڈرامہ لکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف واقعات ڈرامہ میں سے رومانوی عنصر نکالا۔ بلکہ مکالمات میں سے بھی اسے بڑی حد تک خارج کردیا۔ اور بے حد سادہ نثر لکھی جس میں قافیہ بھی زبردستی نہیں۔ بلکہ عموماً محض اتفاق سے آجاتا ہے۔ اور اشعار بھی مقابلتاً بہت کم ہیں۔

کھیل کی کامیابی کیلئے طالب نے تمام تر بھروسہ اس بات پر کیا۔ کہ تماشائیوں کو اس میں روزمرہ زندگی کا عکس نظر آئے۔ وہ ایسے واقعات دیکھیں جو اکثر امیر گھرانوں کے متعلق سننے میں آتے رہتے ہیں۔ ایسے کیرکٹروں سے دوچار ہوں جن سے انہیں زندگی میں عموماً واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ڈرامہ کی فضا ایسی ہو۔ جو سٹیج کو زندگی سے بہت قریب کی چیز بنا کر دکھا دے۔

پہلے ہی منظر میں عورتوں کے گانے بجانے کے بعد جہاں سیر داخل ہوتا ہے اور بیوی سے کہتا ہے۔ کیوں صاحب! رتجگے سے فراغت پائی؟

شہناز۔ جی ہاں رتجگا تو ہو چکا۔ اب درگاہ کی منت چڑھانی ہے۔

جہاں سیر۔ جاؤ منت چڑھاؤ۔ جلدی چلو۔

اتنے میں بڑا بیٹا فیروز اور چھوٹا بیٹا انور داخل ہو کر آداب بجا لاتے ہیں۔ فیروز کہتا ہے "اباجان درگاہ کی سواری تیار ہے"

ننھے میاں کہتے ہیں "اباجان درگاہ میں بھی جاؤں گا!"

جہاں سیر۔ مسکرا کر بولتا ہے "اوہو۔ آپ بھی جائیے گا۔ اچھا چلو بھئی زیارت کرآؤ (بڑے لڑکے کو ہدایت دیتا ہے) سب نوکر ساتھ جائیں گے۔

فیروز۔ جی ہاں۔ ہمایوں بھائی بھی ساتھ آئیں گے۔

(ہمایوں آتا اور شرماتا شرماتا چچی کو سلام کرتا ہے)

ہمایوں۔ چچی جان آداب عرض ہے۔

شہناز۔ جیتے رہو بیٹا! شرماتے کیوں ہو؟

جہاں سیر۔ نئے نئے آئے ہیں۔ اس لئے شرماتے ہیں۔ ہل مل جائیں گے۔ تو نہ شرمائیں گے۔

شہناز۔ شوہر سے پوچھتی ہے "باغ سے آپ اکیلے آئے چھوٹے میاں کو ساتھ نہ لائے؟"

جہاں سیر۔ وہ ابھی تک وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔

شہناز ۔ اخاہ ۔ بڑے اللہ والے ہیں۔

جہاں سیر ۔ ہم رات تھکے ماندے سفر سے آئے ۔ وہیں باغ میں سو رہے۔ یہاں نہ آسکے ۔ لو جاؤ ۔ دیر نہ لگاؤ۔

جس زمانہ میں یہ ڈرامہ لکھا گیا ۔ اس کا خیال کیجئے اور میاں بیوی اور بچوں کی اس گفتگو کو دیکھئے۔ کس قدر بے ساختگی اور گھریلو فضا موجود ہے ۔

جدید انگریزی ڈراما کا ذوق عام ہو جانے کے بعد آج بھی یہ مکالمہ کسی طرح معیار سے کم نہیں معلوم ہوتا۔

کردار نگاری میں طالب نے جس اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنا کمال دکھایا۔ فلک سیر کے کیرکٹر میں دیکھئے ۔ یہ حضرت بگلا بھگت ہیں ۔ ہاتھ میں تسبیح رکھتے ہیں ۔ دن رات وظیفہ پڑھنے سے کام ہے ۔ لیکن دل کے اندر زر و مال کی ہوس گھر کئے ہوئے ہے ۔ اپنے مرحوم بھائی کی زبانی معلوم کر چکے ہیں کہ شاہناز ان کی بیاہتا بیوی ہے ۔ اور نکاح نامہ کہیں کاغذوں میں ادھر اُدھر ہو گیا ہے ۔ لیکن بھائی کی آنکھیں بند کرتے ہی بھابی کو رکھی ہوئی رنڈی قرار دے دیتے ہیں ۔ حصّے ترکے میں سے اُسے کچھ نہیں دینا چاہتے ۔ صرف اس کا ایک وظیفہ مقرر کر دینے کا تہیہ کر لیتے ہیں ۔ عالم سوز وکیل اور مرحوم جہاں سیر کے وفادار ملازم اشرف کو ساتھ لئے نکاح نامہ کی تلاش میں گھر کے کاغذات ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

عالم سوز ۔ وکیل کچھ کاغذات دے کر کہتا ہے :۔

" جناب لیجئے ۔ ان کاغذات کو بھی بند کیجئے ۔ مہر لگا دیجئے ۔

فلک سیر ۔ آہ بھر کر بولتا ہے " عالم سوز کیا مہر لگائیں ؟ جی پر جو گذرتی ہے ۔ کیا بتائیں ؟

اشرف کے منہ سے بے اختیار آہستہ سے نکل جاتا ہے ۔

تمھوتے کے منہ میں خاک :

فلک سیر ۔ اس کا فقرہ سنتا نہیں ۔ مگر اسے بولتا دیکھ کر پوچھتا ہے

کیوں بھئی کچھ کہنا ہے ؟

اشرف ۔ جی ہاں ۔ یہ فرمائیے ۔ کہ بڑی سرکار کے نوکر چاکر بحال رہیں گے ۔ یا جواب پائیں گے ؟

بگلا بھگت فلک سیر کہتا ہے " بھائی نوکر رہیں گے ۔ تو بھائی کی یاد دلائیں گے ۔ ہمارے دکھے دل کو اور دُکھائیں گے "۔

منہ پھٹ اشرف فلک سیر کو خوب سمجھ چکا ہے ۔ کہتا ہے " بیشک ۔ اور اس بھاری ملکیت کے ملنے کی یاد بھی دلائیں گے "۔

یہ سُن کر فلک سیر آگ بگولا ہو جاتا ہے " بے ادب ۔ بدگمان دو کوڑی کا آدمی اور گز بھر کی زبان "۔

اشرف ۔ بھی گرم ہو جاتا ہے " بیشک میں دو کوڑی کا مزدور ہوں مگر ایمان کا سچا اور اپنی وفاداری پر مغرور ہوں "۔

فلک سیر ۔ نکل جا میرے مکان سے ۔ عالم سوز حساب چکا دو "۔

اشرف ۔ بڑی عنایت ہے ۔ مجھے خود ایسی جگہ سے نفرت ہے "۔

عالم سوز ۔ باہر بیٹھو ۔ میں آتا ہوں ۔ تمہاری باقی دلاتا ہوں ۔

اشرف باہر جاتا ہے ۔ فلک سیر غصّے کی اس بے اختیاری کا اثر کم کرنے کو آہ بھر کر کہتا ہے ۔ عالم سوز اس آتش غم کو کیونکر بجھائیں ؟

میز پر شراب کی بوتل رکھی ہے ۔ عالم سوز جواب میں ایک پیالہ بھر کر پیش کرتا ہے " اس گرم پانی سے بجھائیے "

فلک سیر ۔ پیالہ لیتا ہے ۔ مگر اب بھی کہتا ہے ۔

" کیسی بشر کی زندگی ناپائیدار ہے "

(پیالہ چڑھا کر بولتا ہے) آہا ۔ یہ شراب بہت خوشگوار ہے

عالم سوز ۔ شیراز کی شراب ہے شیریں ہے لال ہے
زاہد کو بھی اگر یہ ملے تو حلال ہے

بس شراب کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔
سٹیج پر جواہر خاں کا کیرکٹر بھی اس قدر مقبول ہو چکا ہے۔
کہ اس کا ذکر نہ کرنا نامناسب ہے۔ یہ ایک پرانی وضع کا
کلاہ باری شخص ہے جو نحیف مزاجی اور حرم دلی کی ایک عجیب
دلچسپ معجون ہے۔ ناس سونگھتے ہیں تکیہ کلام "آیا خیال
شریف میں" ہے۔
شہناز اپنے غریبانہ مکان میں بستر مرگ پر پڑی ہے۔ کہ یہ مکان کا
کرایہ وصول کرنے نازل ہو جاتے ہیں۔
فیروز - کچھ دودھ دلاؤ گے یا آج بھی بلا بتاؤ گے"
شہناز - غریب کہتی ہے "بھائی کچھ روز اور ٹھہر جاؤ - ہمارے حال
پر ترس کھاؤ۔"
جواہر خاں - بیوی ترس کھانے سے پیٹ نہیں بھرتا۔ لاؤ کچھ دلاؤ۔
میں آج کل ہوں بڑی تکلیف میں۔ آیا خیال شریف میں؟
اتنے میں عالم سوز وکیل آپہنچتا ہے۔ کہتا ہے "بندگی"!
جواہر خاں فرماتے ہیں "بندگی جناب آئیے۔ بیٹھ جائیے۔ ناس
قبول فرمائیے"
عالم سوز - پوچھتا ہے۔ "جواہر خاں آپ کہاں"؟
جواہر خاں - "کرائے کے لئے آیا۔ چار مہینے سے ایک پیسہ نہیں پایا۔
عالم سوز - یہ ماں بیٹے مان جائیں۔ تو عمر بھر آرام پائیں۔
فیروز - جل کر کہتا ہے "وظیفہ لے کر باپ کی آبرو مٹائیں۔ ماں کو
رکھی ہوئی رنڈی ثابت کرائیں۔
عالم سوز - ثابت کرانے میں اب کیا رہا۔ اب تو عدالت سے بھی ثابت
ہو چکا۔
جواہر خاں - اس جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ کہتا ہے "لاؤ بھائی -
روپے دلاؤ۔ کرایہ چکاؤ۔ میں کہہ چکا ہوں۔ کہ اب تاب
نہیں اس تکلیف میں۔ آیا خیال شریف میں"
فیروز - بگڑ کر کہتا ہے "فلاں صاحب تاب نہیں تو میرا

اسباب اٹھالے جائیے"
جواہر خاں - چڑ کر بولتا ہے۔ میاں تن پر نہیں لتہ۔ نہ پیٹ کو بھتہ۔ پھر
بھی مزاج آنا تتا۔
یہ حضرت اس وقت تو فیروز سے چڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن جب
فیروز کی غیرت نوکر کی امداد قبول کرنا گوارا نہیں کرتی۔ تو اس سے
خوش ہو کر اسے اپنے ہاں ملازمت دے دیتے ہیں۔
ملازمت کے دوران اس کی مصائب پر اس سے ہمدردی
فرمایا کرتے رہتے ہیں۔ "بھائی صبر چاہیئے تکلیف میں۔ آیا خیال
شریف میں۔ لیکن جب ماں کی شدید علالت کی خبر پا کر فیروز
ان سے چند پیسے کی امداد طلب کرتا ہے۔ تو فرماتے ہیں "کس
لئے پیسے۔ آتے ہی یہ نخرے کیسے؟ ادھار دینا نادانی ہے۔
انسان فانی ہے۔" رحم کی استدعا پر جواب دیتے ہیں۔ "کیا
ہم نے تیرے گھر کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔" خدا کی راہ پر مدد
طلب کرتا ہے تو فرماتے ہیں "ہاتھ میں پیالہ لو اور بازار
میں مانگو"
طالب کے لیل ونہار نے ڈراما کے افسانے۔ کیرکٹر اور فضا
میں تو انقلاب کیا ہی تھا۔ گانوں میں بھی ایک انقلاب کر دیا۔
لیل ونہار سے پہلے جتنے ڈرامے لکھے گئے۔ ان میں غزلوں
کے علاوہ سب گانے ٹھیٹھ ہندی زبان میں ہوتے تھے۔
طالب کی شستگی ذوق کو یہ اچھا نہ معلوم ہوا۔ کہ اُردو
بولتے بولتے ایک کیرکٹر گانا یک لخت ٹھیٹھ ہندی میں
شروع کر دے۔ چنانچہ انہوں نے ڈراموں میں پہلی مرتبہ
گیت اردو زبان میں لکھے۔ ابتدائی حمد لکھی۔

تیری عالی شان لایزالی شان
واہ کیا دیکھی بھالی شان

شراب نوشی کا گیت: "واہ بری پیاری انسان کی
دشمن ہے جان کی کہتے ہیں ہم تو ایمان کی" کا گانا گا

شرابِ تازہ

از جلیلؔ قدوائی، ایم اے، صدر مترجم محکمۂ اطلاعات ہند)

ھے ہر ادائے جاناں ہے ادائے دل ستانی
جو ملیں تو مہربانی نہ ملیں تو مہربانی !

ے میں نے ابتدا ہی میں تھا نیک و بد سمجھایا
مرے دل نے ہائے لیکن مری ایک بھی نہ مانی

ے دل کو اک ستمگر نے ہے جس طرح مٹایا
ملے خاک میں خدایا نہ کسی کی یوں جوانی

ہے محوِ خوابِ راحت وہ ہے مستِ جامِ عشرت
اُسے کیا غرض سُنے وہ مری دکھ بھری کہانی

ے دل نے ترکِ اُلفت کا کیا تو ہے ارادہ
کہیں کر بھی وہ نہ گذرے جو ہے دل میں اُس نے ٹھانی

طن میں ہیں مبارک ہو وطن کی صبح اُن کو
مری شام دشتِ غربت بھی ہے کس قدر سہانی

شی ہے اختیاری نہ یہ غم ہی اعتباری
مجھے اس جہانِ بد میں یہ ملی ہے زندگانی

نہ اُمید کا بھروسہ نہ ہے یاس کا سہارا
مرا غم بھی رفتنی ہے، مرا عیش بھی ہے فانی

یادِ رفتہ

از قلم جواہر نگار حضرت نشترؔ سندیلوی

دن قیامت کے وہ آفت کا زمانہ یاد ہے
درد بن کر عشق کا دل میں سمانا یاد ہے

دفعتہً وہ اٹھ کے جھک جانا نگاہِ شوق کا
اور تبسّم سے ترا بجلی گرانا یاد ہے

اوّل اوّل وہ نگاہوں میں لگاوٹ کی ادا
آخر آخر بے رُخی کے تیر کھانا یاد ہے

وہ ہجومِ جلوہ ہائے شوق دل میں پے بہ پے
دمبدم دریا کا، کوزے میں سمانا یاد ہے

ہائے وہ ہر ہر نظر پر امتحانِ لافِ عشق
حُسن کا سُو سُو طرح سے آزمانا یاد ہے

پہلے چٹکی دل میں لے لینا نگاہِ قہر سے
پھر ترا ہنس ہنس کے پہروں رلانا یاد ہے

لطف فرما تھیں جو حسن و عشق کی آویزشیں
چھیڑ کرنا یاد ہے، ظالم! ستانا یاد ہے

آج تک ہے نقش دل پر ایک اک معصوم ادا
اپنے ہر پیماں کو تیرا بھول جانا یاد ہے

دل کی سعیِ ضبطِ گریہ اور وہ غم کی یورشیں
اُف! نازک وقت، وہ نازک زمانا یاد ہے

یعنی اک ہلکی سی جنبش پر نگاہِ ناز کی
صبر کا، ہاتھوں سے، دامن چھوٹ جانا یاد ہے

بھول سکتے ہیں کہیں وہ دردِ پیہم کے مزے
دل کی ہر کروٹ پہ تیرا مُسکرانا یاد ہے

ہائے وہ ناگفتہ رازِ عشق، وہ تنہائیاں
آنسوؤں ہی سے لگی دل کی بجھانا یاد ہے

میرا دلکی بیقراری پر وہ پیہم پیچ و تاب
اور ز راہِ مصلحت، تیرا نہ آنا یاد ہے

جاتے جاتے دیکھنا مڑ مڑ کے بیتابی کیساتھ
رفتہ رفتہ دل کو پھر قابو میں لانا یاد ہے

آہ وہ ہنگامِ رخصت، جتنا سمجھانا تیرا
اتنا ہی دل کا وہ بیخود ہوتے جانا یاد ہے

وہ شبابِ عشق، نشترؔ! وہ جوانی کی بہار
اُس زمانے کا پلٹ کر پھر نہ آنا یاد ہے؟

تازیانہ

کب تلک اے غافل یہ بے حاصل خیال آرائیاں
ایک گوشے میں پڑے رہ کر فلک پیمائیاں

اُڑ کے پہنچے رفعتِ گردوں پہ اربابِ عمل
اپنے بستر ہی پہ تُو لیتا رہا انگڑائیاں

اپنے ہم جنسوں کی صحبت سے عموماً اجتناب
اور نجومِ آسماں سے انجمن آرائیاں

اک خیال و خواب کی دنیا میں رہنا رات دن
عالمِ ہستی کے ہنگاموں سے بے پروائیاں

رفتہ رفتہ کر کے زائل قوتِ سعی و عمل
تجھ کو لے ڈوبیں نہ تیری فکر کی گہرائیاں

کب تلک باغِ تصوّر کا تماشا کب تلک
کھول آنکھ اور دیکھ فطرت کی چمن آرائیاں

کیوں حقیقت کے سمندر کو سمجھتا ہے سراب
اے تیرے دم سے فروغِ دینِ سوفسطائیاں

تجرباتِ زندگی پر جب نہیں ان کی بنا
سر بسر اوہامِ باطل ہیں تری دانائیاں

تیری نظروں میں نہ ہو جب تک فضائے کائنات
کیا کھلیں تجھ پر خود اپنی ذات کی پہنائیاں

تا کہ تیرا دیدۂ باطن کرے کسبِ ضیا
دیکھ چشمِ ظاہری سے حسن کی رعنائیاں

آہ تُو نے حلقۂ الفاظ تک محدود کیں
حُسن کی دارائیاں اور عشق کی گہرائیاں

اے کہ تُو دنیا میں ہے تفسیرِ "مالا یفعلون"
عاقبت میں بھی تجھے حاصل نہ ہوں رسوائیاں

اسداللہ ملتانی

احسن الکلام

حضرت احسن مارہروی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

غم دے کے اپنے عشق کے قابل بنا دیا
ممنون ہوں کہ دل کو مرے دل بنا دیا

ناقص کو فیضِ عشق نے کامل بنا دیا
انسان کے خطاب کے قابل بنا دیا

تجھ کو بھی ہے خبر کہ یہیں حسنِ جاں ستاں!
تیری اداؤں نے تجھے قاتل بنا دیا

جن ہستیوں میں کوئی تعارف نہ تھا انہیں
جذباتِ حسن و عشق نے یک دل بنا دیا

حسنِ ادا نہ کہیے، وہ تھا خنجرِ قضا
عاشق بنانے آئے تھے بسمل بنا دیا

فطرت بنی محرکِ غفلت، غلط! غلط!!
تم کو غرورِ حسن نے غافل بنا دیا

دریا کا جزر و مد ہے طلسماتِ انقلاب
ساحل کو موج، موج کو ساحل بنا دیا

آئینہ بے قصور ہے اس کی خطا نہیں
خود بینیوں نے تیرا مقابل بنا دیا

چھوڑا نہیں کسی کو تری تیغِ ناز نے
بے دم اسے کیا، اسے بسمل بنا دیا

اے شیخ دیں پناہ، یہ برکت ہے عشق کی
دنیا کو تیرے رہنے کے قابل بنا دیا

قدموں نے ان کے اجڑی ہوئی بزم میں
بے رونقی کو رونقِ محفل بنا دیا

دشوار تھا جو عشق تو آسان تھا بہت
آسان نے سہل کو مشکل بنا دیا

یوں حسنِ خود نما نے دیا درسِ محویت
خلوت گزیں مجھے سرِ محفل بنا دیا

عنصر تھے اشک و آہ و تپ و غم کے منتشر
چاروں نے مل کے ایک مرا دل بنا دیا

پہنچا بھٹک بھٹک کے حریمِ مراد تک
گمراہیوں نے فائزِ منزل بنا دیا

اہلِ جنوں کی بزمِ بصیرت فروز نے
ناصح سے بے وقوف کو عاقل بنا دیا

کیا کام کر سکیں گے وہ عاشق ترے، جنہیں
طولِ شبِ فراق نے کاہل بنا دیا

جھگڑو نہ دردمند سے، اللہ سے لڑو
کیوں اس نے میرا درد بھرا دل بنا دیا

احسن حجاب کے لئے کافی تھا رعبِ حسن
اس نے عبث نقاب کو حائل بنا دیا

چاند سلطانہ

از جناب:-
صوفی محمد حسن صاحب بی اے۔ بی ایم
سری نگر۔ کشمیر

سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں ہندوستان کے بعض علاقوں کی ویسی ہی حالت تھی۔ جو آجکل ہے۔ البتہ دورِ حاضرہ کے بہت سے ویران کھنڈر اُن دنوں میں شاندار مندر۔ محلات یا قلعے تھے۔ خصوصاً جنوبی ہندوستان میں دریائے کرشنا سے سیراب ہونے والی سرزمین میں۔ وہ دریا جس کی تہ میں سے صدیوں سے جواہرات اور قیمتی پتھر ملتے رہتے ہیں۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس وقت کا شفاف پانی انسانی خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ اور اس کی تیز رَو میں ہزاروں بہادر جنگجوؤں کی لاشیں بہتی ہوئی دیکھی جاتی تھیں۔ جو اس کے کنارے پر لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ اس خطے میں احمدنگر کے حکمران اور بیجاپور کے ہندو راجہ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی۔ ہر روز نئی نئی فوجیں جنگ میں لائی جاتی تھیں۔ اور دونوں جانب سے نئے نئے ڈھنگ اختیار کئے جاتے تھے۔ یہ کشت و خون کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور فریقین میں سے کسی ایک کو ایک انچ بھر بڑھنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ جنگی ہاتھیوں نے اس جنگ میں نمایاں حصہ لیا۔ اور ناقابلِ ذکر تباہی پھیلائی۔ دن بھر کی جنگ کے بعد تاریک رات انسانی لاشوں کے ڈھیروں کے جلنے سے روزِ روشن میں بدل جاتی تھی۔ اور اردگرد گیدڑوں کی ہولناک چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ بہادر اور جوشِ وضع سورمے ہزاروں کی تعداد میں روزانہ قتل ہو رہے تھے۔ حتٰی کہ دونوں فریقوں نے اس ہولناک تباہی کے بے نتیجہ ہونے کو محسوس کیا۔ اور صلح کی شرائط طے کرنے کے لئے سفیر منتخب کئے گئے۔ ایک ہفتہ کی نتیجہ خیز گفت و شنید کے بعد شرائطِ صلح کی تجویز مکمل ہو گئی۔ بلکہ اس دوستی کو دو شادیوں سے استوار کیا گیا۔ نظام شاہ کے لڑکے کی شادی بیجاپور کے شاہزادہ کی بہن سے ہوئی۔ اور اس کی لڑکی شہزادی چاند کی شادی شہزادہ بیجاپور کے ساتھ کی گئی۔ یہ شہزادی نو سال کی عمر میں بیجاپور کی ملکہ بنا دی گئی۔ ننھی شہزادی کو ہاتھی پر سوار کر کے لایا گیا۔ اور اس تقریب کو نہایت تزک و احتشام سے منایا گیا۔ ملکہ چاند آگے چل کر اپنے خاوند کی حقیقی رفیق ثابت ہوئی۔ اور ہر حال میں اسکی شریک رہی۔ اسکی طبیعت قدرتاً شکار اور کھلی ہوا میں ورزش کی طرف راغب تھی۔ وہ ایک بے خطا تیر انداز تھی۔ اور ایسی شہسوار تھی۔ کہ سرکش سے سرکش گھوڑوں کو رام کر لیتی تھی۔ ببر کے شکار میں وہ اسقدر بے باکی دکھاتی تھی۔ کہ اس کی بے پروائی کو دیکھ کر اس کے ساتھیوں کے دل خوف سے دھڑکنے لگتے تھے۔ اکثر اوقات وہ شیر کو موقعہ دیتی تھی۔ کہ وہ اس ہاتھی پر جس پہ وہ خود سوار ہوتی۔ حملہ کرے۔ اور پھر اُسے برچھے سے مار گراتی۔ فنِ حرب میں بھی وہ کسی سے کم نہ تھی۔ اور بہت سی لڑائیوں میں اپنے خاوند کے ساتھ شامل رہی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس کی مردانگی سے اس کی نسوانی عظمت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ وہ ہمیشہ اس بات کی خواہاں تھی۔ کہ ہر بات میں دوسروں سے سبقت لے جائے۔ وہ ایک بے مثل زباندان تھی۔ اور فارسی، ترکی، عربی فصاحت سے بول سکتی تھی۔ ان صفات کی وجہ سے اس کا وقار بہت بڑھ گیا تھا۔ اور ممالکِ غیر کے سفیروں کی حیرت کی کوئی حد نہ رہتی۔ جب وہ ان سے انکی اپنی زبان میں گفتگو کرتی تھی۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کی مصورہ تھی۔ خصوصاً پھولوں کے نقش بنانے میں۔ شاعری اور موسیقی سے اسے قدرتی شغف تھا۔ اکثر اوقات رات کی خاموشی میں اس کے محل سے ستاروں کے دلنواز نغمے سنائی دیتے تھے۔ جب کہ ملکہ نرم گدیلوں پر سہارا لئے اپنے محبوب ساز سے کھیلتی رہتی تھی۔ اسطرح اس کی زندگی نہایت آرام سے گذر رہی تھی۔ صرف اولاد کے نہ ہونے سے اسکی تمام خوشیاں مفقود ہو رہی تھیں۔ شادی کے سولہ سال بعد جب وہ ولیعہد کی پیدائش سے مایوس ہو گئے۔ تو بادشاہ نے اپنے بھتیجے ابراھیم کو متبنّٰی بنا لیا۔

اس کے بعد جلدی ہی بادشاہ فوت ہو گیا۔ اور یہی وہ وقت تھا۔ جب کہ چاند سلطانہ کی زندگی کے تاریخی دور کا آغاز ہوا۔ وہ نابالغ ولیعہد کی سرپرست بن گئی۔ اور اپنے خاوند کی رفاقت میں امورِ سلطنت کے متعلق اسکی واقفیت اتنی وسیع ہو چکی تھی۔ کہ اس ذمہ واری کا سوائے اس کے کوئی اور بہتر اہل نہیں تھا۔ اسے سلطنت کے سرداروں میں سے ہر ایک کی خصلت کا علم تھا۔ اور اپنی خداداد ذہانت سے وہ ان کے درمیان اتفاق قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ تاہم بادشاہ کی موت سے انکی ذہنیتیں بدل گئیں۔ اور بہت سے امرا کے دل میں حصولِ جاہ کی ناجائز خواہشوں کے ساتھ ساتھ حسد اور کینہ کے شیطانی جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ اور بالآخر چاند بی بی کی کوشش کے باوجود ملک کی پُر امن فضا مکدر ہو گئی۔ خاوند کے ساتھ سولہ سال کی بسر کردہ حکومت نے اسے بتا دیا تھا۔ کہ جب تک رعیت اپنے سرداروں کی قیادت میں منظم ہو۔

چاند بی بی معرکہ کارزار میں

دہترا کی گرفتاری

مگر بعبت نے صبر و تحمل اور اعتماد کا اظہار نہ کیا۔ اور بدامنی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اکبر نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس موقعہ کو فوج کشی کے لئے مناسب
بال کیا۔ حملہ آور فوج کے مقابلہ میں قلعے اور شہر بغیر کسی مدافعت کے فتح ہوتے گئے۔ ملکہ کو دربار مصاحبین صحیح مشورہ نہیں دیتے تھے۔ اور اس کے لئے انکی سچائی پر یقین کرنا مشکل ہو گیا
ا۔ گردش کے ایام میں صرف مذہب ہی انسان کی آخری تسکین کا موجب ہوتا ہے۔ اور ملکہ بھی راسخ الاعتقادی سے نماز اور دعاؤں میں عجز و انکسار سے مشغول ہو گئی۔ مگر
بے سود۔ شہنشاہ اکبر کی فوجیں قریب تر آرہی تھیں۔ اور اسکی فوج کا بیشتر حصہ شاہی قلعہ کو چھوڑ گیا تھا۔ مدافعت کی امید منقطع ہو چکی تھی اور صرف گنتی کے آدمی اس کے ساتھ
گئے تھے۔ جو آخر دم تک اس کی حمایت پر آمادہ تھے۔ انہیں میں جنرل جہانس خان بھی تھا۔ اس نے التجا کی کہ ملکہ اپنی اور جوان بادشاہ کی جان بچا لے۔ اس نے کہا کہ میں نے
ب انتظامات کر دیئے ہیں۔ اور میرے وفادار سپاہی آپ کے ساتھ رہینگے۔ تب تک کہ آپ خطرہ سے نکل جاویں۔ ہم عزت کے لئے مدافعت کریں گے۔ اور
ممکن ہوا تو کسی ایسی مفاہمت کا انتظام کر لینگے۔ جس سے سب کی جانیں بچ جائیں۔ رہا خزانے کا سوال سو اسے برباد ہونے دیا جاویگا مضائقہ نہیں۔

چاند سلطانہ نے وفادار جرنیل کی محبت آمیز تجویز کو افسردگی آمیز مسکراہٹ سے سنا۔ مگر اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے صاف کہہ دیا۔ کہ اس وقت ان
ن نثاروں کو چھوڑ دینا جنہوں نے مصیبت کے دنوں میں اس کا ساتھ دیا۔ بے عزتی کا مترادف ہوگا۔ اس ملکہ کی نسبت دنیا کیا کہے گی جس نے مردانگی سے خونخوار
لوں میں شرکت کی۔ مگر بالآخر اپنی جان بچانے کے لئے سب کو تباہی کے منہ میں دھکیل کر خود رات کی تاریکی میں بھاگ گئی۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اگر موت کا وقت
پہنچا ہے۔ تو آنے دو۔

یقیناً اس کا آخری وقت قریب تھا۔ دور سے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ جو کھلی بغاوت کا ایک اعلان تھا۔ ہجوم جو مفسدوں کی دروغ بافیوں کے زہریلے
سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ ملکہ کے محل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور اس نے دیوانگی کے جوش میں شاہی محافظوں کو بھی مار ہٹایا۔ انکا جنون اس حد تک بڑھ گیا تھا۔ کہ وہ انتقام
ہ تشنگی بجھانے کے لئے کسی شکار کے متلاشی تھے۔ اور اگرچہ انفرادی طور پر ان کے دل اب بھی انسانیت کے جذبہ سے عاری نہ تھے۔ مگر بہیمانہ جوش میں قتل پر آمادہ تھے۔
لکہ کہاں ہے کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ مگر ان کی ضرورت نہ تھی۔ چاند سلطانہ تخت کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ اور وہ خوبصورتی۔ غم اور عظمت
ایک مجسمہ دکھائی دیتی تھی۔ اسے معلوم تھا۔ کہ اس کا آخری وقت آپہنچا ہے۔ اور وہ بہادری سے اس کے لئے تیار تھی۔

ہجوم کے ہاتھ میں تلواریں تھیں۔ مگر ایک لمحہ کے لئے سب سے آگے والوں کے قدم ملکہ کی پر عظمت شخصیت کے رعب سے رک گئے۔ مگر پیچھے سے ایک ریلا
ریلا آیا۔ حملہ آور چاروں طرف سے جھپٹ پڑے۔ تلواریں چمکیں اور بعد ایک لمحہ کے چاند سلطانہ زمین پر گر پڑی۔ اس طرح لوگوں نے ایک ناعاقبت اندیش انتقام لیا۔
ایک عظیم الشان ہستی کا خاتمہ کر دیا۔

(مترجمہ)

عشق سے پہلے بھی یہ گھر بس کے اُجڑا ہے کبھی ٭ دامنِ عقل و خرد کی دھجیاں پاتا ہوں میں !

(۱)

دسمبر کی شام تھی۔ باغ کے درخت ایک دوسرے کی عریانی سے محجوب ہو کر تاریکی کے سیاہ پردہ میں منہ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور تند و تیز ہوا سوکھے ہوئے پتوں کو اِدھر اُدھر اُچھال رہی تھی۔

اوپر کی منزل کی ایک کھڑکی کھلی۔ بجلی کی تیز روشنی جھپٹ کر باہر نکلی۔ مگر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ٹھٹک کر رہ گئی۔ باد شمالی کا یخ بستہ جھونکا دندناتا اندر گھس آیا۔ انگیٹھی میں سلگتے ہوئے کوئلے بھڑک اُٹھے۔ اور شعلوں کے عکس دروازے کے پردوں پر کانپنے لگے۔ حمید نے اپنے کوٹ کے اندر سکڑتے ہوئے کہا۔

"اس وقت ہوا خوری کی بھی عجیب سوجھی"

نصیر نے باہر جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ تمہاری ہر روز کی سرائی نے دماغ پریشان کر دیا ہے۔ تم ایسا ضدی آدمی کہیں نظر نہ آئے گا۔ میرا کہا نہیں مانتے۔ تو ادھر آؤ۔ فطرت کی زبان سے اپنے اصولوں کا ثبوت پیش کروں۔ نصیر کا لہجہ اسقدر سنجیدہ تھا۔ کہ حمید صوفے سے اُٹھ کر اس کی اوٹ میں آ کھڑا ہوا۔ اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ "تم اپنی ہر ایک عجیب حرکت کو اپنے بازار اعتبار سے پیش کرتے ہو۔ کہ ہنسی میرے لبوں تک آ کر چہرے پر پھیلنے سے پہلے غائب ہو جاتی ہے۔ بتاؤ۔ اب کونسی نو عجبی کا اظہار ہوا ہے ؟"

نصیر نے آہستہ سے کہنا شروع کیا "تمہیں میری رندی شرابی اور آوارہ روی پر اعتراض ہے۔ ابھی ابھی تم مجھے میری عیش پرستی اور لامذہبی پر کوس رہے تھے۔ میں نے اس سے پہلے بھی بارہا تمہیں سمجھایا ہے۔ کہ میری یہ بظاہر مذموم حرکات انتہائی غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ تم لوگ صرف ناک کی لمبائی تک دیکھ سکتے ہو معاف کرنا۔ میں بے تکلفی کا اظہار بیہودہ نہیں اُٹھاتا۔ بلکہ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ کہ تم نہایت تنگ خیال اور کوتاہ بیں ہو۔ دیکھو یہ پیڑ اور پودے جو اب بھوتوں کے سائے معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی زنگارنگ پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ یہی ہیبت ناک سائیں سائیں کرتی ہوا رنگ و بو تھی۔ اور یہاں دن رات کیف برستا تھا۔ رنگین تتلیاں جن کے نازک پر بہار کی دیوی نے قوس و قزح کی شعاعوں سے کاڑھے تھے۔ ادھر ادھر اڑتی پھرتی تھیں۔ ننھی ننھی سبز پوش چڑیاں خوشی سے چہچہاتی تھیں۔ اور درختوں کی ٹہنیاں جھوم جھوم کر ایک دوسرے سے گلے ملتی تھیں۔ خوشبو میں بسی ہوئی ہوائیں مستانہ وار اس باغ کے تختوں میں کھو جانے کی آرزو مند تھیں۔ اس میں قدم رکھتے ہوئے سوئے ہوئے محبت کے راگ کانوں میں تھرتھرانے لگتے تھے۔ اور محو شدہ تمنائیں آنکھوں کے سامنے جھلملا جاتی تھیں۔ لیکن اب"

نصیر کی آنکھیں جو گذشتہ تصور سے نیم وا ہو رہی تھیں۔ کھل گئیں۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ ہوا کی سرسراہٹ میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"اب وہی درخت ہوا کے لمس سے کانپ رہے ہیں۔ مگر کوئی اُن کی زبوں حالی سے دلچسپی نہیں۔ جسطرح بوڑھا مجسم حزاں بنکر ادھر ادھر پھرتا ہے۔ مگر نوخیز لڑکے اس کے سانسوں کی خنکی کو محسوس نہیں کرتے۔ بیچارے کے افسردہ خدمات کے بعد دیگرے اس کی بے نور آنکھوں کے سامنے ٹھٹھر ٹھٹھر کر فنا ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ چٹان پر بیٹھا سیڑھیوں کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ اور نوجوان آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے۔ وہی ہرے بھرے پتے جو ہوا میں لہکتے تھے اب اس کے آگے سی سی کرتے دوڑتے پھرتے ہیں۔ جیسے اسکے چھونے سے انہیں دکھ محسوس ہوتا ہے۔ وہی تماشائیں جو قمریوں اور بلبلوں کے زمزمے سنکر

حماقت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے۔ کہ اس کا فریب کھانے کی بجائے اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کر لیا جائے۔"

حمید اس دوران میں کئی دفعہ بولنا چاہتا تھا۔ اب نہ رہ سکا۔ اور چلا اٹھا۔

"یہ اس نامراد شوپنہار کے خیالات ہیں۔ اور خدا کی قسم تم ملحد ہو گئے ہو۔"

نصیر بے اختیار ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا۔ "دیکھا میری باتوں کا ثبوت خود تم نے دے دیا۔ مذہب کا نام لینا تھا۔ کہ رنگ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں ابل آئیں۔ دانت نکل آئے۔ مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اور میرا مہذب دوست بیٹھے بیٹھے افریقہ کا وحشی بن گیا۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں۔ کہ مذہب انسان کی حیوانیت کو زیادہ نمایاں کرتا ہے۔"

یہ سنکر حمید اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کرسی سے اپنی ٹوپی اٹھا کر کہنے لگا۔

"بس کرو مسٹر! آج تم بہکے ہوئے ہو۔ کہنا تھا۔ وہی کہہ ڈالا۔ میں جاتا ہوں۔"

نصیر نے اس کا کالر پکڑ لیا۔ اور کہا "بس چل دیئے؟"

یہ سنکر حمید ہنس پڑا۔ اور ہاتھ چھڑا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ نصیر نے کہا۔ "کل اس وقت عاقل کو بھی لیتے آنا"

"ہاں کل دونوں مل کر تمہاری خبر لیں گے۔" حمید یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔

نصیر نے اٹھ کر الماری کھولی۔ شراب کی بوتل اور ساغر نکال میز پر رکھا۔ گھڑی دیکھی اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آدھ گھنٹے کے بعد دروازہ کھلا۔ اور ساری میں لپٹی ہوئی ایک حسین لڑکی اندر داخل ہوئی۔

"الماس!" نصیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

(۲)

نو بجے کا وقت ہوگا۔ نصیر ستار بجا رہا تھا۔ اس کی نظریں تاروں پر جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ نغمے کے زیر و بم کے ساتھ جھوم رہا تھا۔ کہ موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ اس کا ہاتھ کانپ گیا۔ اور راگ ٹوٹ کر تبسم کی لہر بنکے اس کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگا۔ زیر لب کہنے لگا۔ "طوطا مینا آ گئے۔"

دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا۔ اور میاں حمید نمودار ہوئے ان کے پیچھے ہی عاقل دکھائی دیئے۔ نصیر نے اٹھ کر دونوں کا خیر مقدم کیا۔ اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ حمید نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "نصیر تم بیچ میں پڑے ہو۔ باہر نکل کر سنو۔ لوگ تمہارے متعلق کیا کچھ کہہ رہے ہیں؟"

نصیر نے اطمینان سے کہا "تمہاری ہمدردی کا شکریہ۔ مگر مجھے اپنی رسوائی کا ذرہ بھر خوف نہیں۔ اگر کوئی میری ذات سے دنیا کے تمام عیوب منسوب کرتا ہے تو کرنے دو۔ میں ایسے ناگوار خیالات کو اول تو ستار کی تاروں پر بجا بجا کر بھگا دیتا ہوں۔ اگر وہ پھر میرے دماغ میں لوٹ آئیں۔ تو مئے گلگوں کا ایک ساغر ان کو ڈبو دینے کے لئے کافی ہے۔ اگر وہ پھر بھی میرا پیچھا نہ چھوڑیں۔ تو میں انہیں کسی مہ جبیں کے گلے کا ہار کر دیتا ہوں۔"

عاقل بول اٹھا "چھوڑو بھئی ان باتوں کو۔ مجھے آج لارنس گیا تھا۔ وہاں کچھ دنوں سے ایک ستارہ آسمان سے ٹوٹ کر آوارہ پھر رہا ہے۔ تم حسن کے بارے میں تاثرات کے کچھ زیادہ قائل نہیں ہو۔ اگر آج میرے ساتھ چلو۔ تو دکھائیں؟"

نصیر نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "جانے میں مجھے کیا عذر ہے۔ مگر عاقل ان آنکھوں نے بڑے بڑے پرسامان حسن دیکھے ہیں۔ اور یہ ہاتھ سینکڑوں دفعہ حشر آرا دلبروں کی گردن میں حمائل ہوئے ہیں۔"

عاقل کہنے لگا۔ "مگر میں اس حسن کا قائل نہیں جسے تم اپنی خواہشات کی غلاظت پر چڑھا کر آلودہ کر دو۔ اور جو دوڑ کر تمہاری آغوش میں آ جائے۔"

نصیر نے حیران ہو کر پوچھا "تمہارے نزدیک حسن کی تعریف کیا ہے"

عاقل کہنے لگا "حسن وہ ہے جس میں ملکوتی تجلیاں نہاں ہوں۔ جس میں عقل و ادراک کو برباد کر دینے کی قدرت ہو۔ جو انسان کے ہوش و حواس کو جلا کر خاک کر دے۔ حسن کے ساتھ مس کرتے ہی انسان کے روئیں روئیں میں بال و پر پھوٹ پڑیں۔ اور وہ پرواز کرتا ہوا ستاروں میں مل جائے اور وہاں رہ کر ابد تک اس کے [illegible] رہیں کا مسار ہے۔"

نصیر نے کہا "یہ کسی شاعر کی نظم کے فقرے از بر کر رکھے ہیں۔ ان کو حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔"

عاقل اپنی دھن میں کہتا گیا۔ "تم سرخ و سپید رنگ کی دلکش آمیزش اور سانس و صحت کے نظر فریب امتزاج کو حسن خیال کرتے ہو۔ جسے دیکھتے ہی تمہاری دبی ہوئی خواہشات بھڑک اٹھیں۔ جو غلامانہ انداز سے تمہاری طرف اطاعت آمیز نگاہوں سے دیکھے۔ حقیقی حسن غرور و تمکنت کا دوسرا نام ہے۔ وہ عورت جو اپنے حسن سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اور اس کی بے پناہ قوتوں کا استعمال جانتی ہو۔ دنیا کی ماہر ترین ہستی ہے۔ حسن اسی وقت تک حسن ہے۔ جب تک وہ خوددار اور پر وقار رہے۔ ادھر وہ مطیع اور تابع ہوا۔ ادھر اس کی جادو بھری قوت فنا ہو گئی۔"

نصیر بے پروائی سے کہنے لگا۔ "اس قسم کا موہوم حسن تمہیں اس دنیا میں کہیں نہیں ملیگا۔ جو انسانی نظروں کے سامنے ظاہر ہو کر کبھی ابتداً قائم رکھ سکے۔ حسین عورت کی طرف دیکھ کر شروع شروع میں ایک قسم کا رعب ضرور چھا جاتا ہے مگر یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔ وہ خود اس بات کے لئے بے تاب ہوتی ہے۔ کہ دیکھنے والے کی پرسوز نگاہوں میں گم ہو جائے۔ تم ابھی بچے ہو۔ جو حقیقی دنیا میں رہ کر خوابوں میں الجھے پھرتے ہو۔ اب مجھے سرد دلی سی لاحق ہو چلی ہے۔ اور شباب کا جوش و حرارت بھی قدرے ماند پڑ گیا ہے۔ مگر آغاز شباب کے طوفانی زمانے میں جب کبھی میں اپنی محبوبہ کے سامنے اظہار عشق کرتا تھا۔ تو محسوس کرتا تھا۔ کہ اس کے گرم سانسوں میں خطرناک شعلے لپٹے ہوئے ہیں۔ حسن کی حدت سے میرا خون گھل کر بہہ جائے گا۔ گو وہ دزدیدہ نگاہ سے دیکھ کر شرم سے دوسری طرف منہ پھیر لیتی تھی۔ مگر میں جانتا ہوں۔ کہ اس وقت اس کی دلی تمنا یہ ہوتی تھی۔ کہ کوئی اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں مسل کر کچل کر رکھ دے۔ وفور جذبات سے اس کی رگیں دکھنے لگتی تھیں۔ اور اس کے ہونٹ اس پیاس سے خشک ہو جاتے تھے۔ جسکو دنیا کے تمام سمندر بھی ملکر نہیں بجھا سکتے۔ میرے خیال میں حسن اس حالت میں اپنا صحیح جلوہ دکھاتا ہے۔"

"ٹھہرو ٹھہرو" عاقل نے تیزی سے کہا۔ "تم ایک مقدس پاکیزگی کی توہین کر رہے ہو۔ اناطول فرانس نے کہا ہے حسن کی دیوی کی بے حرمتی مت کرو۔ اس کا انجام سیاہ ہوتا ہے"۔

نصیر نے متبسم ہو کر جواب دیا "میں اس سے کیا ڈرونگا۔ جسے اپنے سامنے فرش پر پامال ہوتے دیکھتا ہوں۔ جس نے اپنی ملتجی نظروں سے اپنی طرف عاجزانہ انداز سے دیکھتے ہوئے ملاحظہ کیا ہے۔ میں نے اس معصوم حسن کو بھی دیکھا ہے۔ جو ناواقفیت کی وجہ سے طبعی وجدان کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ آگاہ حسن بھی دیکھا ہے۔ جو اپنی تمام قہرسامانیوں اور ہلاکت آفرینیوں کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اور آن واحد میں ناظر کو شکار کر لیتا ہے۔ مگر پھر یک آکر خود ہی اپنے شکار کے سامنے اپنی گرفتاری کے لئے التجا کرتا ہے۔"

حمید نے جلدی سے کہا "لو چھوڑو زیادہ باتیں مت بناؤ۔ ہر موقع پر تم اپنی اہمیت جتائے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

عاقل کہنے لگا "یہ ان کے بس کی بات نہیں۔ یہ باتیں کرتے ہیں تو دل ہی دل میں ڈرتا ہوں کہیں ان کا مسموم اثر مجھ پر مسلط نہ ہو جائے"

نصیر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا "تم ابھی جذبات کا مرقع ہی ہو۔ اٹھو۔ لارنس چلیں۔ یوں ہی بے حرکت بیٹھے رہو گے۔ تو وہ ضرور تمہارے دل کی گہرائیوں تک سرایت کر جائیں گی"

یہ کہتے ہوئے اس نے کپڑے پہنے اور تینوں دوست باغ کو چلے گئے۔

(۳)

وہ لارنس پہنچے۔ تو انگریزی باجے کی آواز آ رہی تھی۔ حمید کی کھچوں والی رگ تڑپ اٹھی۔ کہنے لگا: "میں تو بینڈ کے پاس جاتا ہوں"۔ عاقل نے ادھر ادھر دیکھ کر نصیر سے کہا۔ "ابھی اختر جمال کا ظہور نہیں ہوا۔ آؤ حمید کے ساتھ چلیں۔" نصیر نے اطمینان سے کہنے لگا۔ "تم جاکر اچھل کود آؤ میں ذرا چہل قدمی کر کے آؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف نکل گیا۔ لوگ ہاتھ میں ہاتھ دیئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ بعض بے فکرے گھاس پر بیٹھے ہوئے کسی مذہبی موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ اور صحیح صحیح باتیں کر رہے تھے۔ نصیر ان سب پر نگاہ حقارت ڈالتا ہوا آگے چلا گیا۔

زرد دھوپ نے اداسی کا عالم پیدا کر رکھا تھا۔ سدابہار درخت حیران دیدہ دستوں سے دامن سمیٹ کر کھڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور چڑیاں کیڑوں کی تلاش میں سوکھی ہوئی گھاس پر ٹھونگیں مار رہی تھیں۔

نصیر نے سامنے کے موڑ پر جا کر اطمینان کا سانس لینا چاہا۔ مگر وہ اس کے سینے میں گھٹ کر رہ گیا۔ اور وہ جہاں کھڑا تھا ٹھٹک کر رہ گیا۔

درختوں کے جھنڈ میں بنچ پر ایک لڑکی متفکرانہ انداز سے ٹھوڑی کو ہاتھ کی ٹیک دیئے بیٹھی ہوئی تھی۔

کسی اعجاز نگار مصور کے موقلم کے لئے یا کسی شاعر کے حساس دل کو تڑپا دینے کے لئے اس سے زیادہ موزوں تر کوئی دوسرا منظر نہیں۔ جب کوئی حسینہ تنہائی میں بے خبری و سادگی کے ساتھ ساتھ بہاری دیرکاری کی سحرکاریاں سمیٹ کر بیٹھی ہوئی ہو۔ اس کے چہرے کی سپیدی پر ہلکی ہلکی سرخی دیکھ کر معصومیت پرستان کے تصرف کا احساس ہوتا تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا برقعہ پہن رکھا تھا۔ جس کا نقاب الٹ دیا گیا تھا۔ دریائے نیل کے پانی میں ماہتاب کا عکس ایسا دلربا نہ ہوتا ہوگا۔ جیسا وہ چہرہ نیلے برقعہ میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے سر کے گرد اگرد سماوی تجلیوں کا ہالہ تھرتھرا رہا تھا۔ وہ وینس کے اس مرمریں مجسمے کی طرح ساکت و صامت بیٹھی ہوئی تھی۔ جو صدیوں تک حرم میں اپنے حسن کا نظارہ کرتا رہتا ہے۔ مگر سیر نہیں ہوتا۔ اس کے نازک ہونٹوں کو دیکھ کر اس آتشیں دہکتے ہوئے لالے کا عکس یاد آتا تھا جس نے فردوس

اور کاش کہ میں موت تک اس میں مبتلا رہتا۔" یہ کہکر اس نے ایک سرد آہ کو چائے کے گھونٹ سے نیچے دبا دیا۔

حمید جو حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خوشی سے اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اور کہنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے تم اپنی حرکات ناشائستہ سے تائب ہوگئے۔ اور تمہارے ریگزار دل پر اس کی رحمت نے نزول فرمایا۔ آخر میری کاوشیں تمہیں راہ راست پر لے آئیں۔

ایک لحظہ کے لئے نصیر کی مردہ آنکھوں میں کھوئی ہوئی ظرافت کی روشنی کوند گئی۔ کہنے لگا۔

"تم ایسے ریاکار کی بے سروپا باتیں مجھے کیا راہ راست پر لائیں گی۔" وہ حمید کے پھیلائے ہوئے منہ کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ میں اس کے چہرے پر پریشانی اور اداسی چھا گئی۔

حمید نے اس کی طرف نیم تیز نگاہوں سے دیکھا۔ اور جھلا کر کہنے لگا "درست ہے تم ایسے رند لم یزل کو دنیا کی کوئی چیز متاثر نہیں کرسکتی۔ میرے چھیڑنے کی خاطر آج یہ نئی مذاق سوجھی ہوگی۔

نصیر نے کہا "حمید ایک نظر میری طرف دیکھو۔ کیا تم آج مجھے مذاق کرنے کے قابل سمجھتے ہو؟"

یہ کہہ کر اس نے جھکا ہوا چہرہ عین اس کے بالمقابل کر دیا۔ حمید نے اس کے زرد رخساروں پر حزن و ملال کے ایسے گہرے تاثرات دیکھے کہ کچھ عرصہ بے اختیار اس کی طرف دیکھتا رہا۔ نصیر نے چائے کی پیالی ہاتھ سے رکھ دی۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی انتہائی آرزو تھی۔ کہ دوست کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کردے۔ مگر اس کی خودداری نے اجازت نہ دی۔ وہ حمید کی کرسی کے پاس ذرا ٹھہرتا پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ جاتا۔ حمید اس کے رویئے پر تعجب کر رہا تھا۔ معاً اُسے ایک خیال سوجھا کہنے لگا۔

"نصیر رات کو عاقل سے ایک عجیب انکشاف ہوا۔"

نصیر نے بے پروائی سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا "کیا؟"

حمید نے کہا "تمہیں یاد ہوگا۔ کل ہم نے لارنس میں ایک برقعہ پوش حسینہ دیکھی تھی"۔

نصیر اس کی پشت پر آکر چلتا چلتا رک گیا۔ اس کا چہرہ زرد سے سپید ہوگیا۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا "ہاں"

حمید اسے متوجہ پاکر کہنے لگا۔

"آج صبح میں مشکل بستر سے اُٹھا ہی ہوں گا۔ کہ عاقل ہانپتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ بیٹھتے ہی کہنے لگا۔

"حمید تمہیں وہ شکل یاد ہوگی جس پر کل باغ میں ہم دونوں ریجھ رہے تھے۔" میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا۔

"کل میں تمہیں رخصت کرکے اور کھانے سے فارغ ہوکر سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ اور وہاں جاکر اخبار دیکھنے لگا۔ آدھ گھنٹے سے کچھ ہی زیادہ وقت گذرا ہوگا۔ کہ کشنو نے آکر کہا۔ سیٹھ کریم الدین کے گھر سے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ کہہ رہے ہیں۔ آکر مل جائیے۔ تم جانتے ہو وہی سیٹھ صاحب جو اپر مال پر رہتے ہیں۔ اور ابا جی کے بڑے عزیز دوست ہیں۔ انکی ہماری مدت سے ملاقات ہے۔ میں خالہ جی کو سلام کرنے اندر گیا۔ دیکھتا کیا ہوں۔ کہ وہی نیلم پری امی کے پاس بیٹھی ہے۔ اس نے مجھے دیکھ کر پردہ نہیں کیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا۔ کہ وہ شروع سے پردہ کرنے کی عادی نہیں بلکہ جب سے پنجاب میں آئی ہے۔ ماموں کے اصرار سے برقع پہننا شروع کیا ہے۔

میں اپنی جگہ ششدر کھڑا ہوا تھا۔ کہ خالہ کی آواز نے چونکا دیا۔ بڑھ کے سلام کیا مزاج پرسی کے بعد کہنے لگیں۔

یہ سیٹھ جی کی بھانجی راشدہ ہے۔ جو ماں باپ کی وفات کے بعد چچا کے پاس رہتی تھی۔ اب سیٹھ جی نے اسے یہاں بلا لیا ہے۔ ہفتہ عشرہ ہوا۔ کہ مدراس سے آئی تھی۔ آج کام سے فرصت ہوئی۔ تو میں نے کہا چلو باجی سے تمہیں ملا لاؤں۔ میں تھوڑا عرصہ حاضر رہ کر اُٹھ آیا۔ حمید قسم لے لو۔ ساری رات ایک پل آنکھ نہیں جھپکی۔ اس کی دلکش صورت آنکھوں کے سامنے رہی۔ صبح ہوئی تو اس خیال سے اٹھ کر تمہارے پاس دوڑا آیا۔ کہ اس کی باتیں کرکے دل بہلاؤں"

"نصیر کیا یہ عجیب اتفاق نہیں" اس نے گردن پیچھے موڑ کر کہا۔

"واقعی" نصیر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

حمید ہنس کر کہنے لگا۔ "اور لطف یہ ہے۔ کہ میاں عاقل اس کے تیر نگاہ کے بُری طرح گھایل ہوگئے ہیں۔ نصیر تم تو کہا کرتے تھے۔

کہ عشق اور عقل قیامت تک نہیں مل بیٹھیں گے۔ مگر یہاں دیکھو ہمارا دوست عاقل بھی ہے اور عاشق بھی"

نصیر نے خشک لہجہ میں کہا۔ "کبھی کبھی ایسا ہو جایا کرتا ہے"

حمید نے اپنی لفاظی کی کماحقہٗ داد نہ پا کر مردل سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا۔ "تمہاری طبیعت ناساز ہے۔ تم آرام کرو۔ میں جاتا ہوں۔"

یہ کہا اور نصیر سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔

(۵)

"قاہرہ کی ایک رات" کا سہ ادن تھا۔

پہلا سوختہ ہوا۔ تو لوگ جلدی جلدی باہر نکلنے لگے۔ کالج کے بعض لڑکے صحن میں کھڑے ہو کر بلم پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کوئی کہتا عربوں کی معاشرت غلط دکھائی گئی ہے۔ کوئی کہتا "ڈائرکٹر مدہوش تھا" ایک انگریز عورت کے پاس کھڑا ہوا لڑکا جس کی آنکھوں کے سامنے ابھی تک تصویر کے ساطے پھر رہے تھے۔ کہنے لگا۔ "اماں! وہ لڑکی بلیک شیخ والے کے ساتھ کیوں چلی گئی؟" یہ سنکر اسکی ماں ہنس پڑی۔ اور کھینچ کر اسے دوسری طرف لے گئی۔

"اُف کتنا ہجوم تھا" دروازے کے پاس کونے میں کھڑا ہوا نصیر کہہ رہا تھا۔ "جیسے ناحق یہاں کھینچ لائے"

عاقل جو پاس ہی کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ "حمید نے مجھے بتایا۔ کہ تم دن رات اندر گھسے رہتے ہو۔ خالہ صاحبہ آج یہاں آنا چاہتی تھیں۔ میں نے کہا۔ حمید اور نصیر کو بھی ملالوں۔ وقت اچھا کٹیگا۔ آؤ، چلیں"

یہ کہکر وہ باہر نکل کر موٹر کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا۔ "تشریف لے آئیے"

دو برقعہ پوش عورتیں باہر نکلیں۔ حمید ان کو گیلری پر لے گیا۔ نصیر اور حمید بھی ان کے پیچھے چلے۔ داہنی طرف کی نشستوں پر عورتیں بیٹھ گئیں۔ اور بائیں طرف تینوں دوست ہو بیٹھے۔ حمید نے نصیر کے کان میں کہا۔ "دیکھا!"

"ہاں" نصیر نے آہستہ سے جواب دیا۔ عاقل خالہ سے باتیں کرنے لگا۔ مگر اس کی نظریں ساتھ والی کرسی کا طواف کر رہی تھیں۔ وہاں بیٹھی ہوئی خاتون نے نقاب اُلٹ دیا تھا۔ مگر رخ دوسری طرف ہونے کی وجہ سے وہ نظروں سے پوشیدہ تھی۔ نصیر اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر عاقل کی طرح مایوسی کی جھلک نہیں تھی۔ بلکہ خلاف معمول اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ حمید نے دو دفعہ اسے مخاطب کرنا چاہا۔ مگر کوئی جواب نہ پا کر پیچھے دیکھنے لگا۔

اتنے میں تاریکی ہو گئی اور سب نگاہیں پردہ کی طرف اٹھ گئیں۔ مگر نصیر برابر اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عرصہ تک دنیا و مافیہا سے بے خبر اسے خیالات میں مستغرق بیٹھا رہا۔ یکایک وقفہ کے لئے روشنی ہوئی راشدہ نے برقع اتار کر اوپر رکھا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بھڑک اٹھا۔ اور نصیر کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

اسے سن سٹھائی نے کہا۔

"لڑکی منہ کیوں کھولے بیٹھی ہے" یہ سنکر راشدہ کی صاف شفاف مہتابی پر بل پڑ گیا اور اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے برقعہ اوڑھ لیا۔

اتنے میں کھیل دوبارہ شروع ہوا۔ نصیر ناامید سا ہو کر سامنے دیکھنے لگا صحرائے لق و دق میں ریت کے ذرے چمک رہے تھے۔ اور اونٹ کھجوروں کی تلاش میں گردنیں ڈھاڑھا کر دیکھ رہے تھے۔ سطح ریگزار پر ان کے پاؤں کے نشان محبت بھرے سینے میں شک و شبہ کے پہلے تاثرات کی طرح دھندلے نظر آرہے تھے۔ نخلستان قریب آگیا۔ تو ساربان نے ایک حسین عورت کو نیچے اتارا۔ وہ بے قرار ہو کر چشمے کی طرف بڑھی۔ مگر ساربان نے اسے روک لیا۔ اور کہنے لگا۔

"پہلے اونٹ۔ پھر مرد۔ پھر عورت"

دائیں طرف سے ایک نسوانی آواز آئی "خود غرض مرد"

یہ سنکر نصیر کے سراپا میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اس کے دل نے نامعلوم طور پر ان الفاظ کی صداقت کا اعتراف کیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے یہ مختصر مگر بلیغ فقرہ ایک سوال تھا۔ جو اس کی گذشتہ زندگی کے ہنگامہ پر فیصلے پر کسی کاتب اعمال نے قائم کیا۔

تصویر ختم ہوئے پر سب باہر نکلے۔ آدھی رات جا چکی تھی۔ اور سردی کے مارے ستارے ایک دوسرے کے پیچھے چھپتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ نصیر نے دوستوں سے رخصت ہو کر اونگھتے ہوئے شوفر کو جگایا۔ اور گھر کی راہ لی۔

(۶)

شام کا جھٹپٹا رات کی گہری سیاہی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ باد شمالی کے تند جھونکے کھڑکی کے شیشوں سے سر ٹیک رہے تھے۔ نصیر قدآدم

کے سامنے کھڑا ہوا۔ اپنا ولندسیاہ سوٹ ریب تن کر رہا تھا۔ جب ادھر ادھر دیکھ کر ہر طرح کا اطمینان ہو گیا۔ تو وہ اپنے خوبصورت مگر اداس چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ جو کثرت تمباکو نوشی سے گہرا سرخ ہو رہا تھا۔ اب سفیدی مائل زرد تھا۔ اور سیاہ کپڑوں کی نسبت سے خوب چمک رہا تھا۔ ابھی وہ اس جگہ کھڑا تھا۔ کہ حمید مسکراتا ہوا داخل ہوا۔ نصیر نے پیچھے مڑے بغیر کہا "تیار ہو آئے" حمید اس کے کندھے کے پاس آکر کھڑا ہوا۔ اور آئینہ دیکھ کر کہنے لگا۔

"بھئیا نصیر بڑی مدت کے بعد آج تمہیں اپنے اصلی رنگ میں دیکھا ہے۔ اس وقت تمہارا چہرہ بلا کا دلکش ہے۔"

"بناتے ہو" نصیر نے متبسم ہو کر کہا۔

حمید نے پرجوش آواز میں کہا "واللہ سچ کہتا ہوں۔ پچھلے دنوں ناسازیٔ طبع کے باعث تم بہت لاغر ہو گئے تھے۔ آج تمہاری صحت میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔"

"ادھر آؤ بیٹھیں" نصیر نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

حمید رسٹ واچ دیکھ کر کہنے لگا۔ "بیٹھنے کا وقت کہاں۔ بس پچیس منٹ تو باقی ہیں۔ مہمان جا رہے ہوں گے۔"

نصیر نے کہا "اچھا چلتے ہیں۔ یہ تو بتاؤ کس کس کو مدعو کیا گیا ہے"

حمید سوچ کر کہنے لگا۔ "ہمارے دوستوں میں خود سید مظہر، ساجد اور نعیم کے نام مجھے یاد ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ صاحب کے احباب بھی آئیں گے۔ جن میں سیٹھ کریم الدین اور آغا علی حیدر کو میں جانتا ہوں۔"

یہ کہہ کر حمید دروازہ کی طرف بڑھا۔ نصیر بھی اس کے پیچھے نیچے اتر گیا اور دونوں موٹر میں بیٹھ کر عاقل کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو ان کے پیچھے ایک اور موٹر آکھڑی ہوئی۔ سیٹھ کریم الدین دو تین عورتوں کے ساتھ باہر نکلے۔ خواتین زنانہ میں چلی گئیں۔ نصیر اور حمید کھانے کے وسیع اور آراستہ کمرے کی طرف بڑھے۔ عاقل نے نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اور مناسب جگہوں پر بٹھا دیا۔

حمید نے بیٹھتے ہوئے نصیر کے کان میں کہا۔

"تم نے دیکھا عاقل نے نیلا سوٹ پہن رکھا ہے"

نصیر نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اچھا یہ بات ہے"

عاقل نے نشستوں کا انتظام اس طریقہ سے کیا تھا۔ کہ اس کے سارے دوست ایک طرف بیٹھ گئے۔ اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ کھانے کے دوران میں ساجد نے عاقل سے کہا "نصیر کی دلچسپی کا سامان بھی بہم پہنچایا ہوتا۔ دیکھتے نہیں بیچارہ چپ چاپ بیٹھا ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔" یہ سن کر سب ہنسنے لگے۔

عاقل نے آہستہ سے پوچھا "پیو گے؟"

نصیر نے شرمیلے انداز سے کہا "عنایت! مگر میں نے ترک کر دی ہوئی ہے۔"

"جھوٹ" ساجد بول اٹھا۔ اور کئی حیران نگاہیں اس کے چہرے پر پڑیں۔

"ایمان سے سچ کہتا ہوں؟" نصیر نے کہا۔

عاقل حمید کی طرف پرمعنی نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا۔

"تعجب ہے اب تو پورے مومن بن گئے۔ یہی کچھ ہفتہ عشرہ پیشتر خانۂ کعبہ اور محبوب جواں سال کی قسمیں اٹھایا کرتے تھے۔"

حمید کہنے لگا۔ "میں خود حیران ہوں یہ صدق دل سے اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہیں یا سیراب شدہ ذوق کو از سر نو تند و تیز کرنے کے لئے پرہیزگار بن بیٹھے ہیں۔"

نعیم نے کہا "نہیں حمید ابھی وہ زمانہ دور ہے۔ شباب کو ان حسینوں کی کیا حاجت ہے۔ بات یہ ہے۔ کہ پہلے سے زیادہ تجربہ کار ہو گئے ہیں اور بادہ کاری کا یہ سبق انہوں نے دن رات کی صحبت سے سیکھا ہے۔"

اس پر سب ہنس پڑے حمید کے چہرے کا رنگ خفت سے اڑ گیا۔

اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ کھانے کے بعد مظہر جو عمر میں سب سے چھوٹا تھا اور ابھی تک خاموش بیٹھا تھا۔ نصیر کی طرف دیکھ کر منت کے انداز سے کہنے لگا۔ "بھائی جان عرصہ ہوا آپ نے کچھ نہیں سنایا۔ آج مہربانی کر کے ایک دو غزلیں تو سنا دیجئے!"

اس پر ساجد بول اٹھا "شاباش مظہر خوب سوجھی اللہ اور نعیم اس کے سامنے رکھو۔"

ساجد نے یہ فقرہ بلند آواز سے کہا تھا۔ آغا علی حیدر جو کمرے کے دوسری طرف عاقل کے والد سے مصروف گفتگو تھے چونک کر منہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"میاں نصیر ضرور کچھ دیر شغل کیجئے۔ میں تو ان کی سیاسی بحثوں سے اکتا گیا ہوں"

نصیر جو دوستوں سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا تھا مجبور ہو گیا۔ نعیم نے ہارمونیم اٹھا کر اس کے سامنے

نصیر نے اسے درست کرکے یہ غزل شروع کی ؎

ہجومِ درد میں اور خندہ ہائے زیرِ لبی — یہ فیضِ غم ہے یہ ہے لذتِ جفا طلبی
ہزار عشق ہو وارفتۂ جنوں لیکن — حریمِ حسن میں جائز نہیں ہے بے ادبی
بڑھا نہ ساغرِ رنگیں کی طرف دستِ ہوس — کہ اہلِ بادہ کشی ہے یہ کیفِ تشنہ لبی
تلاشِ منزل و فکرِ وصال و شکوۂ ہجر — یہ سب ہیں اے دلِ مضطر دلیلِ کم طلبی
فضائے عالمِ جاں مشتعل ہے جس سے تمام — وہ برقِ نغمہ ہے میری نوائے زیرِ لبی

عطا کیا ہے مجھے غم نے اک گدازِ لطیف
نہ نالۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی

(۷)

سورج طلوع ہو چکا تھا۔ مگر کہر کی وجہ سے چاروں طرف دھندلکا سا چھایا ہوا تھا۔ اس میں سے سورج کی کرنیں چھن کر نکلنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ راشدہ شال لپیٹ کر کرسی پر بیٹھی ہوئی کتاب دیکھ رہی تھی جب ایک صفحہ پڑھ چکی تو اسے کو ہاتھ سے رکھ کر کہنے لگی "کیسا عجیب فقرہ ہے۔ محبت اس روشن قطبی تارے کی طرح ہے۔ جس کی طرف دیکھ کر صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے بدو رات کی تاریکی میں اپنا راستہ ڈھونڈ لیتے ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے وہ کرسی پر دراز ہو گئی۔ اور آنکھیں بند کئے ہوئے دیر تک اپنے خیالات میں غرق رہی۔ اندرونی جذبات کی کشمکش کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔ کبھی سُرخ رنگ اس کے رخساروں پر جمع ہو کر دوڑنے لگتا۔ کبھی سارے کا سارا پھیل کر گلگوں لبوں میں غائب ہو جاتا۔ آخر وہ ایک لمبا سانس لیکر اُٹھ بیٹھی۔ کتاب پر ہاتھ رکھا ہی تھا۔ کہ دروازہ کھلا۔ اور بوڑھی ماما نے آ کر کہا۔

"حضور بلاتے ہیں"

اس نے چیں بجبیں ہو کر کتاب کرسی پر رکھ دی۔ اور دروازہ کھول کر پاس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک کوچ پر سیٹھ کریم الدین لیٹے ہوئے تھے۔ اس کو دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے۔ راشدہ آداب عرض کر کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے کہا۔

"ادھر آؤ بیٹی میرے پاس بیٹھو۔ آج میں نے ایک بڑے اہم مطلب کے لئے تمہیں بلایا ہے"۔

راشدہ نے بیٹھتے ہوئے کہا "فرمایئے"

سیٹھ صاحب دروازے کی طرف دیکھ کر کہنے لگے "راشدہ بیٹی تم نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اور ماشاء اللہ فہمیدہ ہو۔ شریف گھرانوں میں تمہاری عمر کی جوان لڑکیاں بٹھائے رکھنا موجبِ ننگ خیال کیا جاتا ہے اس لئے میں تمہیں دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں پریشان ہو رہا تھا۔ کہ تمہاری خوش قسمتی سے میرے عزیز کرم فرما محمد کامل نے اپنے لڑکے محمد عاقل کے لئے پیام بھیجا ہے"۔

یہ نام سنکر راشدہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماموں جان میں ابھی شادی نہیں کرونگی"۔

یہ جواب سُن کر سیٹھ صاحب اپنی جگہ سے اچھل پڑے اور کہنے لگے۔

"میرا خیال تھا۔ کہ تم بڑی دانشمند اور معاملہ فہم ہو۔ تمہاری اسی صفت نے تمہیں اپنے چچا کی نگاہوں میں ذلیل کیا۔ وہ تمہاری شکل تک دیکھنے سے بیزار ہے۔ میں نے مرحومہ کے خیال سے تمہیں اپنے ہاں بلا لیا تھا۔ میں سمجھتا تھا۔ کہ میری محبت تمہیں سعادتمند اور اطاعت شعار بنا دے گی۔ مگر افسوس تم پر خاک بھی اثر نہ ہوا۔ آج میں صاف صاف کہے دیتا ہوں۔ کہ اس حالت میں تمہیں زیادہ عرصہ تک اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔

یہ سنکر راشدہ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ وہ خاموش بیٹھی ماموں کی باتوں پر غور کرتی رہی۔

سیٹھ صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "اپنے حالات کو اچھی طرح سے سوچ سمجھ کر جو فیصلہ ہو۔ اس سے مجھے مطلع کرو۔ اتنا میں کہہ دوں۔ کہ اس سے بہتر موقعہ تمام عمر تمہیں نہیں ملے گا۔ جاؤ اپنے کمرے میں جا کر اس معاملہ پر غور کرو"۔

راشدہ چپ چاپ سرنگوں بیٹھی تھی۔ یہ سنکر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور جاتے ہی کرسی پر گر پڑی۔ کتاب کو اٹھا کر فرش پر دے مارا اور آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہنے لگی "کچھ ہو۔ میں اس بانولی سے شادی نہیں کرونگی"۔

وہ سارا دن اندر بیٹھی رہی۔ چار بجے کے قریب اٹھی۔ کپڑے درست کئے۔ اور موٹر میں بیٹھ کر لارنس چلی گئی۔ تیز ہوا ذرا ٹھہر گئی تھی۔ اور دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر کانپ رہی تھی۔ گھاس کے

فرش پر جو ہر بادل کی وجہ سے برسات میں ناہموار ہو گیا ہے۔ نمودار ہو سبزہ دکھائی دے رہے تھے۔

راشدہ بنچ پر بیٹھ کر اپنے حالات پر غور کرنے لگی۔ خیالات کی رو میں نہ معلوم کہاں بہہ گئی۔ عاقل کے ہاں کی عیادت یاد آئی۔ تو کہنے لگی۔

"کیسی دل سوز آواز تھی۔ یقیناً وہی تھا"۔

کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ اور وہ نصیر کو سامنے آتا دیکھ کر گھبراہٹ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نصیر فاصلے پر ہی کھڑا ہو گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے کہا

"میں آگے آسکتا ہوں؟"

کوئی اور ہوتا تو وہ تہذیب کے تقاضہ سے ضرور جواب دیتی۔ مگر جب اس نے نصیر کو اس حالت تحیر و نیاز میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ تو شرم سے اس کی زبان بند ہو گئی۔ اور وہ خاموش بیٹھی بے معنی نظروں سے سامنے گھاس کی طرف دیکھتی رہی۔

نصیر نے اس سکوت کو عذر حسن سے تعبیر کیا۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اپنی مداخلت بیجا کی معافی طلب کر کے واپس چلا گیا۔

راشدہ نے جب سر اٹھا کر دیکھا۔ تو وہ درختوں کے جھنڈ کے پیچھے غائب ہو چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں حیران ہو رہی تھی۔ کہ اگر اس سے سلسلۂ کلام چھیڑتی۔ تو خبر نہیں وہ کیا کہتا۔

(۸)

نصیر نے شوفر کو بلا کر کہا۔ "موٹر کو تیار رکھو۔ باہر جانا ہے"

اتنا کہہ کر وہ میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور کاغذ نکال کر لکھنا شروع کیا۔ جب پہلا صفحہ ختم ہو گیا۔ تو اسے از سر نو پڑھنے لگا۔ درمیان میں کئی جگہ کاٹ کاٹ کر درست کیا۔ پھر کسی خیال کے آتے ہی سارے صفحے پر قلم پھیر دیا۔ پیڈ میں سے دوسرا کاغذ نکالا۔ کچھ عرصہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جھک کر لکھنے لگا۔ جب وہ ختم ہو گیا۔ تو کاغذ کو تہہ کر کے جیب میں رکھا۔ اور قلم ہاتھ سے رکھ کر کرسی پر دراز ہو گیا۔ اتنے میں سیڑھیوں پر پاؤں کی آہٹ ہوئی۔ اور حمید نے اندر آتے ہی کہا۔

"نصیر تم نے کچھ سنا"۔

"نہیں تو" نصیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

حمید نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "عاقل کا اس سے رشتہ ہو گیا ہے"۔

نصیر کا دل دھک دھک کرنے لگا اس نے دانستہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے پوچھا۔

"کس سے؟"

"راشدہ سے" حمید نے ہنستے ہوئے کہا۔ نصیر کے چہرے کا رنگ جو شفق کی طرح سرخ سے زرد اور زرد سے سفید ہو گیا تھا۔ اب سیاہی مائل ہو گیا۔ مگر حمید اپنی دھن میں کہتا گیا۔

"واللہ ایسے خوش نصیب لوگ بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ مسرت اور شادمانی سے بچوں کی طرح اچھلتا پھرتا ہے۔ کہتا تھا۔ جلدی ہی شادی کی تاریخ مقرر ہو جائے گی۔ اور وہ سب احباب کو ایسی شاندار دعوت دیگا۔ کہ برسوں یاد رہیگی۔ ہائیں نصیر تمہیں کیا ہو گیا"۔ حمید اس کی طرف دیکھ کر چلایا۔ اور دوڑا ہوا اس کے پاس گیا۔

نصیر کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ اس نے اس انداز سے حمید کی طرف دیکھا۔ جیسے قریب المرگ مریض پردیس سے آئے ہوئے بھائی کو پہچاننے کے لئے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحہ میں اس نے سنبھل کر کہا۔

"کچھ نہیں حمید۔ پچھلے دنوں سے طبیعت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ یونہی بیٹھے بیٹھے نقاہت طاری ہو جاتی ہے۔ ہاں تم کیا کہہ رہے تھے"۔

حمید اپنی جگہ پر بیٹھ کر کہنے لگا۔ "عاقل کی شادی کی بات تھی۔ مگر نصیر تمہاری یہ حالت شراب ترک کرنے سے ہو گئی ہے۔ یہ نامراد جاتے جاتے بھی دل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ امید ہے۔ کہ چند دن کے بعد طبیعت بحال ہو جائے گی۔ چلو آج باغ کو چلیں دل بہل جائے گا"۔

نصیر نے جواب دیا۔

"نہیں حمید آج مجھے کہیں جانے کی سکت نہیں"۔

"اچھا تم آرام کرو" حمید نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور مصافحہ کر کے باہر نکل گیا۔

"حضور موٹر تیار ہے" شوفر نے آ کر کہا۔

نصیر نے جواب دیا۔ "آج کہیں نہیں جاؤں گا"

یہ سن کر وہ باہر نکل گیا۔ اور نصیر نے اس کے پیچھے زور سے دروازہ بند

کر دیا۔

جب اپنے آپ کو تنہا دیکھا۔ تو الماری کا تالا کھولا۔ شراب کی بوتل نکالی۔ کچھ عرصہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ نصیب نے بوتل الماری میں رکھ دی۔ اور دروازہ کھولا۔ ملازم نے اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیا۔

نصیب نے اسے کھول کر دیکھا۔ "ایں عاص کی شادی کی دعوت" اس نے نوچ کھسوٹ کر اسے دور پھینک دیا۔ الماری کی طرف جا کر پھر شراب کی بوتل نکالی اور کھڑا کھڑا غٹاغٹ چڑھا گیا۔ پھر اسے زور سے فرش پر پٹخ دیا۔ شیشے کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر گئے۔ اور باقی ماندہ شراب کے چھینٹوں سے دیوار پر لٹکے ہوئے کپڑے آلودہ ہو گئے۔

پھر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی جیب ٹٹولی۔ اور آدھ گھنٹہ پہلے کا لکھا ہوا کاغذ نکال کر پرزے پرزے کر دیئے۔ اور فرش پر پھینک دیا۔ اس کے بعد لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے صوفے کی طرف بڑھا۔ اور اس پر بیٹھ گیا۔ اور بیٹھا بیٹھا لیٹ گیا۔

(۹)

سیٹھ صاحب نے جاتے جاتے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا۔

"میں نے سب سامان مکمل کر لیا ہے۔ صبح اپنے زیوروں کی فہرست بنا دینا۔ تمہارا انداز بھی دیکھیں گے۔"

راشدہ نے آہستہ سے کہا۔ "اچھا"

سیٹھ صاحب مسکرائے۔ اور کھٹ کھٹ نیچے اتر آئے۔ اس کی بھابی بیٹھی تک رہی تھی۔ کہ وہ انتخاب میں اس سے مشورہ لے گی۔ مگر راشدہ فوراً اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اور بیقراری سے ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ کبھی وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگتی۔ کبھی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتی۔ اور دیر تک وہیں کھڑی رہی۔ آخر اس نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ "دیکھا جائے گا۔" اور اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار ہویدا ہو گئے۔

[illegible] میں اس کی بھابی تین چار عورتوں کو لیکر اندر آئی۔ اور راشدہ کی شادی کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ وہ چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھی ان کی بے سر و پا گفتگو سنتی رہی۔ کئی بار انہوں نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس نے مختصر جواب دے کر انہیں ٹال دیا۔ اس کی تنک مزاجی کو تبسم و حجاب پر محمول کیا گیا۔ وہ دیر تک بیٹھی رہیں۔ راشدہ دل ہی دل میں انہیں کوستی رہی۔ آخر راشدہ کی شادی سے گفتگو شروع ہو کر خبر نہیں کس کی موت پر ختم ہوئی۔ اور ساڑھے چار بجے کے قریب سب رخصت ہوئیں۔ اور راشدہ موٹر منگا کر باغ کو چلی گئی۔

اتوار کا دن تھا۔ طالب علموں کے گروہ ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ کئی بے فکرے درختوں کی ٹیک لگا کر بیٹھے سگرٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ مگر وہ شان بے نیازی سے خراماں خراماں آگے بڑھتی گئی۔ بنچ کے قریب پہنچ کر اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ اور برقعہ سنبھال کر بیٹھ گئی۔

درختوں کے چھوٹے بڑے سائے ایک دوسرے میں مل رہے تھے۔ آسمان پر بادلوں کے سفید ٹکڑے کبھی مل کر ایک بڑے بادل کی شکل اختیار کر لیتے۔ اور کبھی ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھر جاتے۔

راشدہ انتہائی تمکنت سے اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر تھوڑی دیر میں ہی اس کے چہرے پر اضطراب کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ اس کے نازک ہونٹ اس سیپی کی طرح وا ہو گئے۔ جو [illegible] کی راتوں میں سمندر کی سطح پر ابھر آتی ہے۔ جب کبھی ہوا کی سرسراہٹ کی آواز آتی۔ تو وہ بے اختیار دائیں طرف دیکھنے لگتی۔ مگر اس کی اشتیاق آمیز نگاہیں ہر دفعہ ناکام واپس لوٹ آتیں۔

آہستہ آہستہ وقت گذر گیا۔ دھوپ اپنا دامن سمیٹنے لگی۔ اور ہوائیں ایسی تیز خنکی آمیز چلیں۔ جیسے وہ برف کے تودوں پر سے ہو کر آ رہی ہے۔

راشدہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور ادھر ادھر دیکھتی ہوئی واپس چلی گئی۔

شام کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں گئی۔ اور ماما کو بلا کر کہا۔

"رحمت چوکیدار کو بلا لاؤ"

تھوڑے عرصہ کے بعد ایک نوجوان اپنا بوسیدہ کمبل لپیٹے ہوئے دروازے میں نمودار ہوا۔

راشدہ نے کہا۔ "آج پھر مجھے سینما جانا ہے۔ غالباً دوسرے شو پر جاؤں گی۔ پھاٹک بند کر کے چابی مجھے دے جانا۔"

اس نے کمبل سے منہ نکالے بغیر کہا "جو حکم" اور واپس چلا گیا۔

(۱۰)

تین بجے کا وقت ہوگا۔

چاند ڈوب گیا تھا۔ ستاروں کی خواب آلود آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ درخت بھیگے ہوئے بگلوں کی طرح بیچارگی کی حالت میں کھڑے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ کبھی کبھی چوکیداروں کے ساری قدموں کی چاپ سنائی دیتی تھی۔ عمارتوں کے دھندلے نقوش دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اب لوگ کبھی بیدار نہیں ہوں گے۔ اور یہ دھندلکا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فضائے عالم پر محیط رہے گا۔

راشدہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ سینما سے واپس آکر اسے نیند نہیں آئی تھی۔ کھڑکی کے باہر نیچے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ راشدہ نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ بائیں طرف دیوار کی نکڑ پر دو سپاہی زمین پر جھکے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

"دیکھتے نہیں منہ سے شراب کی بُو آرہی ہے۔ میرے خیال میں آدھی رات گئے بدمستی کی حالت میں گھر سے نکلا ہوگا۔ یہاں پہنچتے ہی دل کی حرکت بند ہوگئی۔ اور بے جان ہوکر گر پڑا۔ اوہ یہ تو مر چکا ہے۔ یہ سنکر راشدہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

یہ تعبیر تھا — !

علی عباس بی اے
جلالپوری

(ایک افسانہ)

تندی پہاڑ کے شمالی دامن میں سلطان پیٹ نامی ایک چھوٹا سا قریہ آباد ہے۔ جس کے درمیان سے ہو کر پہاڑ پر راستہ گیا ہے۔ اس راستہ پر بارشوں کے ایام میں رجب کی ایک شام کو ایک گھر کے قریب جس کے سامنے کرنج کے پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چند مسلمان لمبے لمبے چغے پہنے سروں پر عمامے باندھے بظاہر کسی کے منتظر کھڑے تھے۔ بہت سی لڑکیاں رنگ برنگ کے کپڑوں میں ملبوس کھلے میدان میں کھیل رہی تھیں۔ یکایک ان کی نظریں راستہ پر دوڑتے ہوئے ایک لڑکے پر ٹھہریں۔ آدمیوں کی مذکور جماعت کے قریب پہنچتے ہی اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"نوشہ والے — آ گئے!"

آدمی بکھر گئے۔ اور ان کی جگہ پر لڑکیاں آ کھڑی ہوئیں۔ کچھ ہی دیر بعد بہلیوں کی شکل کی تین بیل گاڑیاں جن کی دونوں جانب پردے لٹک رہے تھے۔ گڑگڑاتی ہوئی مکان کے سامنے آ ٹھہریں۔ گاڑیوں سے اتر کر عورتیں گھر میں داخل ہوئیں۔ مرد سامان پہنچانے لگے۔ قریب کی لڑکیاں ان کی اجنبی صورتوں کو تکنے لگیں۔ مگر ایک فیروزی دوپٹے والی خوبصورت لڑکی اپنی ساتھیوں سے الگ ہو کر پہاڑ کی جانب بھاگنے لگی جھونپڑوں اور کچی عمارتوں کے پاس سے ہوتی ہوئی ایک بڑے پتھر کے قریب سے گذر کر وہ آم کے درختوں کے نیچے پہنچی۔ اس کے بعد اس نے اپنا رخ دامن کے قریب ایک کچی عمارت کی طرف پھیرا۔ جس کے روبرو بھی کرنج کے پتوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔

لڑکی دور سے ہی پکار کر کہنے لگی — "اماں جان — دولہا بھائی — آ پہنچے!"

. . . .

رات کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ تمام سلطان پیٹ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مگر اس وقت کوئی شخص چاندنی میں پہاڑ کی سیر کا لطف اٹھانے کی غرض سے اس قریہ کے درمیان سے گذرتا — تو اس کو راستہ کے قریب شادی والے گھر کے ایک کمرے کے دریچہ میں روشنی دکھائی دیتی جس کے پاس ایک انسانی شکل حرکت کر رہی تھی۔ مگر اس وقت وہاں سے کوئی نہ گذرا۔ اور کچھ وقفہ کے بعد روشنی غائب ہو گئی۔ ساتھ ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور ایک دراز قد مردانہ شکل برآمد ہوئی۔ جب منڈو سے گذر کر وہ شکل چاندنی میں نکل آئی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک نوجوان شخص ہے۔ جس کا جسم ایک بادامی رنگ کی شال میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے سر آسمان کی طرف اٹھایا۔ اس کا صاف شفاف چہرا جو پورا کتابی کہا جا سکتا تھا۔ اور گول چاند کی روشنی میں خوب نظر آنے لگا۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت ایک قسم کی افسردگی اور معصومیت کی دلکش آمیزش تھی۔ جو اس کی کشادہ پیشانی پر دو ہلکی لکیروں۔ اس کی رقیق چمکیلی آنکھوں اور ہونٹوں پر غیر ارادی تبسم سے ظاہر ہوتی تھی۔ ستاروں بھرے آسمان کی خلاف ہنگام صفائی اور تندی درگ اور اس سے ملے ہوئے پہاڑوں پر ضیا باری کرتے ہوئے بدر منیر پر نظر ڈالنے کے بعد نوجوان مرد کے چہرہ پر بشاشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ گویا پیش نظر منظر کی خوبصورتی اس کی روح میں سرایت کر رہی تھی۔

اس سرسری معائنہ کے بعد وہ آہستہ آہستہ پہاڑ کی جانب قدم اٹھانے لگا۔ پہاڑوں پر نباتات کی افراط اور میدان میں لہراتے ہوئے کھیت مہتاب کی ٹھنڈی روشنی میں صبح کی مانند سرسبز نظر آ رہے تھے۔ ٹہلتے ہوئے نوجوان پہاڑ کے قریب ایک چوراہے پر پہنچا۔ دائیں جانب ٹیپو مسجد کے قریب۔ آم کے جھاڑوں کے نیچے گاڑیوں کے پاس بندھے ہوئے بیلوں کو دیکھ کر اس نے پہچانا۔ کہ انہیں کے ذریعہ وہ اور اس کے ساتھ بہت سے مرد، عورتیں، اور بچے اسی شام کو سلطان پیٹ پہنچے تھے۔ اس کے سامنے ایک راستہ سیدھا جھاڑیوں میں

(امی ملاحظہ ہوا صفحہ)

چلا گیا تھا۔ بائیں جانب گاڑی کا راستہ بڑے بڑے پتھروں اور جھاڑیوں میں پیچ کھاتا ہوا پہاڑ کے دامن سے بالکل لگا ہوا چلا گیا تھا۔ اس راستہ کی سیدھ میں کچھ دور سپید دھبّا سا نظر آ رہی تھیں۔ جہاں سے قریہ کے آدمی غالباً پتھر کاٹ کر گاڑیوں میں لاد کر لایا کرتے تھے۔ لیکن ایک اجنبی کو جو بغیر کسی راہبر کے پہلی مرتبہ پہاڑ پر چڑھنا چاہتا ہو۔ یہی دھوکا ہوتا تھا۔ کہ یہی آخر اللہ کر راستہ پہاڑ پر جاتا ہوگا۔ نوجوان مرد کچھ تردد کے بعد بائیں جانب کے راستہ پر ہو لیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ اس بڑے پتھر کے قریب پہنچا۔ جہاں سے وہ کچھ آگے نہ جا سکا ہوگا۔ کہ اس کی نظر ایک خوبصورت کمسن عورت پر پڑی۔ جو ہلکی گلابی رنگ کی اوڑھنی اوڑھے پتھر کا سہارا لیے بیٹھی سامنے ایک رومال کی شکل کے کپڑے پر کچھ کشیدہ کر رہی تھی۔ نوجوان مرد اس کو دیکھتے ہی جھجک کر پیچھے ہٹا۔ مگر اس آہٹ سے عورت چونک پڑی۔ اور پتھر کی آڑ میں چھپتے ہوئے انسان کے پچھلے حصہ کو اس نے دیکھ ہی لیا۔

"کون!" نوجوان آدمی کو ایک بالکل سریلی آواز میں سنائی دیا۔ لیکن وہ حیرت زدہ پتھر کے پیچھے کھڑا رہا۔

"کون؟" عورت نے پھر کہا۔ "چھپتے کیوں ہو؟" آواز نوجوان سے قریب تر ہونے لگی۔ اس کو محسوس ہوا۔ کہ عورت اس کے تعاقب میں آ رہی تھی۔ اب اپنے آپ کو ظاہر کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اپنی شال سنبھالتا ہوا چاند کی روشنی میں نکل آیا۔

"آہ!" نوجوان آدمی کو دیکھتے ہی کمسن عورت کی زبان سے نکلا۔ اور وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تعجب کی اس حالت میں اس کی بڑی بڑی سیاہ چمکدار آنکھیں نوجوان پر ایک خوف زدہ ہرن کی آنکھوں کی مانند ظاہر ہوئیں۔ اس کے بعد خوف کی بجائے حیا کا جذبہ ان سے ظاہر ہونے لگا۔ نظریں یک غیر ارادی طور سے زمین پر جھک گئیں۔ اس کے ساتھ سر بھی جھک گیا۔ اور ایک جانب پھیر لیا گیا۔

"مجھے معاف کریں۔" نوجوان مرد اپنے مخصوص صاف آواز میں کہنے لگا۔ "میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ مجھے گمان نہ تھا۔ کہ میں یہاں ایسے وقت پر ایک نوجوان خاتون سے ملوں گا۔ اور یہ اتفاق میرے لئے تعجب سے خالی نہیں۔"

کمسن خاتون نوجوان آدمی کے سنجیدہ الفاظ سن کر اور بس کچھ چہرے کو دیکھ چکی تھی۔

"میں چاندنی راتوں میں کبھی کبھی ادھر نکل آتی ہوں۔" نوجوان خاتون نے بظاہر اس کے تعجب رفع کرنے کو کہا۔

"کیا آپ کا وطن یہی ہے!"

"ہاں ۔۔۔ نہیں" عورت نے ایک خاص اندرونی کشمکش کے زیر اثر کہا۔ "یہاں میرے رشتہ دار ہیں۔"

"دلہن کے کسی رشتہ میں؟"

خاتون نے اپنے چھپے ہوئے چہرے کو اور بھی کچھ پھیرتے ہوئے آہستہ سے کہا "ہاں دور کی رشتہ داری ہے۔" اس کے بعد اس نے اپنے سفید رومال کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے یوں ہی ایک بے غرض لہجہ میں کہا۔ "اور آپ تو ۔۔۔ نوشہ سے کوئی تعلق رکھتے ہوں گے؟"

"کاش کہ میں رکھتا" نوجوان نے ایک یاس آمیز لہجہ میں کہا۔

اس کی نظریں دلہن کی رشتہ دار کے سفید ہاتھوں۔ دامن میں چھپے ہوئے سر اور ریشت کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"آہ ۔۔۔ اس کے کسی آشناؤں سے؟"

"افسوس یہ بھی نہیں"

"تو پھر" عورت نے اپنی کنکھیوں سے اجنبی کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان نے کچھ توقف و تردد کے بعد کہا۔ "نوشہ بننے والا ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں خود ہوں۔"

عورت چونک پڑی "اور آپ ۔۔۔" بالکل آہستہ اس کی زبان سے بے اختیارانہ نکلا۔

"اور میں ہوں کہ" نوجوان آدمی نے کہا۔ "میرے ماحول کی موجودہ حالت میں نوشہ بننا کسی قسم کی خوشی کا باعث نہیں سمجھتا۔" اس وقت نوجوان کا چہرہ بالکل اترا ہوا تھا۔ اس کی بجائے اس وقت میں نوشہ کا کوئی آشنا ہوتا۔ یا دولہا کا ایک رشتہ دار ہوتا۔ جیسا کہ دلہن کی آپ رشتہ دار ہیں۔ تو میں اسے زیادہ پسند کرتا۔"

"اب مجھے جانا چاہیئے۔" نوجوان عورت نے کچھ گھبراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ اور وہ کپڑے کو لپیٹنے لگی۔ "شاید آپ" دلہن کی رشتہ دار نے ایک خاص انداز میں کہا۔ "قریہ والوں کو پسند نہ کرتے ہوں۔ خاص کر اس قریہ والیوں کو جہاں مجھ ایسی نوجوان لڑکیاں نقاب اوڑھے

ں کو باہر نکالا کرتی ہیں۔ مگر آپ بے فکر رہیں۔ اس حرکت کو میرے لئے
وس سمجھیں۔ جو — جو اس قریہ میں بالکل نووارد ہوں۔ میں آپ کو یقین
تی ہوں۔ آپ کی دلہن سات پردوں کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ کیا
آپ کو تسلی ہوئی؟"

اس کی آخری طرز ادا بالکل تحیرآمیز ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ آہستہ قدم
ھانے لگی۔

"اس کے بالکل برعکس" نوجوان آدمی نے ایک غمگین لہجہ میں کہا۔ "خاتون
گی۔ آپ کے اس اعتراف کو کہ یہ حرکت آپ کے لئے مخصوص ہے۔
سمجھتا ہوں۔ اور میں اپنے احساس کی تشریح کرتے ہوئے اس لئے
ماہوں۔ کہ وہ تمہاری رنجیدگی کا باعث نہ ہو۔ تم دلہن کی رشتہ دار ہو۔
میں نہیں چاہتا۔ کہ ایک لطیف احساس کا اظہار لوگوں کو میری نسبت
غلط رائے قائم کرنے کا موقعہ دے۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں" کمسن خاتون نے کہا "اور مجھ پر اعتماد رکھیں۔ میں
پ کے احساس کو کسی شخص پر ظاہر نہ ہونے دوں گی۔ اب رہا میرے متعلق
ن ایک احساس کا علم کسی کی رنجیدگی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ میں صرف
کی رنجیدگی کی وجہ جاننا چاہتی ہوں۔"

اجنبی خاتون کی اس دوستانہ خواہش پر نوجوان متعجب ہوا۔ مگر اسا نہیں کہ
اس پر کافی غور کرتا۔

"اس کو بالکل ناراضگی کہنا بھی ٹھیک نہ ہو گا۔" نوجوان نے اپنے ہمکلام
جگہ زیادہ تر اپنے آپ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ میری طبیعت
م لوگوں کی سی نہیں ۔۔۔ لیکن" نوجوان نے خاتون کی طرف متوجہ ہوتے
ئے کہا "بات یہ ہے کہ آپ کے بیان کردہ سات پردے مجھے
سی طرح نہیں بھاتے۔ ان کے ہوتے ہوئے ایک انسان ہرگز مکمل
میں بن سکتا۔ اور نہ وہ اس پاک خالص اور بے غرض محبت سے آگاہ
سکتا ہے۔ جو شرف انسانی کی نشانی ہے۔ میں اس عورت کو تمام
خیال بیویوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ جو ایک وادی کی سوسن کی مانند آغوش
ت میں پرورش پاتی ہے۔ جس کی روح شہد کی مکھیوں کی طرح اپنی غذا
سم کی ہر قوت کے ذریعے ہر ممکن مقام سے حاصل کرتی ہے۔
جس کا پہلو اس اعلےٰ ترین جذبے سے خالی نہیں۔ جس پر انسانی
ت کا دارومدار ہے۔ اور یہی مختصر الفاظ میں میرا احساس ہے"

اس طویل تقریر کے بعد ان کے درمیان کچھ دیر تک کامل خاموشی حائل
رہی۔ چاندان کے سروں پر ٹھہرا تھا۔ ان کے اور دریہ کے درمیان کے
آم کے جھاڑوں میں اڑ نکلنے والے پرندوں کی اتفاقیہ پھڑپھڑاہٹ کے
سوائے تمام کائنات محو خواب تھی۔ اپنے اظہار خیال کے بعد نوجوان
نے دیکھا۔ کہ خاتون اس کی جانب حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ "کیا یہ
سچ" اس نے ایک قدم نوجوان آدمی کے قریب آتے ہوئے کہا۔ "کیا
یہ سچ ہے کہ آپ اپنی زندگی کی ساتھی کو مکان کی اندھیری چار دیواری میں بند
رہنا نہ چاہتے ہوں؟ ۔۔۔ ایک ۔۔۔ ایک" اس کا
چہرہ ایک شگفتہ پھول کی مانند تروتازہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی بڑی سیاہ
آنکھیں غیر معمولی تیزی کے ساتھ چمک رہی تھیں۔ جس سے نوجوان مرد
متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"مجھے افسوس ہے" اس نے کہا "آپ مجھے سمجھنے میں غلطی کر رہی
ہیں۔ دلہن کی رشتہ دار ۔۔۔ ایک دم اتر گیا، بہت سی عورتیں
ہیں۔ جنہیں بہتر یعنی فطرت کے موافق تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقعہ
نہیں دیا گیا۔ بلکہ جبراً انہیں مکانوں میں جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ محفوظ رکھا گیا
اگر ان کے جوہر ظاہر نہ ہونے پائیں۔ اور وہ دنیا اور تمام کائنات کی خوبیوں
سے بے خبر رہیں اور ان کے قوائے ظاہری و باطنی زمین و آسمان کی چیزوں
اور حالتوں کے حسن سے لطف اندوز نہ ہو سکیں۔ اور اس طرح ان کی روح کی
بالیدگی نہ ہو سکے۔ تو ہماری تمام ہمدردی ان ستم رسیدہ انسانوں کے ساتھ
ہے۔ کیوں کہ ان کا سکون ان کی اپنی غلطی کا نتیجہ نہیں ۔۔۔"

"اس کی بجائے اگر ایک عورت ۔۔۔"

"ہاں ہاں۔ اس حالت میں ۔۔۔ لیکن اگر ۔۔۔ میں صرف آپ کے خیال
پر کچھ اضافہ کر کے آپ کی رائے جاننی چاہتی ہوں۔ اگر کوئی دوشیزہ خاتون
شادی سے پہلے اپنے ہونے والے خاوند کے ساتھ ایک بے لوث
محبت ۔۔۔ میرے الفاظ پر دھیان رکھیئے۔ ایک بے لوث اور بے غرض
محبت کی چند ساعتیں یا چند دن گذارنا چاہتی ہے۔ یہ عورت آپ کی
رائے میں کیسی ہے؟"

نوجوان کے ہونٹوں پر ایک مایوس مسکراہٹ کھیلنے لگی "یہ میرے
خیال میں کوئی اضافہ نہیں ہے۔ اور اس پر رائے دینا گویا میرے خیال
کو دہرانا ہے۔ یعنی دبی ہوئی آگ کو بھڑکانا۔ غرض میں دوسروں کی

طبیعت کا ذمہ دار نہیں۔ میں تو ایسی عورت کو اپنے لئے بہترین عطیۂ فطرت سمجھتا ہوں۔ اور آپ کے بیان کردہ بے غرض محبت کے لئے اس دنیا میں انسانی دوستی کا معراج ۔ ۔ مگر اس میرے لئے ــ بے کار اور ناگوار موضوع کو رہنے دیجئے۔ مجھے آج رات کسی سبب سے نیند نہ آئی۔ باہر کی خوبصورتی کے مقابلہ میں مطالعہ میں بھی جی نہ لگا۔ پہاڑیوں پر نظر ڈالی تو مجھے سیدی ڈگ پر چڑھنے کی سوجھی۔ کیونکہ میرا خیال ہے۔ کہ اس وقت اوپر ضرور ایک دلکش منظر نظر ہوگا۔ یہی راستہ اوپر جاتا ہے نا؟

"نہیں۔ مگر کیا اتنی رات کو پہاڑ پر جائیں گے؟" خاتون نے ایک خاص انداز میں اور دوستانہ لہجہ میں کہا۔ جو ابھی تک اس سے ظاہر نہ ہوا تھا۔ اور جس سے دولہا بننے والے شخص کے دل کو ایک عجیب حرکت ہوئی۔

"ہاں" اس نے کہا "کیا رات کو اوپر جانا منع ہے؟"

"نہیں نہیں" خاتون نے کہا۔ اور اپنا سر پہاڑ کی جانب اٹھایا۔ جس کی نظریں پہاڑ پر قلعہ کی دیواروں پر ٹھہریں۔ اس حرکت سے اس کے دوپٹہ کا آنچل اس کے سر سے کندھوں پر آ پڑا۔ اور اس کا چہرہ چاندنی میں چمک اٹھا۔ اس کی صاف پیشانی پر جس کے درمیان سے مانگ نکالی گئی تھی۔ کچھ بال بکھرے ہوئے تھے۔ مگر سب سے نمایاں اس کی بڑی بڑی رسیلی آنکھیں تھیں۔ جو بلا کی چمکدار تھیں۔ اور ان پر گھنی اور دراز پلکیں نکلی ہوئی تھیں۔ ناک میں بائیں جانب ایک سفید پتھر کا زیور چمک رہا تھا۔ گول گول سرخی مائل سفید رخسار کامل صحت کا پتہ دے رہے تھے۔ نیچے کا ہونٹ ذرا سا آگے کو بڑھا ہوا جس پر اوپر کے ہونٹ کی نسبت زیادہ سرخی نمایاں تھی۔ اس کا قد۔ اس کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے جو کہ سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ دراز تھا۔ تھوڑی دیر [illegible] کے درنگ اور اس سے ملے ہوئے پہاڑوں پر نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے اپنے منقطع کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اس چاندنی میں پہاڑ پر بہت ہی خوشنما منظر دکھائی دیں گے۔ مگر مجھے اس کا لطف اٹھانے کا کبھی موقعہ حاصل نہیں ہوا۔"

"کیا میں آپ کو" نوجوان نے ایک یاس و امید کی حالت میں کہا۔ "اپنے ساتھ لے چلنے کی امید کر سکتا ہوں؟"

دلہن کی رشتہ دار نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا "ہاں" اگر اس سے آپ کا کوئی حرج نہ ہو"۔

نوجوان آدمی کا دل اپنے پہلو میں ایک نامعلوم کیفیت کے تحت دھڑکنے لگا۔ "کوئی نہیں" اس نے کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔

"چلئے" خاتون نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

(۲)

جب تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ تو خاتون نے کہا۔

"اس پہاڑ پر چڑھنے کے لئے قریب دو ہزار سیڑھیاں بنائی گئی ہیں"۔

"دو ہزار؟" دولہا بننے والے نے آہستہ سے دہرایا۔

"اور سطح سمندر سے اس کی اونچائی چار ہزار آٹھ سو فٹ سے زیادہ ہے"۔

"آٹھ سو فٹ سے زیادہ؟" نوجوان نے استفسار کیا۔

"چار ہزار آٹھ سو فٹ سطح سمندر سے" دلہن کی رشتہ دار نے کنکھیوں سے نوجوان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔ چار ہزار آٹھ سو فٹ" اس کے ساتھی نے اپنے آپ کو صحیح کیا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پتھر کی ایک بڑی دہلیز پر پہنچے۔

"اس قسم کی بہت سی چوکھٹیں ہمیں اوپر جاتے راہ میں ملتی ہیں"۔ خاتون نے دہلیز کے پتھر کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "جو غالباً ٹیپو سلطان اور حیدر علی خان سے صدیوں پیشتر کھڑی کی گئیں"۔

"صدیوں پیشتر؟" نوجوان نے اپنی ساتھی کی مرمریں کلائیوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔

"ہاں" دلہن کی رشتہ دار نے کہا "اور اوپر کا قلعہ بھی ان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ انہوں نے اس کی صرف مرمت کرائی تھی"۔

"ہاں۔ کیا میں آپ کا وطن دریافت کر سکتا ہوں؟" نوجوان آدمی نے یکایک کہا۔

"میرا وطن؟" خاتون نے نوجوان کے غیر متوقع سوال کو دہرایا۔ اور وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی۔ کہ ان سے فاصلہ پر آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ "پہاڑ پر سے کوئی اتر رہے ہیں"۔ اس نے کہا۔

"میں یہاں اس پتھر کے پیچھے چھپ جاتی ہوں - انہیں گذر جانے دو"
نوجوان مرد آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا - تھوڑے فاصلہ پر اس کو دو ہندو ملے - جو دیش فرقہ سے تعلق رکھتے تھے - وہ دونوں سروں پر زرک گوٹ کی پگڑیاں باندھے ہاتھوں میں سہارے کی لکڑیاں لئے اتر رہے تھے - ان کا نوجوان کے پاس سے گذرنا ہی تھا - کہ مڑ کر وہ بھی آہستہ ان کے پیچھے آنے لگا - اور اس جگہ پر آکر ٹھہرا - جہاں وہ اپنی عجیب و غریب ساتھی سے جدا ہوا تھا -

"آجائیے - وہ چلے گئے" اس نے بلند آواز سے کہا -

مگر تھوڑی دیر تک کچھ دکھائی نہ دیا - پتھر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے وہ ادھر تجسس کی نگاہ ڈال کر نوجوان نے دوبارہ کہا -

"کتنی دور چلی گئی ہو؟"

فوراً خاتون پتھر کی دوسری جانب سے برآمد ہوئی - اس کے قریب پہنچتے ہی نوجوان نے کہا -

"تمہارا نام کیا ہے؟"

اس کی ساتھی نے ایک لمحہ بعد کہا "میرا ـــ مجھے - "امی" پکارتے ہیں ـــ"

"امی"؟ نوجوان نے کچھ متعجب ہو کر کہا -

"میرا اصل نام اُم ہانی ہے" - دلہن کی رشتہ دار نے کہا -

"مگر ابھی نیچے تم خود کسی کو امی پکار رہی تھیں"

"وہ تو میری ایک سہیلی ہے - اس کا ـــ اس کو میں اکثر اپنے ہی نام سے پکارا کرتی ہوں - یہاں سب مجھے امی ہی پکارتے ہیں -"

"کیا میں تم کو ضرورت پر اسی مشہور نام سے پکار سکتا ہوں؟"

"تمہیں اختیار ہے" کمسن خاتون نے کہا -

"اور میرا نام منور حسین ہے"

"ہاں" دلہن کی رشتہ دار نے کہا -

"کیا تم جانتی ہو؟" دولہا بننے والے نے تعجب سے کہا -

"ہاں ابھی گھر میں کسی کو تمہارا نام لیتے سنا تھا"

وہ دونوں ساتھ ساتھ پہاڑ پر چڑھنے لگے - اُم ہانی نندی درگ اور اس کے مضافات کے تاریخی باقیات پر گفتگو کرتی چلی جا رہی تھیں - جس کے جواب میں اس کا ساتھی ایک یا دو لفظ کے سوا کچھ نہ کہتا تھا - تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے یکایک دریافت کیا -

"کیا کہیں تمہاری نسبت مقرر ہوئی ہے؟" امی کے لئے یہ دوسرا غیر متوقع سوال تھا - وہ پریشان نظر آنے لگی - اس کی زبان سے کوئی جواب جلد نہ نکلنے سے اس کے ساتھی نے کہا -

"مجھے معاف کریں - مجھے خوف ہے - میرے سوالات دخل در معقولات ثابت ہونے لگے ہیں" -

اس کے بعد ان کے درمیان پھر خموشی طاری ہوگئی -

"وہ کون آدمی تھے - جو ابھی ادھر سے گذرے؟" امی نے کچھ دور چلنے کے بعد کہا -

"وہ آدمی!" منور حسین نے کہا - اور وہ اس قلیل عرصہ کے واقعہ کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا "مگر میں نے تو انہیں غور سے دیکھا ہی نہیں" اس نے اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا - "شاید وہ کوئی مزدور لوگ ہوں گے!"

اس اپنی عجیب و غریب ساتھی کے خیال کے سوائے دوسرے خیال کو اپنے دماغ میں جگہ دینا نوجوان کے لئے قریباً ناممکن تھا - وہ اس کے تمام خیالات کا مرکز بنی ہوئی تھی - اس کی باتیں نوجوان کو ایک خوش الحان پرندے کے راگوں سے زیادہ مزیدار معلوم ہوتی تھیں - قریہ کی اس دوشیزہ لڑکی کا بغیر کسی خطرے کے احتمال کے اس کے ساتھ ہو لینا - اس کا آزادانہ کلام - اس کا شاعرانہ مذاق اور اس کے تاریخی معلومات منور کے دل و دماغ میں جذبات اور خیالات کا ایک ناقابل بیان طوفان برپا کر رہے تھے - اس کی ہر حرکت اس کو تعجب میں ڈال رہی تھی - اور خاصکر اس وقت جب کہ وہ جھاڑی کے پیچھے چھپ کر اس کی آواز پر تھوڑی دیر تک نہیں آئی تھی - نوجوان آدمی کے دل میں ایک خوفناک خیال پیدا ہو گیا تھا - اس نے لوگوں کی زبانی سنا تھا - کہ پہاڑ پر پریاں اترا کرتی ہیں - اماوس اور پورنماشی کی راتوں کو اکثر ارواح جنگلوں اور مرگھٹوں اور پہاڑوں میں پھرا کرتی ہیں - اگر کوئی آدم زاد ان کی زد میں آجائے تو وہ اس کے دل کو عجیب باتوں اور حرکتوں سے پہلے لبھاتی ہیں - اور آخر کار ایک چیخ کے ساتھ کسی عمیق غار میں یا ایک اجاڑ کنویں میں کود کر غائب ہو جاتی ہیں - یا ایک شعلے کی شکل میں ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں - کیا یہ سبک رفتار خوبصورت عورت ایک روح ہوگی؟ جو ایک نوشہ بننے والے جوان مرد

کو دھوکا دیا جا سکتی ہے؟ اس خیال سے نوجوان مرد کے جسم میں ایک ٹھنڈی بجلی دوڑ گئی۔ مگر کیا ایک روح شرماتی بھی ہے؟ اگر نہیں تو اس نے اپنی نسبت کے متعلق کیوں نہیں جھٹ سے کوئی جواب دے دیا۔ انہیں خیالات میں وہ اپنی ساتھی کے ساتھ قریباً آدھا راستہ طے کر چکا تھا۔ اب اسے تھکان محسوس ہونے لگی۔

"سیڑھیوں پر چڑھنا ــ معمولی ــ چڑھائی پر ــ چڑھنے سے ــ دشوار ہے"۔ اُم ہانی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کچھ دیر کے لئے ــ یہاں بیٹھ جایئے" سور نے کہا۔ "میں بھی تھک گیا ہوں"۔

وہ دونوں قریب کے ایک پتھر پر جا بیٹھے۔

"کیا ایک روح کو تھکان بھی محسوس ہوتی ہے؟" نوجوان نے خیال کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی ساتھی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا "کیا تم بھوتوں اور شیطانوں کی ہستی پر اعتقاد رکھتی ہو؟"

"یوں تو لوگوں کی زبانی بہت کچھ سنا ہے" دلہن کی رشتہ دار نے کہا۔ "مگر میں نے آج تک کچھ نہیں دیکھا"۔

اس اعتراف سے سور کو کچھ اطمینان سا حاصل ہوا۔ وہ اس عنوان پر اس سے زیادہ گفتگو کرنے کی جرأت بھی نہ رکھتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ اس کے دل کی پریشانی کا راز ظاہر ہو جائے۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد انہوں نے دوبارہ اپنا سفر جاری کیا۔

اب تک راستہ پر چھوٹے جھاڑ اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ مگر اب انہیں کھلی چٹانوں پر سے گذرنا پڑا۔ راستہ کے بہت ہی ڈھلوان ہونے کے سبب سہارے کے لئے ایک جانب لوہے کی پٹڑی لگائی گئی تھی۔

"تم میری دائیں جانب میرے ہاتھ کے سہارے چلو" سور نے کہا۔ "اور میں پٹڑی کے سہارے چلتا ہوں"۔

اُم ہانی نے بغیر کچھ کہے اپنے سفید نرم ہاتھوں سے نوجوان کے سیدھے بازو کو تھام لیا۔ اور وہ دونوں چڑھنے لگے۔ کم سن خاتون کے گرم جسم کو اپنے جسم سے لگا ہوا محسوس کرنے سے سور کے اطمینان قلب میں اضافہ ہوا۔ درمیان میں صرف دو جگہ دم لینے کے لئے ٹھہر کر قلعہ کے دروازے سے گذرتے ہوئے وہ پہاڑ کی سطح پر جا پہنچے۔

یہاں پہلے انہیں بڑے بڑے گھنے درختوں کے نیچے سے گذرنا پڑا۔ جہاں کامل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ چاندنی میں قلعہ کی دیوار کے قریب آئے۔ جہاں سے نیچے بہت دور تک زمین کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ اپنی کہنیوں کو دیوار پر ٹکا کر انہوں نے پہلے اس مقام کو دیکھا۔ جس کو وہ ابھی چھوڑ آئے تھے۔ تمام سلطان بیٹے میں ایک سیدھا ایک سفید اور ریختہ عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے منڈی کے قریہ پر۔ بعد جیک بالاپور کے بجلی کے چراغوں پر اپنی نظریں جمائیں۔ اس سے پرے بہت دور تک لاتعداد تالاب مہتاب کی روشنی میں چمک رہے تھے اور آخر میں افق سے ملے ہوئے دھواں دھار پہاڑیوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ یہ تمام منظر ان کے نیچے ایک نقشہ کی مانند پھیلا ہوا تھا۔ اگر اس وقت انہیں کوئی دیکھتا۔ اور ان کے نیچے میدان کے دلفریب منظر پر بھی نگاہ ڈالتا۔ تو اس کو ایسا معلوم ہوتا۔ کہ وہ دونوں یونانی دیوتا مشتری اور زہرہ تھے جو اپنی بسائی ہوئی دنیا کے اس خوبصورت منظر سے لطف حاصل کرنے کے لئے جب کہ تمام مخلوق محو خواب تھی۔ کوہ البس پر آ ٹھہرے تھے۔

تھوڑی دیر یہاں ٹھہرنے کے بعد سور اور اُمی اس بڑے اور مشہور کنوئیں کے پاس آئے۔ جس کا نام امرت سرور ہے۔ اور ایک جانب سے کچھ نیچے اتر کر تھوڑی دیر آرام لینے کے لئے سیڑھیوں پر بیٹھ گئے یہ جگہ نیچے میدان سے زیادہ خاموش معلوم ہوتی تھی۔ اطراف کے درختوں میں کبھی کبھی پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ کے سوائے جو غنودگی میں دبکے ہوئے تھے اور ان کو دبے سے وقوع میں آتی تھی۔ تمام کائنات چپ چاپ ہو گئی تھی۔ جب سور اور اُمی کو اس طرح بیٹھے کچھ وقت گذرا۔ تو نوجوان کو محسوس ہوا۔ کہ اس کی ساتھی ٹھنڈ سے کانپ رہی تھی۔ اس نے شال کو اپنے جسم سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"اُمی! تمہیں ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ یہ لو اس کو اوڑھ لو"۔

"اور تمہیں؟"

"مجھے ٹھنڈ نہیں"۔

"نہیں نہیں تمہیں بھی اوڑھنا چاہیئے"۔

سور نے اپنی شال کے ایک حصہ کو اُمی کی جانب بڑھایا۔ وہ دونوں ایک ہی شال میں پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔

اس پر اس قدر اعتبار کرنے والی یہ کوئی عورت ہوگی۔ اس طرح ایک عزیز حقیقی میں ایک نئی دلہن یا کسی افسانوی معشوقہ کی مانند اکیلی دبی بیٹھے

شانہ سے شانہ لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کوئی بھی ہو۔ اس کی ان آزاد اور سادہ حرکتوں میں نوجوان نے ایک زبردست روحانی طاقت محسوس کی۔ جسکی گرفت میں وہ جکڑا ہوا تھا۔ کیا وہ اپنے شبہات کا حل اپنی ساتھی سے دریافت کر سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔ کہ اس لڑکی کے لئے ان کا حل بیان کرنا کوئی دشوار کام نہ تھا۔ وہ ایک آزاد۔ معصوم۔ لطیف الطبع دیہاتی لڑکی تھی۔ اس نوجوان کو نیک اور اپنا ہمخیال پاکر تھوڑی دیر کے لئے اس کے ساتھ ہولی۔ اور بس۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ وہ اپنے شبہات کو ظاہر کرے۔ اور یہ کم سن خاتون اس سیدھے سادے کھلے جواب سے اس کو نادم بنائے۔

مگر اس قسم کی بحث سے نوجوان کی بے قراری میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ یہ بات شائد صحیح تھی۔ کہ خاتون کو اپنا ایک ہم خیال ملا۔ اور وہ بظاہر اسکی صحبت سے لطف اٹھا رہی تھی۔ گو وہ صحبت بالکل عارضی تھی۔ لیکن نوجوان کی طبیعت کا حال جدا تھا۔ وہ ایسی ایک ہمخیال کو اپنی زندگی بھر کی ساتھی بنانا چاہتا تھا۔ اور یہ خیال کہ ایسی ایک عورت موجود تھی۔ مگر وہ اس کو اپنی نہ بنا سکتا تھا۔ نوجوان کے لئے سب سے دردناک تھا۔ اور مزید برآں ایک قلیل مدت کے اندر وہ ایسی عورت کے ساتھ بیدھا جانے والا تھا۔ جس کی صورت تک اس نے نہیں دیکھی تھی۔

آنکھیں کھولیں تو اس کی نظریں کنوئیں کے پانی کے بے لہر کتا دہ سطح پر پڑیں۔ جو چاند اور تاروں کو بے کم و کاست منعکس کر رہی تھی۔ گویا وہ دونوں فضا میں معلق بیٹھے ہوئے تھے۔ جن کے نیچے اور اوپر کائنات کے انگنت ثوابت اور سیارے گھوم رہے تھے۔ یا کم سے کم وہ عام لوگوں سے اس لئے جدا معلوم ہوتے تھے۔ کہ اس وقت وہ عوام سے بہت اوپر تھے۔ اور جب قریب تمام سو چکے تھے۔ تو وہ جاگ رہے تھے۔ اور موجودہ حالت میں وہ ایک بادام کے دو مغز معلوم ہو رہے تھے۔ جن کی نشو و نما ازل سے مل کر ہوئی تھی۔

مگر نوجوان کا دل نے دیکھا۔ کہ واقعات ان کے مٹانے کے درپے تھے۔ کیا سچ مچ یہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا کئے جائیں گے۔ اگر یہی مقصود تھا۔ تو کیا وہ اس کو روک سکتا تھا؟ اس کے لئے یہ کسقدر [illegible] تھا۔ اپنے والدین۔ اپنے تمام رشتہ دار اور دوستوں کے بے [illegible] ایک دم [illegible] کر ان کی تمام امیدوں۔ خوشیوں اور ایک حد تک [illegible] میں ملانا۔ اور یہ سب محض اپنی ایک کی یا زیادہ سے زیادہ دو

کی خوشی کے لئے۔ اور ان لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ جو اس کو اپنے گھر کی بیٹی شادی میں دے رہے تھے۔ . . . . . نہیں۔ جہاں تک اس کا بس چلے۔ اس کو یہ گوارا نہ تھا۔ کہ ان تمام آدمیوں کی امیدیں اور خوشیاں اپنی خواہشات کا شکار بنائے۔ اسوقت جہاں وہ ایک لطیف طبیعت شاعرانہ مذاق اور انسانی جوابات رکھتا تھا۔ وہاں وہ اپنے معاشرتی فرائض اور اس کے ساتھ خاص و عام کی توقعات سے غافل نہ تھا۔

ان پریشان خیالات کے بعد مسور نے ایک ترچھی نگاہ اپنی ساتھی کے چہرے پر ڈالی۔ اس سے کامل سکون ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ ایک تیر جوارحیہ کی اسد اپنے آگے پانی میں آسمان کے لے درا قافلہ کو گھور رہی تھی۔

"امی" اس نے ایک افسوس ناک لہجہ میں کہا۔ "تم بالکل خاموش ہو؟"

"ہاں۔ اور آپ بھی خاموش ہیں!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں! نوجوان نے کہا۔ ہاں ہاں۔ میں بھی خاموش ہوں"

"امی" مسور نے دوبارہ آہستہ سے کہا۔ ام ہانی نے جواب کی بجائے اپنا رخ نوجوان کی طرف پھیرا۔ اس کی سیاہ روشن آنکھیں منور پر ٹھہریں۔ "اب ہم دونوں" نوجوان نے اپنا کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "نیچے اتر گئے اور" اس کے ساتھی اٹھنے کے لئے حرکت کرنے لگی۔

"نہیں نہیں۔ ابھی نہیں" نوجوان نے کہا۔ "میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ کچھ دیر بعد ہم نیچے اتر جائیں گے۔ اور تم اپنا راستہ لوگی۔ اور میں اپنا۔ میں تو تمہیں پہچاننے سے قاصر رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ غم و اندوہ سے تمہیں کوئی سروکار نہیں۔ مگر میری حالت اس کے برخلاف ہے۔ بظاہر مجھے کسی چیز کی کمی نہیں۔ والدین ہیں۔ چاہنے والے دوست اور رشتہ دار ہیں۔ روپے پیسے ہیں۔ مکانات ہیں زمینیں اور ان سب پر طرہ یہ کہ ایک بالکل قلیل عرصہ میں میرا نکاح بھی ہو جانے والا ہے۔ کوئی پوچھ سکتا ہے۔ کہ مجھے اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے شائد کچھ نہیں۔ مگر میں اپنے آپ سے یہ پوچھتا ہوں۔ کہ اگر یہی چیزیں سب کچھ ہیں۔ تو ان سے مجھے اطمینان کیوں حاصل نہیں ہوتا۔ اور آج میں نے اس چیز کو بھی جان لیا۔ جس کے آگے میں ان تمام چیزوں کو مردہ سمجھتا ہوں۔ اور جو میری خوشی کا واحد ذریعہ بن سکتی ہے۔ مگر افسوس اس کا حاصل کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس لئے میرے لئے تمہارا ایک انسان یا روح ہونا دونوں برابر ہیں۔"

"روح!" دلہن کی رشتہ دار نے اس کی جانب تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا

"ہاں" نوجوان آدمی نے کہا "میں ابھی سیڑھیوں پر خیال کر رہا تھا۔ کہ اگر روایات سچ ہیں۔ تو تم ایک روح ہو سکتی ہو۔ اس وقت یہ خیال مجھے ناگوار معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اب میں یہ سمجھتا ہوں۔ کہ تمہارا میرے لئے ایک روح ہونا ہی بہتر ہے کیونکہ میں اس خیال سے تسلی پاؤں گا۔ کہ میرے خوابوں کی عورت مجھے یہاں ایسے ماحول میں نہیں مل سکتی۔ اور ہمارا یہ کوہستانی سفر فقط ایک خواب تھا۔"

"مگر تم کو معلوم ہوگا" اُمی نے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کہ یہ ایک سچا واقعہ ہے۔ اور میں کوئی روح نہیں۔ بلکہ گوشت اور پوست کا مجسمہ ہوں۔ انسان ہوں"

"ہاں" دولہا بننے والے نے کہا۔ "مگر افسوس یہ انکشاف میرے لئے ایک مژدہ نہیں ثابت ہوا۔"

"مگر۔۔" اُمی نے آہستہ سے کہا۔ اور اپنے کلام کو جاری کرنے کی بجائے وہ سورو سے قریب تر ہو بیٹھی۔ اور اپنے ٹھنڈے اور ملائم رخساروں کو نوجوان کے ہاتھ کی پشت پر رکھا۔ جو اس کے زانو پر تھا۔

خاتون کی اس حیرت انگیز حرکت سے نوجوان کے لبوں پر ایک ہوا آمیز ہنسی کھیلنے لگی۔ وہ اس کے سیاہ و خوشبودار سر کے بالوں کو۔ اس کے گول سرخ رخسار اور کنپٹی کو تکنے لگا۔ کیا یہ اس جوان مرگ انگلستان کے شاعر کی بے رحم حسینہ ہوگی۔ جو اس کو ترسا ترسا کر اس کے دل کے ٹکڑے کرنا چاہتی تھی؟

نوجوان آدمی نے اس وقت خیال کیا۔ اس کے بعد اس کی نظر اس کے سامنے پانی کی سطح پر پڑی۔ جو خفیف لہروں کے باعث ان کے نچلے آسمان کو جھٹلا رہی تھی۔

"امی" ناامید آدمی نے آخرکار کہا۔ "تیز ہوا شروع ہو رہی ہے۔ اب ہم کو اتر جانا چاہیئے۔ معلوم نہیں کتنا وقت ہو چکا ہے۔"

وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ شال تم ہی اوڑھے رہو" سورو نے کہا۔

جب وہ بغیر کسی قابل ذکر گفتگو کے جھاڑوں کی چھاؤں اور قلعہ کی دیواروں سے گذر کر سیڑھیوں پر آئے۔ تو انہوں نے دیکھا۔ کہ چاند ان کے سامنے مغربی جانب ڈھل چکا تھا۔ وقت کوئی دو اور تین کے درمیان ہوگا۔ آدھی دور اترنے کے بعد جب ان کے جسموں میں گرمی پہنچی۔ تو اُمی نے شال واپس کر دیا۔ اس کے بعد سب سے نچلی چوکھٹ کے سامنے دم لینے کے لئے ٹھہرے۔ یہاں سے گذر کر وہ تھوڑی دیر بعد نیچے چوراہے پر پہنچے۔ ان کی بائیں جانب ٹیپو مسجد کے قریب گاڑیاں اور بیل ڈھلی ہوئی چاندنی میں ابھی طرح نظر آ رہے تھے۔

"میں یہاں سے اکیلی ہی جا سکتی ہوں" خاتون نے کہا۔

"اگر تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔" سورو نے کہا "تو میں اس بڑے پتھر تک تمہارے ساتھ چلونگا۔"

وہ دونوں دائیں جانب مڑے۔

"اُمی" نوجوان نے کچھ دور چلنے کے بعد کہا۔ "کیا ہم پھر کبھی ایک دوسرے سے مل سکیں گے؟"

"کل رات کو اگر ممکن ہوا تو۔"

"دس بجے؟" سورو نے ایک عجیب سرگرمی کے ساتھ کہا۔

"سنکرانت کی رسم کے بعد"

"ہاں کل سنکرانت ہے نا" اسکی مجھے یاد ہی نہ رہی۔"

اتنے میں وہ پتھر کے قریب آ گئے تھے۔ یہاں وہ دونوں رک گئے۔

"اب میں خود چلی جاؤنگی۔" دلہن کی رشتہ دار نے کہا۔

اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی چلی گئی۔

"کل رات کو" نوجوان آدمی نے کہا۔ "سنکرانت کے بعد میں اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا!"

"میں آنے کی کوشش کرونگی۔" اُمی نے چلتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہیں ضرور آنا چاہیئے۔" سورو نے التجا کے لہجہ میں کہا۔

اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ اب وہ جھاڑوں کی اوٹ میں آ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ دلہن کے گھر کے قریب پھر دکھلائی دی۔ یہاں ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کر اس نے اپنے سر کو پیغمبر کی سیدھ میں پھیرا۔ جہاں نوجوان مرد کھڑا ہوا تھا۔ کمسن عورت کا اداس چہرا چاندنی میں صاف نظر آنے لگا۔ وہ دوبارہ پلٹی۔ اور منڈیرے کے نیچے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

نوجوان نے ایک گہری سانس لی۔ اور ایک لمبی سرد آہ آہستہ آہستہ اس کے منہ سے نکل آئی۔ "گوشت اور لہو کا مجسمہ" اس نے واپس اپنی قیامگاہ کی طرف لوٹتے ہوئے کمسن عورت کے الفاظ دہرائے۔ "کاش میں اس کو پہلے جانتا۔ اور ہمیشہ کے لئے اپنی بناتا۔ مگر نہیں" اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے اپنے کلام کو ختم کیا۔ "ریگستان کے ایک تنہا مسافر کے آگے سراب کی مانند وہ میری آنکھوں میں چمک کر غائب ہو گئی۔" گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے کہا "مگر کل رات کو ضرور میں اس سے دوبارہ ملونگا۔"

(۳)

دوسرے دن جیسا کہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ منور حسین بہت دیر تک سوتا رہا۔ جاگ اٹھنے پر بھی وہ تھوڑی دیر کچھ نے پریشان خیالات میں ڈوبا رہا۔ کیا یقیناً وہ آج دوبارہ اس عجوبۂ قدرت لڑکی سے ملیگا؟ اس نے خیال کیا۔ کیا وہ واقعی گزشتہ رات کو ایک کم سن خوبصورت عورت سے ملا تھا؟ ام ہانی یا صرف اُمی اس نے اپنا نام بتایا تھا۔ کیا جو کچھ کہ اس کو یاد تھا۔ ایک خواب ہی نہ تھا؟

کچھ دیر بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ اور کپڑے بدل کر باہر دھوپ میں نکل آیا۔ وہ کیوں اتنی دیر تک سوتا رہا۔ اس نے سوچا۔ اس کے پیروں میں یہ وہ دکیسا تھا؟ وہ چورا ہے کی جانب بڑھا۔ یہاں پہنچکر وہ راستہ پر تجسس کی نظریں ڈالنے لگا۔ اپنے آگے پیچھے راستہ بغور دیکھتے ہوئے وہ بڑے پتھر کی جانب بڑھا۔ کچھ دور تک راستہ سخت تھا۔ مگر ایک جگہ نرم زمین نظر آئی۔ وہ مٹی اور ریت کا خشک نالا تھا۔ جو راستہ کو کاٹتا ہوا چلا گیا تھا۔ یہاں ٹھہر کر نوجوان اپنی تجسس کی نگاہیں اس نرم اور ریتلی زمین پر ڈالنے لگا۔ اس کو آدمی کے قدم کا ایک نشان نظر آیا۔ اس نے نشان کے قریب اپنا قدم زور سے رکھا۔ اور پاؤں اٹھا کر دونوں نشانوں کا موازنہ کرنے لگا۔ وہ دونوں یکساں تھے۔

"ہاں! یہ میرے ہی قدم کا نشان ہے"۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اس کے بعد وہ جھکا ہوا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پہلے نشان سے قریب ایک گز کے فاصلہ پر اس کو دو اور نشان نظر آئے۔ جو پہلے سے کچھ چھوٹے تھے۔

"یہ اس کے قدموں کے نشان ہیں" اس نے دوبارہ کہا۔ پتھر کی جانب اور اس سے پرے جھاڑوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے اپنی قیام گاہ [illegible] جاتے ہوئے کہا۔

[illegible] خواب نہیں"

[illegible] گذر گیا۔ نوجوان اس سے ملنے کے لئے بیقرار ہوتا گیا۔ [illegible] ملنے کے لئے آئے گی! اس نے شام [illegible] اپنے آپ سے کہا۔ وہ ام ہانی کی اس [illegible] ساتھی کی صحبت کے زیادہ [illegible] اور اس کی جدائی ——

ایک راستہ کے ساتھی کی جدائی —— کا یہ قلیل عرصہ اس کو ایک دراز زمانہ نظر آنے لگا۔ غریب آدمی اپنی حالت کو اب سمجھ رہا تھا۔

"معلوم نہیں اس کے بغیر مجھے کس طرح اطمینان حاصل ہوگا"۔

اس نے شکرانہ کے بعد گھر سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

پتھر کے قریب پہنچکر اس نے دیکھا۔ کہ وہاں کوئی نہ تھا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد پتھر سے تھوڑے فاصلہ پر جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اور ساتھ ہی ایک جھاڑی کے عقب سے ایک عورت نکل آئی۔

"میں تمہیں یہاں کھڑے ہوئے دیکھ کر نکل آئی ہوں" اُم ہانی نے کہا۔ "مگر میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ کیونکہ ابھی ایک رسم ہونے والی ہے۔ اور مجھے حاضر رہنا چاہیئے"۔

"رسم؟" منور نے خاتون کے سروقد پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ آج وہ نیلے رنگ کی ساری میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ وہ نوجوان کی چبھتی ہوئی نظروں میں بہت دیر تک اپنی نظریں نہ ملا سکی۔ خون اس کے گول رخساروں پر دوڑ رہا تھا۔

"ہاں" اس نے اپنا سر ایک جانب پھیرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں رسم میں موجود نہ ہونگی۔ تو وہ مجھے ڈھونڈنے لگیں گے۔ اگر آپ کچھ دیر توقف کریں۔ تو میں اس سے فارغ ہو آؤں"۔

"بہت خوب" نوجوان نے کہا "لیکن میں یہیں گھومتا رہونگا"۔

اس سے جدا ہو کر اُمی واپس چلی گئی۔ نوجوان اس کی سبک اور تیز رفتار کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ جب وہ جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہوئی تھی۔ تو اس نے آہستہ کہا "وادی کی سوسن"

اس کے بعد وہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ آج آسمان پر کہیں کہیں ابر کے ہلکے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے۔ مگر ان سے چاندکی روح پرور روشنی میں کوئی نمایاں فرق واقع نہ ہوا تھا۔ قریب ایک گھنٹہ ادھر ادھر گھومتے رہنے کے بعد وہ دوبارہ پتھر کے پاس آیا۔ اور اُم ہانی کو وہاں نہ پاکر قریب کے ایک چھوٹے پتھر پر جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر یہاں بیٹھنے کے بعد اس کے سامنے کچھ دور جھاڑیوں میں کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ گویا کوئی جانور گھوم رہا ہے۔ وہ اٹھا اور متحرک شے کی جانب بڑھا۔ ایک یا دو جھاڑیوں سے گذرنے کے بعد معلوم ہوا۔ کہ اُمی کی ساری کا آنچل کانٹوں کی ایک جھاڑی میں جا لگا تھا۔ اور وہ اس کو نکالنے کی کوشش

کر رہی تھی۔

"میں جلدی جلدی آرہی تھی"۔ اس نے منور کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھ کر کہا "کہ یہ کانٹوں میں جا لگی"۔

"اوہ! کھینوسمت" منور نے خاتون کو اپنے آنچل کو جھٹکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"ہمیں اس کو ایک ایک کانٹے سے الگ کرنا چاہیئے"

اور وہ دونوں پتھر کی جانب قدم بڑھانے لگے۔

"آج ہم کدھر چلیں؟" امی نے پتھر سے کچھ آگے چلنے کے بعد کہا۔

"میں نے تم سے کہہ دیا ہے۔ میں یہاں کے کسی قابل دید مقام سے واقف نہیں۔"

"ہم ٹیپو مسجد کے پیچھے سے ہوتے ہوئے ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان کی وادی میں چلیں گے۔"

"تب تو تم بالکل ہی ایک وادی کی سوسن نظر آؤ گی!"

نوجوان نے درمیان میں کہا۔

"— یہاں کھینوں کے علاوہ" اس نے ایک خفیف مسکراہٹ کے ساتھ اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "نباتات کی بہتات سے ایک بڑے جنگل کا گمان ہوتا ہے۔ اور ان گنجان درختوں میں نہیں کہیں کہیں دبول اور مٹھ ملینگے۔ جہاں اگلے زمانے میں جوگی تمام لوگوں سے دور اپنے خیالات کی دنیا ایجاد کر رہے تھے۔"

"امی ذرا ٹھہرو۔" منور نے یکایک قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ اب وہ ٹیپو مسجد کی ایک جانب جھاڑیوں اور پتھروں میں جا رہے تھے۔ کہ منور کو مسجد کے قریب کوئی اسکا نام لیتے ہوئے سنائی دیا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر سننے کے بعد معلوم ہوا۔ کہ نوجوان آدمی کے رشتہ دار اسے ڈھونڈنے نکلے تھے۔

"امی تم یہیں ٹھہرے رہو۔" منور نے کہا۔ "میں ابھی دیکھ آتا ہوں۔"

خاتون ایک قریب کے پتھر پر جا بیٹھی۔ منور ان دونوں کے طے کردہ راستہ پر دوبارہ واپس آکر چوراہے پر نمودار ہوا۔ گویا وہ پہاڑ پر سے ابھی اترا ہے۔ اس کے بعد اس نے مسجد کی راہ لی۔ اس کے قریب پہنچتے ہی ایک ادھیڑ عمر عمامہ پوش نے کہا۔

"منور حسین اتنی رات گئے تم کہاں چلے گئے تھے؟ ہم آدھ گھنٹہ سے تمہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ اور آج دن بھر میں نے تمہیں نہیں دیکھا کیا تم گھر میں نہ تھے؟"

"میں تو سارا دن گھر میں ہی تھا۔ چچا جان صرف اب ہواخوری کے لئے نکل کر چاندنی میں کچھ دور پہاڑ پر چڑھ کر اتر آیا ہوں"

"دلہن والوں کا رسم آنے والا ہے۔" اس کے چچا نے کہا۔ "تمام دوست احباب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

اس اثنا میں دوسرے آدمی بھی جمع ہو گئے تھے۔ اور سبھوں نے گھر کا راستہ لیا۔

گھر پہنچنے پر معلوم ہوا۔ کہ لڑکی کی والدہ کی طرف سے ابھی تک رسم نہیں آئی تھی۔

منور دوبارہ گھر سے باہر نکل آیا۔ اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اسکی پیشانی کی لکیریں خوب نمایاں ہو گئی تھیں وہ چوراہے کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ چوراہے پر پہنچنے کے بعد اس نے اپنی رفتار تیز کی۔ اور تھوڑی دیر میں وہ کمسن عورت کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ امی اس کے چہرے پر سوالیہ نظر ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ام ہانی" نوجوان نے آہستہ کہا۔ "میری ان رسموں اور شادی کی کاروائیوں سے بے پروائی اور بیگانگی میرے خیر خواہوں اور رشتہ داروں کے جوش کو بظاہر ٹھنڈا کر رہی ہے۔ وہ کچھ مرجھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک مجھے گھورتا ہے۔ میں نہیں جانتا۔ کیا کیا باتیں ہوئی ہیں۔ معزز خاتون۔ ابھی تک میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ اور مجھے جاننے کی اب ضرورت بھی نہیں۔ کاش میں تمہیں ایک ماہ پیشتر جانتا۔ مگر اس وقت یہ بے فائدہ خواہش ہے۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے رسم میں داخل ہونا چاہیئے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اتنی دیر سرد ہوا میں تم میری منتظر رہو۔ مجھے تمہاری صحبت مجھے دنیا کے تمام رسم و رواج [illegible]

ر تم جانتی ہو۔ ہمیں ایثار کی ضرورت ہے۔ دوست احباب کا پاس چاہیئے
یہ سچ ہے تلاش جسکی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔" تم اور میں اور کتنے
ن اسطرح خفیہ طور سے ان کران وادیوں میں پھرا کریں گے ؟ آدمی کی زندگی
ی بناہی پائدار اور دوامی خوشی پر نہیں رکھی گئی۔ آدم و حوا کی خوشیوں کو خاک
ں ملانے کے لئے شیطان پہلے سے موجود تھا۔ اور کیا آج وہ شیطان
نہیں ہے! اس قسم کے انگنت شیطان موجود ہیں۔ انکی موجودگی میں
یا ہماری یہ توقع ہو سکتی ہے۔ کہ ہم خوش رہینگے۔ کبھی نہیں۔ اگر آج
نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں ہمیں ضرور جدا ہونا پڑے گا۔ ممکن ہے۔
ہمیشہ کے لئے۔ وہ دن آج ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں آج ہی۔ میری دلی خواہش
ہے۔ کہ جہاں بھی تم ہو۔ خوشی تمہارے ساتھ رہے۔ اور دیکھو تمہیں
ی زندگی کا ایک زندہ دل ساتھی ملنے کی امید باقی ہے۔ مجھے قسمت کے
اتھوں لُٹ گیا سمجھو۔ غرض اب تم گھر جا کر آرام کرو۔ چلو " ناشاد آدمی نے
اتون کا ہاتھ پکڑ کر واپس لوٹتے ہوئے کہا۔ " مجھے ڈھونڈتے ہوئے
یرے آدمی پھر نہ آ جائیں "۔

کچھ دور چلنے کے بعد غمزدہ نوجوان نے کہا: " میں اسی جگہ تم سے جدا
ہوتا ہوں۔ رسم پہنچ گیا ہوگا۔ ان بھولے بھالے آدمیوں کی خوشیوں کے
آگے میری خوشی کی کیا حقیقت۔ اب لو" اس نے خاتون کے ہاتھ کو چھوڑ کر
کہا۔ " خدا حافظ میری عزیز امی۔ تمہاری صحبت کے اس قلیل عرصہ کو
میں آخیر دم تک نہ بھولونگا۔

منور نے اس سے جدا ہو کر جلدی جلدی چوراہے کا راستہ لیا۔ مگر
کمسن عورت کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ پھر آہستہ قدم اٹھانے لگی۔ کچھ دور چلنے
کے بعد نوجوان مرد نے ایک غیر ارادی طور پر پیچھے پھر کر دیکھا۔ امی ہانی کو پھر
[illegible] کھڑے ہوئے پایا۔ منور کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ آنکھوں
[illegible] سے پیچ کر دو تین قطرے گر گرا کر اس نے اپنی نظریں صاف کیں۔ اس
[illegible] دیکھا۔ کہ اسے کھڑے دیکھ کر خاتون اس کی جانب تیزی سے
[illegible] کچھ نہ سوچا۔ وہ بھی ایک غیر ارادی طور پر اس کو ملنے کے
[illegible] قریب پہنچے۔ تو منور کی زبان سے آہستہ سے نکلا

میں آپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونا نہیں چاہتی "۔ دلہن کی
رشتہ دار نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔" اور کوئی وجہ نہیں کہ میں آپ
سے جدا ہوں۔ کیونکہ ــــ"

" بے شک" مضطرب نوجوان نے کہا۔ اور خاتون کے دونوں ہاتھوں
کو اپنے ہاتھوں کے درمیان لیتے ہوئے وہ گویا ہوا۔ " میں بھی یہی
محسوس کر رہا ہوں۔ دنیا میں جینے کے لئے اطمینان کی ضرورت ہے۔
ایک پریشاں حال شکستہ دل سے اس کا کیا کام چل سکیگا۔ اور اس سے
دنیا کی کیا توقع پوری ہو سکتی ہے۔ تمہارے بغیر مجھے قرار حاصل ہونا ناممکن
ہے۔ میں نہیں چاہتا۔ کہ دین اور دنیا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔
مگر وہ دیکھو! منور نے ایک ہجو آمیز ہنسی کے ساتھ کہا " کوئی ادھر
آ رہے ہیں شاید رسم آ پہنچا ہے۔ اور پھر میری تلاش ہونے لگی ہے۔
غریب لوگ وہ نہیں جانتے کہ ان تمام ڈھکوسلوں کو میں کیا سمجھتا ہوں"
" مگر میرے لئے تمہیں ان رسموں میں خوشی سے حصہ لینا چاہیئے۔
ــــ اور "

" ہاں ہاں تم خاطر جمع رہو" دولہا بننے والے نے کہا۔
تمہاری وجہ سے انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے گی مجھے اپنے
لوگوں کی دل شکنی منظور نہیں۔ چلو اب ہم چلیں"۔

" مگر آپ کے دماغ میں کوئی خیال جاگزیں ہوتا ہے۔ تو تم اس کو سرِ مو
سجاوز کرتا نہیں دیکھنا چاہتے"۔ خاتون نے تعجب سے نوجوان کو تکتے ہوئے
کہا۔" یہ بات تمہارے گمان تک سے نہیں گذری۔ کہ تمہاری دلہن بننے
والی ــــ

امی" نوجوان نے حاکمانہ طور سے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ تم
بے کار اپنے آپ کو ملامت کر کے مجھے رنجیدہ کر رہی ہو۔ تمہاری وجہ سے
میری دلہن بننے والی عورت کے کھانے۔ پینے۔ پہننے اور رہنے سہنے
میں کسی قسم کا فرق نہ واقع ہوگا۔ اس کا مجھے خیال کرنے کی ضرورت نہیں
اب آؤ ــــ میرے پاس ٹھہرنے کے لئے زیادہ وقت نہیں ہے ــــ مجھ
سے اقرار کرو۔ کہ تم آئیندہ کبھی اپنے آپ کو اس کے اور میرے درمیان
حائل نہ سمجھوگی۔

اس نے خاتون کو خاموش اور اس کو گھورتے ہوئے دیکھ کر کہا

"مگر وہ تو سمجھیگی" دلہن کی رشتہ دار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ نہیں سمجھے گی تم اقرار کرو"

"بہت خوب" خاتون نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں اقرار کرتی ہوں"۔

"ہاں" نوجوان نے تسلی سے کہا "تم کل رات کو اسی جگہ آجانا۔ میں چاند نکلتے ہی یہاں آ پہنچونگا۔ ہم فرصت سے اس کے متعلق گفتگو کریں گے۔ کیا میں تمہارے ساتھ بڑے پتھر تک چلوں؟"

"نہیں نہیں۔ میں خود چلی جاؤنگی"

"کل چاند نکلتے ہی یہاں آجانا؟"

"ضرور"

نوجوان نے خاتون کے دائیں ہاتھ کی پشت کو آہستہ سے چوما۔ اور وہ جدا ہو گئے۔

(۴)

دوسرے روز شام کو منور حسین کے بہت سے دوست آشا سلطان پیٹ وارد ہوئے۔ جو آئندہ صبح کو نکاح میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ رات کا کچھ حصہ ان ہی کی خاطر مدارت میں گذرا۔ یہاں تک کہ چاند نکل آیا۔ مگر منور اپنے دوستوں سے جدا نہ ہو سکا۔

نووارد لوگوں میں سے ایک نوجوان شخص منور سے ملنے کے تھوڑی دیر بعد اس سے جدا ہو کر قریہ کے ایک گھر میں داخل ہوا۔ یہاں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد وہ باہر نکل آیا۔ اس نے دیکھا۔ کہ چاند ابھی ابھی نکلا ہے۔ سیگرٹ سلگا کر آہستہ آہستہ اس کے کش کھینچتا ہوا وہ پہاڑ کی جانب چلنے لگا۔ نوجوان سر سے ننگا تھا۔ انگریزی وضع کے بالوں میں ٹیڑھی مانگ نکالی گئی تھی۔ ناک نقشہ اچھا رنگ گندمی۔ وہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا۔

نوجوان ٹہلتا ہوا ایک صندل کے جھاڑ کے قریب اس پتھر کے پاس پہنچا۔ جہاں گذشتہ رات کو منور اور امی جدا ہوئے تھے۔ اب چاند بہت کچھ نکل آیا تھا۔ یہاں ٹھہر کر نووارد ادھر ادھر پہاڑیوں پر نظر دوڑانے لگا۔ یہاں ٹھہرے اس کو تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ کہ قریب ہی کچھ آہٹ سنائی دی۔ وہ پتھر کی دوسری جانب پہنچا۔ یہاں ایک تعجب خیز منظر اس کے پیش نظر تھا۔ ایک خوبصورت نوجوان عورت خاموش کھڑی نکلتے ہوئے چاند کو گھور رہی تھی۔

"دوستوں سے اب فراغت ملی نا" امی نے نوجوان کی آہٹ پا کر کہا۔

نوجوان مرد ہکا بکا کھڑا رہا۔ اس کو وہیں کھڑے محسوس کر کے خاتون نے اپنا سر اس کی جانب پھیرا۔

"اوہ!" نوجوان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔

"گھبرائیں نہیں" نوجوان نے کہا۔ "آپ کو کسی کا انتظار ہے؟"

"ہاں! میں سمجھتی تھی۔ کہ میری ساتھی آگئی ہے۔ جو تھوڑا عرصہ ہوا۔ اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے کے لئے گئی تھی"

"کیا میں جان سکتا ہوں۔ کہ آپ کون ہیں؟"

"ہم یہاں پہاڑ پر قلعہ وغیرہ دیکھنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔" اس کے بعد اس نے گھبرائے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کہا۔ "مگر مجھے اب جانا چاہیئے۔ معلوم نہیں وہ ابھی تک کیوں نہیں آئی"

"کیا تم مسلمان ہو؟"

"نہیں!" اس نے کچھ تردد کے بعد کہا "لیکن مہربانی سے مجھے اکیلی چھوڑ جائیں"

"اتنی رات کو"

"کوئی پرواہ نہیں۔ میری سہیلی آجائے گی۔ آپ چلے جائیں۔ تو بہت مہربانی ہوگی"

"بہت خوب" نوجوان نے کہا۔ اور سیگرٹ کا کش کھینچتے ہوئے عورت کے چہرہ پر ایک آخری اور گہری نظر ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس کا چہرہ کچھ جھاڑ کی چھاؤں اور کچھ اس کی فیروزی ساری کے آنچل سے چھپا ہوا تھا۔ اور وہ [illegible] واپس لوٹا۔

کمسن خاتون سے جدا ہو کر جب وہ گاؤں کے پاس پہنچا۔ تو اس کو منور ملا۔

"عبدالرحیم" منور نے کہا۔ "تمہارا انتظار کرتے کرتے تمام تھک گئے۔ وہ ابھی ابھی کھانے سے فارغ ہوئے ہیں۔ اندر چلو۔ میں تمہیں کھانا کھلواؤں" اس نے قریب کے ایک گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "[illegible] شب گذارنے کے متعلق انتظام کر دیا ہے"

"مجھے معاف کریں منور" عبدالرحیم نے کہا "میں پہلے تمہیں اطلاع نہ دے سکا۔ میں کھانے سے فارغ ہو چکا ہوں۔ میرے رشتہ دار یہاں موجود ہیں۔ یہاں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد شب خوابی کے لئے بھی میں وہیں چلا جاؤں گا۔ وہ بہت اصرار کرتے ہیں"۔

"بہت خوب چلو" منور نے کہا "مجھے فرصت نہیں ورنہ میں تھوڑی دیر کے لئے آتا"۔

"لیکن منور" عبدالرحیم نے نئے جوش کے ساتھ کہا۔ "آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ابھی میں ٹہلتا ہوا ٹیپو مسجد سے کچھ آگے بڑھا۔ کیا تم قیاس کر سکتے ہو۔ مجھے وہاں کیا دکھائی دیا؟ ——"

منور کا دل دھڑکنے لگا۔

"—— ایک نوجوان بالکل خوبصورت عورت ایک پتھر کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ منور میں سچ کہتا ہوں۔ تم نے ایسی خوبصورت عورت کو کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ میں بھی اسکو اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ میرے قریب پہنچنے پر وہ بیقرار ہو گئی۔ اور مجھے چلا جانے پر مجبور کیا۔ وہ یہاں ایک اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ جو تفریح کے لئے نکل آئی تھی۔ اور وہاں کھڑے اپنی سہیلی کا انتظار کر رہی تھی۔ چلو وہ وہیں بیٹھی ہوگی۔ میں تمہیں ——"

"عبدالرحیم" منور نے بات کاٹ کر کہا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ خود نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیوں۔ "مجھے معاف کرو۔ میں نہیں آسکتا۔ جب وہ اپنے نزدیک دوسرے کی موجودگی کو ناگوار سمجھتی ہے۔ تو اس کے پاس جانا ظلم سے خالی نہیں"۔

"مگر ہم دو ہیں ——"

"مجھے افسوس ہے میں نہیں جا سکتا"

اس وقت پرہما سخانہ سے دو آدمی نکل آئے۔ عبدالرحیم کو ان کے ساتھ چھوڑ کر وہ فوراً پہاڑ کی جانب قدم بڑھانے لگا۔

اس کا دل اس وقت ایک عورت کے دل کی مانند رشک یا اس سے کم جذبے سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی موجودہ حالت کو بالکل ہی بھول گیا۔ اور [illegible] عبدالرحیم کو ایک رقیب سے زیادہ سمجھنے لگا۔ اس کے دل [illegible] خاتون کو اپنی بنانے کی خواہش موجزن ہونے لگی۔ اس کے ساتھ اس کو خوف پیدا ہوا۔ کہ کہیں وہ چلی نہ گئی ہو۔ وہ دوڑتا ہوا اس مقام پر پہنچا۔ جہاں اس سے ملنے کا اقرار کیا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اس کا خوف رفع ہو گیا۔ اس نے دیکھا۔ کہ پتھر کے قریب بیٹھے ہوئے وہ کچھ لکھ رہی تھی۔

"امی"! وہ چلایا۔ اور ایک چھلانگ کے ساتھ خاتون کے قریب جا پہنچا اور اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کے اسکی پیشانی۔ رخساروں اور ہونٹوں کو اس طرح چومنے لگا جس طرح ایک ماں اپنے گمشدہ بچے کو اس کے دوبارہ مل جانے پر چوما کرتی ہے۔ اس کے جوش کے اس غیر معمولی اظہار پر خاتون تعجب سے اس کو تکنے لگی۔

"امی" اس نے اپنے کلام کو جاری کرتے ہوئے کہا "مجھے آنے میں دیر لگ گئی۔ تم کو میرا انتظار کرنا پڑا۔ امی تم ابھی پتھر پر کیا لکھ رہی تھیں؟" منور قریب کے پتھر پر جہاں خاتون بیٹھی تھی۔ غور سے دیکھنے لگا۔ اس پر ایک طرف چونے سے "منور حسین" لکھا ہوا تھا۔

وہ دوبارہ اُم ہانی کی طرف پھرا۔ اور محبت بھری نگاہوں سے اس کے چہرے کو گھورنے لگا۔ جس پر سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔

"تم آئے نہیں! اس نے نوجوان کی قمیص کے تکموں کو نکالتے ہوئے اور پھر لگاتے ہوئے کہا۔ "اور تمہاری بجائے ایک —— ایک ——"

"ایک دوسرا شخص اتفاق سے ادھر آ نکلا۔ جس کی موجودگی تمہیں پسند نہ آئی"۔

"جب دوبارہ میں نے اسے آپ کو تنہا پایا۔ تو مجھے آپ کا نام لکھنے کی سوجھی۔ مگر مجھے معاف کریں۔ خاتون نے پتھر پر اپنی تحریر کو دیکھتے ہوئے کہا "میں اس کے ساتھ جناب اور صاحب لکھنا بھول گئی"۔

"ہاں ہاں" منور نے پتھر کی جانب پھرتے ہوئے کہا۔ "اس کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے۔ کہ اس نام کے نیچے میں تمہارا نام لکھوں اور اس کے ساتھ محترمہ اور صاحبہ لکھنا بھول جاؤں۔ کہو" اس نے نیچے پڑا ہوا چونے کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے کہا "اُم ہانی یا صرف اُمی؟" اور وہ لکھنے کے لئے آہستہ سے اپنے ہاتھ کو حرکت دینے لگا۔

"اُمی" اس نے خاتون کے قریب آکر کہا "میں نے تمہیں میرا نام لیتے کبھی نہیں سنا۔ میں اب سننا چاہتا ہوں"۔

اُمی خاموش کھڑی تھی۔

"اُمی! کیا تمہیں میرا نام اچھا نہیں معلوم ہوتا؟"

"نہیں نہیں - ایسا نہیں"

"تو پھر تم چپ کیوں ہو؟"

"منور حسین" خاتون نے آہستہ سے کہا۔

"اور بھی اختصار کے ساتھ - صرف منور"

نوجوان نے اصرار کیا۔

"منور" اس نے اور بھی آہستہ سے کہا۔

"ہاں اب چلو ہم چلیں ---"

انہوں نے اپنے گذشتہ رات کے تجویز کردہ سفر کو جاری کیا۔

مگر امی نے چلتے ہوئے کہا "تم نے میرے نام کی بجائے ---"

تھی، منور نے یکایک خاموش کرتے ہوئے کہا۔

ان کے پیچھے کچھ دور آدمیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"اس کو میں نے کہیں دیکھا ہے" عبدالرحیم کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"کون؟" اُمی نے دبی آواز میں دریافت کیا۔

"وہی جو مجھ سے پیشتر آج تمہیں یہاں لاتا تھا" منور نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کے عزیز آتے ہیں" خاتون نے ایک نظر منور پر ڈالتے ہوئے کہا - اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"ہاں ہاں بالکل ہی عزیز" برانگیختہ نوجوان نے کہا۔

"خدا کے لئے اس طعن وتشنیع کو اس وقت اٹھا رکھو - چلو ہم ان جھاڑیوں کے پیچھے چھپ جائیں۔"

وہ ان کے کچھ دور آگے گنجان جھاڑیوں میں جا بیٹھے۔

"وہ کہیں ہمارے نام نہ دیکھ پائیں" خاتون نے آہستہ سے کہا۔

منور جھاڑیوں میں سے جھانکنے لگا۔

"چلو ہم کچھ دور اور پرے چلیں" عبدالرحیم کہہ رہا تھا۔ "وہ پہاڑ پر چڑھ رہے ہوں گے" اس راہبر کے ساتھ دو آدمی تھے - وہ منور اور

پڑھنے لگے۔

"اُمی" منور نے کہا "اب ہمارا یہاں پھرنا مناسب نہیں - اوپر سے ابھی ہم صاف نظر آئیں گے - مجھے تم سے کچھ کہنا تھا - کیا تم کل رات کو چاند نکلنے کے بعد پھر یہاں مجھے ملوگی؟"

"مگر کل رات بھر رسموں سے ہمیں فرصت ہی کہاں ملتی ہے" خاتون نے کہا۔

"پرسوں رات کو؟"

"ہاں پرسوں رات کو"

"یہی بہتر ہوگا - کل شادی کی آخری رات ہے - اس کے بعد ان رسموں سے نجات مل جائے گی - پرسوں رات کو ہم اپنی بقیہ زندگی کا دستور العمل تیار کرلیں گے؟"

"ہاں" اُمی نے کہا۔

"مگر شادی کے بعد تم کہیں چلی تو نہ جاؤگی؟ میرا مطلب 'مجبوراً'؟"

نوجوان نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

"بس تم کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"اُمی! تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟"

"ہرگز نہیں - میں تمہیں پرسوں رات کو ضرور ضرور ملوں گی"

"ہاں تو اب چلو" اس نے آہستہ اس کے رخسار کو چھوتے ہوئے کہا۔

"وہ ناہنجار رات بھر تمہیں ڈھونڈتے پھریں گے"

وہ دونوں جھاڑیوں سے نکل کر اس پتھر کے پاس پہنچے - جہاں انہوں نے اپنے نام لکھے تھے۔

"میں یہیں سے الگ ہو جاتا ہوں" نوجوان نے کہا۔

اس سے جدا ہو کر کمسن خاتون نے اپنے گھر کی راہ لی - اور وہ اس کی سبک رفتار کو تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا - جب وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی - تو وہ جوہڑ کی جانب بڑھا۔

"اس کی ہستی میرے لئے ایک معمے سے کم نہیں"

اس نے بلند آواز سے کہا۔

(۵)

دوسری صبح کو منور کا نکاح پُرفلاح ہو چکا۔

"قبول کئے تم ؟" قاضی صاحب نے اس کے قریب کھسک کر کہا۔

"قبول کیا میں نے" منور کے ہونٹوں سے نکلا۔ مگر اس وقت کون جانتا تھا۔ کہ نوجوان اپنی تصور کی آنکھوں سے کس کا چہرہ دیکھ رہا ہے۔

اُس دن آسمان ابر آلود تھا۔ رات کو رسموں کے درمیان کچھ بارش بھی ہوئی دوسری صبح سے پہلے حلوہ کا آخری رسم ادا ہوا۔ اور اسی دن دس بجے دولہا والے دلہن کو لیکر روانہ ہوئے۔ منور اور دوسرے مرد اس کے قریب ایک دوسری گاڑی میں بیٹھ کر دوپہر سے پہلے، اپنے وطن راجگور میں پہنچے جو دلہن کے میکے سے قریب پینتالیس میل کے فاصلہ پر واقعہ تھا۔

مگر منور شام کے قریب دوبارہ ریل میں سوار ہوا۔ اور رات کے آٹھ بجے نندی میں آ پہنچا۔

ہوٹل میں کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر، آہستہ سلطان پیٹ کی جانب چلنے لگا۔ اور قریب ۱۰ بجے وہ اس پتھر کے قریب جا پہنچا۔ جس پر وہ اور ام ہانی اور اس کے نام لکھے تھے۔ گھٹتا ہوا زردی مائل چاند ابھی ابھی نکل رہا تھا۔ اس نے اس کی دھیمی روشنی میں دیکھا۔ کہ گذشتہ رات کی بارش کے باعث ان کے نام بالکل مٹ چکے تھے۔ وہ دیر تک یہاں کھڑا کمسن خاتون کا انتظار کرنے لگا۔ چاند بہت کچھ نکل آیا۔ مگر اُمی نہ آئی۔ وہ بیقراری سے چوراہے کی جانب بڑھا۔ اور دائیں طرف مڑ کر اس بڑے پتھر کے پاس پہنچا۔ جہاں اس نے پہلی دفعہ اُمی کو کھڑے دیکھا تھا۔ یہاں کھڑے ہو کر اس نے دلہن کے گھر کی جانب دیکھا۔ وہ بالکل اُجاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ پلٹ کر چوراہے پر سے ہوتا ہوا دوبارہ اپنے ملنے کی جگہ پر آیا۔ وہاں کوئی [illegible] تھا۔

یہاں سے نکل کر وہ ٹیپو مسجد کے قریب آیا۔ اور سلطان پیٹ کی سیدھ [illegible] ۔ وہ جگہ بالکل سنسان پڑی تھی۔ وہ دوبارہ دلہن کے گھر کے [illegible] سامنے سوکھے پتوں کے منڈرے کو دیکھنے [illegible] مسکراہٹ کے ساتھ کہا: اوہ

وہ دوبارہ ٹیپو مسجد کے پاس پہنچا۔ یہاں دیر تک ادھر ادھر نظر دوڑاتا رہا۔ پھر وہ مسجد کے اندر داخل ہوا۔ وہ بے حد تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ہاتھ کو تکیہ بنا کر اور اپنی لائی ہوئی شال اوڑھ کر وہ ایک کونے میں لیٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کے قریب وہ اپنے وطن پہنچا۔ گھر میں اس کی ماں۔ بہن اور دوسرے لوگ اس کو مرجھائے ہوئے نظر آئے۔ اور اس کو خاموش نظروں سے تکنے لگے۔ مگر اس نے اس کی پروا نہ کی۔

شام کو وہ دوبارہ حسب معمول منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ اور رات کو سلطان پیٹ پہنچا۔ اس رات کو بھی وہ بہت دیر تک خاتون کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ آخر کار وہ اپنی ناکامی پر اس طرح گویا ہوا ؎

ہوس پسند طبیعت نے کی بہت تدبیر
مگر نوشتۂ تقدیر سے سوا نہ ملا

ناممکن از نادان ناممکن اختری احمقانہ جنت کے خواب و خیال میں دنیا تیرا ساتھ دے۔ اور تیری ناجائز خوشی کا چھلکتا ہوا لبریز جام زمین پر نہ دے مارا جائے۔

"آہ ۔ ۔ ۔" اس نے مسجد میں داخل ہوتے ہوئے کہا "میرے سر میں کیسا شدید درد ہے۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن وہ اپنے گھر پہنچا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ بخار چڑھا ہوا تھا۔ جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ تو ساتھ ہی اسکی ماں بھی اندر آئی۔

"منور!" اس نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

منور نے ایک تھکے ماندے بیمار آدمی کی طرح پلنگ پر بیٹھتے ہوئے ادب سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

پہلی رات کو، اس کی ماں کہنے لگی "تم کسی دوست کی بیمار پُرسی کے لئے گئے۔ خیر۔ مگر کل رات ؟ منور کیا تمہارے دوست کی بیماری میں کچھ افاقہ ہوا۔ یا آج کی رات کو بھی تمہیں جانے کی ضرورت ہو گی؟"

"آج رات کو جانے کی کوئی ضرورت نہیں" منور نے کہا۔ "وہ مر چکا"

کل رات کو میں اس کی تجہیز و تکفین میں شامل ہونے کے لئے گیا تھا۔"

بڑھیا چپ چاپ کھڑی تھی۔ وہ متاثر معلوم ہو رہی تھی۔

"اماں جان" اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم میری فکر نہ کرو۔ مجھے صرف تھوڑے سے آرام کی ضرورت ہے۔ میں آج سے کہیں نہ جاؤں گا۔"

وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ اور اس کی ماں کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس کے چار دن بعد کا ذکر ہے۔ منور اب بالکل تندرست تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور اسکی بڑی بہن اندر آئی۔

"بھائی!" اس نے کہا۔

"کیا ہے؟" نوجوان نے اس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی بہن سے بہت محبت کرتا تھا۔

وہ اس کے قریب آئی۔ اور کتاب کو اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ بھائی! کیا کہیں ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ دلہن کا منہ نہ دیکھنے کی قسم کھائے ہوئے ہو۔ کسی بدکردار نے اس کے متعلق تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"تو کیا تم اپنی بے توجہی سے اسے مار ڈالنا چاہتے ہو؟ بیچاری آدھی رہ گئی ہے۔ اور جب دیکھو۔ رونے سے ہی کام ہے۔ بھائی ضرور تمہارے دل میں کوئی بات ہے۔ جو تم مجھ سے چھپانا چاہتے ہو۔"

"کوئی نہیں" اس نے کہا۔ "اگر کچھ ہو۔ تو تم جانتی ہو۔ تمہارے سوا میرا کوئی رازدان نہیں۔"

"تو پھر میں نہیں سمجھتی۔ تم نے کیوں اس کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھ رکھا ہے۔ اور وہ ہے کہ" اس کی بہن نے اس کے قریب آکر آہستہ سے کہا "کل سے تمہارے سامنے نہ چلنے کے لئے مجھے مجبور کر رہی ہے بھائی کیا تمہارا یہ خیال ہے۔ کہ بات چیت کی ابتدا عورت کی طرف سے ہوگی؟ ہرگز نہیں اور کیا وہ خوبصورت نہیں؟ ذرا دیکھو تو۔ میں اس کو بلا لاتی ہوں مگر یاد رہے تم کو پہلے بات کرنی ہوگی!

نوجوان چپ چاپ اپنی بہن کی باتوں کو سنتا رہا۔ وہ اس کی خاموشی

منور دوبارہ کتاب اٹھا کر اس کے کسی ایک صفحہ پر ایک غیر ارادی نظر ڈالنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ پھر کھلا۔ اس کو محسوس ہوا۔ کہ دو عورتیں اندر داخل ہوئی ہیں۔

"بھائی" اس کی بہن اسکو متوجہ کرنے کے لئے گویا ہوئی۔ منور کی نظریں کتاب سے اٹھ کر زمین پر پڑیں۔ اس کے بعد اسکی سیدھ میں دلہن کے سفید قدموں پر پڑیں۔ اس سے بڑھ کر اسکی نیلگوں ساری اور بعد اس کے دائیں ہاتھ کی پشت پر پڑیں۔ انگوٹھے کے قریب اس کو ایک سیاہ لکیر نظر آئی۔ اس نے فوراً لڑکی کے چہرہ پر نگاہ دوڑائی۔ منور کا دل اس زور سے دھڑکنے لگا۔ کہ پھٹا جاتا تھا۔ کم سن عورت نے اپنی گھنی دراز پلکیں اٹھائیں۔ اور ان کے اندر سے نشۂ شباب سے مست آنکھیں اس کو کمال افسردگی سے دیکھنے لگیں۔ اور ساتھ ہی ان میں آنسو بھر آئے۔

"کون! میری امی!" نوجوان کی زبان سے نکلا۔ اور کتاب پھینک کر وہ ام ہانی سے ہم آغوش ہو گیا۔ اور وہ منور کے سینے پر سسکیاں لینے لگی۔

منور کی بہن اپنے بھائی کی اس غیر متوقع حرکت پر تصویر حیرت بن گئی۔

"ہاں بہن" نوجوان نے خاتون کی مضبوط گرفت سے آہستہ الگ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے پہلے ہی مجھے کیوں نہیں بتایا۔ کہ دراصل میں نے ام ہانی سے شادی کی تھی!"

"ام ہانی؟" اسکی بہن کے تعجب میں اضافہ ہو گیا۔ "مگر ان کا نام تو خورشید النساء ہے!"

"ہاں" منور نے کہا۔ "میں نے پہلے بھی وہ نام سنا ہے۔ مگر نہیں۔ میں نے انہیں ام ہانی یا صرف امی کے نام سے جانا ہے۔ اور یہی نام مجھے پیارا ہے۔ میری خواہش اور خوشی ہے۔ کہ انہیں تم بھی اسی نام سے مخاطب کیا کرو۔"

اس کے بعد انہیں خاموش پاکر اسکی بہن کمرے سے باہر چلی گئی۔

"میری عزیز دھوکہ باز" منور نے اپنی بہن کے جاتے ہی کہا

"تم نے پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیا۔ کہ تم

"مجھے اس کا مناسب موقعہ ہی نہ ملا۔ اور ایک دو دفعہ میں نے کہنے کی کوشش بھی کی۔ مگر تم نے اس کو اپنے خیال کے مطابق پھیر دیا۔ اور میں سمجھتی تھی۔ کہ اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ اور تم شادی کے بعد ہی مجھ سے ہمیشہ کے لئے مل جاؤ گے۔"

"ہاں اُمی مجھے یاد ہے۔"

"مگر میرا نام اُمی نہیں خورشید۔۔۔"

"اُمی اور آخیر دم تک اُمی" منور نے کہا۔ "وہ تمام رسمیں جو کسی خورشید نامی سے میری شادی کے متعلق وقوع پذیر ہوئیں۔ میرے نزدیک ایک مصلحت آمیز دروغ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ جن کا قدرت سے کوئی لگاؤ نہیں۔ مجھے صرف میری دادی کی سوسن۔ میری آہو چشم اُمی چاہیے۔ اور رہے قسمت۔ وہ میری ہے۔"

اُمی اور سورانی اس مسرت بھری شادمانی کی خوشی میں درگاہ پر گئے جہاں اُمی ایک رنگین دوپٹہ سر پر لپیٹ کر بڑے تالاب کے کنارے کھڑی اپنی آئندہ زندگی کو پُر بہار بنانے کے لئے دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ فقط

(بنگلور)　　(مسبر معروف)

ہزار کی ایک بات

کشمکش

از جناب:-
عبدالرشید طارق ایم اے

جولیا رچرڈ پلنگ پر لیٹے خاوند کی راہ تک رہی تھی۔ شب نصف سے زیادہ گذر چکی تھی۔ پلنگ کے قریب جلتی ہوئی شمع گل ہو چکی تھی۔ شمعدان کی پیالی میں سوختہ بتی ابھی تک گرم پگھلی ہوئی موم میں تیر رہی تھی۔ اور پیالی کے لبوں پر موم کے منجمد ریشے غار کے منہ پر برف کے ریشوں کی طرح آویزاں تھے۔ چند ایک کتابیں پلنگ پر بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ وہ ناول پڑھنے کی تمام مساعی کر چکی تھی۔ لیکن بے سود۔ اب وہ تکیوں پر ٹیک لگائے ایک ننھی سی فاختہ سے جو لیس میں اس کے پیراہن خوابی پر کاڑھی ہوئی تھی۔ ایک عصبی کیفیت میں اپنا دل بہلا رہی تھی۔

اس کا چہرہ گولائی کی طرف مائل اور پُرگوشت تھا۔ اس کا اوپر کا لب ذرا سے سیاہ تھا۔ جس سے باریک دھندلی سی مونچھوں کا سا شبہ ہوتا تھا۔ لیکن دراصل وہ بالوں کے وجود سے معرا تھا۔ لب اوپر کی طرف مڑا ہوا تھا۔ اور ناک سرے سے ذرا سی چپٹی تھی۔ اس سے ان دونوں کا درمیانی فاصلہ جو اس خاتون کی اعلےٰ تربیت کی بدولت پہلے ہی غیر معمولی طور پر تھوڑا تھا۔ اور بھی ماند پڑ گیا تھا۔ ایک بادوق انسان کی نظروں میں منہ اور ناک کے اس چھوٹے سیاہ اور گہرے درمیانی فاصلے نے اس کے چہرے کو ایک عجیب کشش بخشدی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھیں اور باریک کئے ہوئے سیاہ بال جو کانوں کے ارد گرد مائل بہ سعبدی تھی۔ اس کے حسن میں ایزادی کا باعث تھے۔ اس کی حرکات میں اگر ذرا بھی گرمجوشی۔ بیتدمی اور جوش نفسانی کا اظہار ہوتا۔ تو اس کا چہرہ یقیناً ایسا تھا۔ جو ایک انسان میں بے پایاں قلبی ہیجان پیدا کر دیتا۔ لیکن اسکی حرکات و اطوار ایک نہایت ہی مہذب۔ بالشکر۔ محتاط اور شریف النفس عورت کی سی تھیں۔

بہرکیف مہذب ترین عورت بھی جب چار پائی پر اکیلی ہو۔ تو اپنے حسن کی نمائش کچھ اس طرح کرتی ہے۔ کہ ایک انکار پسند اور باضابطہ انسان بھی خوش کے تاثرات کے خلاف بے حس نہیں رہ سکتا۔ گوشت سے بھرے ہوئے شانے اور ابھی صرف ایک معمولی سے بند سے مستتر۔ بلوریں سینہ جو بھرپور ہلکے سانس کے ساتھ پیراہن خوابی کی لیس والی جھالر سے اُبھرتے تھے۔ اس کے جسم کے خیال اور پُرگوشت دوائر جو بستر کی بدنظمی کی وجہ سے نیم عُریاں تھے۔ اسکی نشہ انگیزی میں جو اسکی راہبانہ حیا سے کم نہ ہوئی تھی۔ اضافہ کرتے تھے۔

وہ اپنے خاوند کے خیال میں ایک ایسی زبردست خواہش کے لئے ڈوبی ہوئی تھی۔ جس سے وہ خود شرمائی اور خوف کھا کر رہ گئی۔ ان کی شادی ہوئے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی تک وہ ایک دوسرے سے قریباً قطعاً ناآشنا تھے۔ اٹھائیس برس کی عمر میں اسکی شادی ہوئی تھی۔ جب کہ وہ دوشیزہ اور بے ضرر ترین عشوہ گری سے بے بہرہ تھی۔ ایک عالی مرتبت ادیب کی دختر ہونے کی وجہ سے اسکی پرورش ایسی ادبی فضا میں ہوئی تھی۔ جو ٹوبلس ایسے یونیورسٹی شہروں میں بھی زندگی کے حقائق سے دور افتادہ تھی۔ اس کا میل جول اور راہ و رسم چونکہ صرف اپنے ابا جان سے رہی تھی۔ جو تقریباً ہر خیال کو نہایت ہی متین اور سنجیدہ ادبی تکلفات کے سانچے میں ڈھالنے کے عادی تھے۔ اس لئے ان حسی لذات کی طرف اس کے جسم نے کبھی رغبت ہی نہ کی تھی۔ جو ایسی اخلاقی بندھنوں میں تربیت یافتہ عورتیں بہت محسوس کرتی ہیں۔ چنانچہ ایک بے اخلاق دماغ کے ساتھ اس میں ایک راہبہ کی سی جسمانی حسیات اور عادات سرایت کر گئیں۔ جب والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور شادی کے لئے خود [illegible] تو اس کی نظر انتخاب عمداً [illegible] ایسے بھاری بھر کم [illegible]

ر اپنے ہمجولیوں میں بشیرو جوز کے نام سے معروف تھا۔ وہ فٹ بال
مشہور کھلاڑی۔ وحشی اور سراپا بہیمیت تھا۔ اس نے اس کو منجملہ دیگر
امیدواران شادی سے جو محض اسکی موروثی دولت کے خواہاں تھے۔
ت انہی خصوصیات کو پیش نظر رکھکر منتخب کیا تھا۔ ایسا انتخاب مروجہ
دم اور یقیناً ہماری اصلیت پسند اور ترجمانِ حقیقت ادبیات کا ثمرہ تھا۔
علاوہ دیگر اس کا دارومدار تمام تر فطرتِ خام کی پرستش پر تھا۔

ایک شرمگین بوسے کے علاوہ جو اس نے اسکو اس رات دیا۔ جب کہ
ں نے شادی کی درخواست کی۔ اس سے قبل اکے لب ایک دوسرے
سے بالکل ناآشنا تھے۔ انکی شادی ہو گئی۔ لیکن جب خود کو تسلیم کرنے
مسئلہ درپیش آیا۔ تو خاوند کے خلاف منافرت کی آگ غیر معمولی طور پر اس
کے دل میں بھڑک اٹھی۔ اُف! وہ کتنا وحشی۔ کسقدر بہیمیت سے بھرا ہوا
تی نظر آتا تھا۔ وہ پرجوش تھا۔ اور جوش بھی ایسا جسکی اصلیت اس کے
ولیا کے لئے بربریت سے کہیں بڑھ کر تھی۔ چونکہ روجرز نے بھی اس کی
لت اور اس کے خاندان کے معاشرتی اقتدار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس
ے شادی کی تھی۔ اس لئے وہ بھی اپنی حیدہیلی خالی از لطف اور ناتراشیدہ
یقدمیوں کی شکست دیکھ کر زیادہ مصر ہونے سے باز رہا۔ اور دوسری عورتوں
ہمجولیوں کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ جولیا کی نزاکتِ طبع کو بالکل
سمجھ سکا۔ اور نہ ہی وہ اتنا لطیف و تراشیدہ تھا۔ کہ ترغیبات سے اس کی
نسائیت کو بیدار کر سکتا۔ وہ اس کے لئے بے لطف اور بے حس تھی۔

ڈلہن کے رواج کے مطابق اسکی سہیلیاں آ آ کر اسے بستر کی بدعنوانوں
داستانیں سنائیں۔ اپنے آپکو انکی طنز آمیز نفرت سے بچانے کے
اس نے اپنے خاوند کو شہری رہائش چھوڑ کر دُور پہاڑوں میں سکونت اختیار
کرنے پر مجبور کیا۔ یہاں آکر معاملات بد سے بدتر ہو گئے۔ لبٹر کسی سرکاری
ملازمت پر مامور تھا۔ کچھ اس قسم کی جو معقول اور مشہور کھلاڑیوں کے مداح
ان کے لئے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ صبح سویرے وہ موٹر میں گھر سے نکل جاتا
رات گئے واپس آتا۔ ہفتہ کی رات کو عموماً کوئی نہ کوئی جشن ہوتا۔ اور وہ
پیئے نشہ کے عالم میں گھر آیا کرتا تھا۔ کٹر کیتھولک ہونے کی
حالت میں وہ ایک مریض کی طرح تائب ہو جاتا۔ اگر کسی تازہ
معاشقہ میں گرفتار ہوتا۔ یا کسی پرانے سے تنگ آ چکا ہوتا۔ تو ایسے موقعوں
پر ایک شدید ردِ عمل محسوس کیا کرتا۔ لعنتیں بھیجتا۔ صلواتیں سُناتا۔ چیزوں
کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھینکتا۔ خدا سے اپنے گناہوں
کی پاداش میں موت مانگتا۔ اور بسا اوقات سخت ہسٹیریا کی سی حالت میں
طعام گاہ کے فرش پر لیٹ جاتا۔ اور یہاں یہ ڈرامہ اختتام پذیر ہو جاتا۔

جولیا بے حد تنہائی محسوس کرنے لگی۔ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب مقامی ڈاکٹر
اس کا اکیلا سہارا تھا۔ ڈاکٹر کے ذریعہ اس نے اپنے خاوند کے دل میں رشک
کی آگ جلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن سب لاحاصل۔ روجرز کی حس طبعی اثر
استعجاب سے یایاں تھا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور بدستور ہر شب اس کے
کمرے میں جسکا دروازہ وہ قدرے وا رکھتی تھی۔ جھانک کر اپنی متبسم آواز میں
شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے کی راہ لیتا۔ ہفتہ کی رات کو وہ نشستگاہ میں
کاؤچ پر خراٹے بھرتا۔ نیند میں بڑبڑاتا اور آخر اسی پر رات کاٹ دیتا۔

یہ حالت سخت پریشان کن تھی۔ اور جولیا کی خواہش اسکے لئے ہر روز
بڑھتی بڑھتی خطرناک صورت اختیار کر رہی تھی۔ اسے ان سہیلیوں سے بے حد
نفرت ہونے لگی۔ ڈاکٹر بھی اپنی بھوری چھوٹی مونچھوں اور دبی طرز کورنش کے
باوجود اس وحشی کھلاڑی کے قرب کی غیر معمولی جاذبیت کو زائل کرنے میں ناکارہ
تھا۔ اسی ملکیت میں رکھتے ہوئے اس سے قطعاً ناواقف! العجب!
ثم العجب!!

پلنگ پر لیٹے وہ یہ سب کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے علاوہ اسے
ایک اور بات کا بھی خیال تھا۔ اور یہ بات خاوند کی خواہش سے بھی زیادہ خوفناک
تھی۔ وہ وثوق سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ کہ وہ کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی چیز واقعی
پیش آئی۔ تو وہ نہایت ہی بھیانک ہو گی۔

یا اللہ! سونا یا اکیلے لیٹ رہنا ناممکن تھا۔ وہ پلنگ پر ایک مریض
کی طرح مضطرب اور بے قرار تھی۔ اسنے کپڑے اُتار اُتار کر پھینکنا شروع
کر دیئے۔

جون کی تپش ریز رات تھی۔ بڑی کھڑکی کھلی تھی۔ اور اس کے ہلتے ہوئے
پردوں میں سے رات کی حسیات سے مربوط خوشبو چھن چھن کر کمرے کو مہکا
رہی تھی۔ پردوں کا رنگ نارنگی کی مانند تھا۔ اور وہ اندر آتی ہوئی چاندنی

کے خوبصورت ستونوں کو مختلف الوان میں منتشر کرکے پُر تکلف پلنگ اور جولیا کے گمراہ کن پریشان جسم پر منعکس کر رہے تھے۔ پردوں کی سوزنوں میں سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ستاروں سے لدا ہوا نیلگوں آسمان اور پہاڑیاں خاموشی میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ اور اس کی آرزو کو اپنے دلوں میں جگہ دیئے ہوئے ہیں۔ ہلکی ہلکی ہوا سرگوشیوں کے مانند تھی۔ جو اسے کسی نادیدہ عاشقانہ آغوش کی طرف بلا رہی تھی۔ رات کی نرم نرم حرارت اور چاندنی سے منور بلندیوں کے ہوس رانتیب دلنواز نے اس کے دماغ میں پُر جوش اور نو خیز رلیاں اور ہزارہا محبت بھرے پریوں کے جوڑوں کا خیال جو کسی خنک زار کے فرش زمردیں پر ایک دوسرے سے لپٹے عاشقانہ غزلیات کو چاند کی مرتعش روشنی کیساتھ ہم آہنگ کرتے تھے۔ اس کے دل میں پیدا ہو کر چٹکیاں لینے لگا۔

اس خیال سے شرما کر اس نے ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ اس کے رخسار دہکتی ہوئی آگ کی مانند جل رہے تھے۔ وہ سہم گئی۔ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ تو ابھی ایک بجا تھا۔ وہ اور بھی خوفزدہ ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ اس کے کانوں میں کوئی آواز پڑے۔ لیکن دور جب کوئی کتا بھونکا۔ تو اس کے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔ اور وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

آخر کار پلنگ سے اتر کر اس نے خادمہ کے لئے گھنٹی بجائی۔ قبل اس کے کہ اسکی ضرورت یا اہمیت کا علم ہو۔ گھنٹی زور سے چیخ اٹھی۔ وہ چاہتی کہ اس نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ اس خواہش کے لئے وہ ایک جائداد دینے کو تیار تھی۔

پلنگ پر واپس لوٹ کر اس نے خود کو کپڑوں میں لپیٹ لیا۔ اور انتظار کرنے لگی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اور وہ دعائیں مانگ رہی تھی۔ کہ کاش خادمہ گہری نیند سو رہی ہو۔ کچھ عرصہ کے بعد جو اس کے لئے نہایت ہی طویل تھا۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سُنی۔ کوئی خود کو گھسیٹتا ہوا آ رہا تھا۔ اتنے میں خادمہ نے دروازے پر دستک دی۔

"سیلی۔ اندر آ جاؤ" اس نے کہا۔

ایک ادھیڑ عمر کی مضبوط عورت کمرے کے اندر داخل ہوئی۔۔۔ وہ [illegible]

تھی۔ لیکن اس کا تمام جسم اس میں چھپا ہوا نہ تھا۔ اس کا چہرہ گلاب کی طرح سُرخ تھا۔ جبڑا بھاری۔ اور نیلگوں متبسم آنکھیں۔ اس کا مستقل جثہ اور قوی ارادہ والے لوگوں کی طرح نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ فی الواقعہ ایک عظیم الجثہ عورت تھی۔

"اوہ سیلی" جولیا نے اسے مخاطب کرکے کہا۔ "مجھے سخت افسوس ہے۔ میں نے بڑا ہی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ اور لاعلمی میں یونہی گھنٹی بجا دی تھی"۔

سیلی نے اپنی شمع پلنگ کے قریب میز پر قرینہ سے رکھ دی۔ "ایک ڈراؤنا خواب! کیا واقعی!" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی اپنی مخل شدہ نیند کی وجہ سے ذرا ترش لہجہ میں تھی۔ "مجھے تو ابھی نیند آ رہی تھی۔ میں کتاب پڑھ رہی تھی"۔ پھر خود کو اچھی طرح سے ہلا جلا کر۔ "ایک ڈراؤنا خواب! تم کیا کہہ رہی ہو!"

"سیلی جاؤ۔ پھر سو رہو"۔ جولیا نے نرمی سے اس کے بازو کو تھپکاتے ہوئے کہا۔ "معاف کرنا۔ تم کس قدر مشفق ہو۔ حقیقت کچھ بھی نہیں۔ مجھے سخت افسوس ہے۔ جاؤ پھر سو رہو!"

"ایک ڈراؤنا خواب! تم کیا کہتی ہو؟" سیلی نے کرسی پر بیٹھ کر اپنے بازوؤں کو سینہ پر رکھتے ہوئے دہرایا۔ "کس نوعیت کا تھا؟"

جولیا گمگوں ہو گئی۔ سیلی اب پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ اور ایک بڑھی خادمہ کی سی جرأت و شوخی سے اپنی نوجوان مالکہ کو دیکھ رہی تھی۔

جولیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اپنی تمکنت سے ہاتھ ملا کر بولی تو شرمائی سے کہنے لگی: "سیلی میں چاہتی ہوں۔ کہ تم جا کر سو رہو"۔

"کیا وہ ابھی تک نہیں آیا؟" سیلی نے پوچھا۔

"نہیں"۔

سیلی نے اسی قسم کی آواز نکالی جس طرح کوئی کسی چیز کا ذائقہ چکھتے وقت نکالا کرتا ہے۔

"یہ بھی غضب ہی"۔ اس نے بڑبڑا کر کہا۔ "میں نے جس [illegible] خاندان کی خدمت کی ہے۔ ہاں خدا اسے غریق رحمت کرے [illegible]

[illegible]

ایکدم ہی منٹ میں جولیا نے اشک شوئی شروع کر دی۔ "اے
تم علیل تو نہیں ہو؟" سیلی نے پوچھا۔ جواب متذبذب تھا۔
"کیا میں ڈاکٹر رچرڈز کو صبح سویرے بلا بھیجوں؟"
"نہ نہ۔ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ میں صرف تنہائی محسوس کر رہی ہوں۔"
"کوئی عجیب بات تو ہے نہیں۔ وہ زیادہ فاصلے پر بھی نہیں رہتا۔ مجھے
اس نوجوان آدمی سے نفرت سہی۔ ہاں ہاں۔ میں اسے بالکل پسند نہیں کرتی۔
لوگ سُنی سُنائی باتوں کو بھول تھوڑا ہی جاتے ہیں۔ اور وہ جو کچھ سُن نہیں سکتے
وہ خود تراش لیتے ہیں۔ جب میرا خاوند زندہ تھا۔ (خدا اسکی روح کو آرام بخشے) تو وہ ایک شیطان کی طرح ....."
"کیا باتیں کر رہی ہو تم؟" جولیا نے درشتی سے کہا۔
"اور تم کس لئے مجھ پر ناراض ہو رہی ہو؟" سیلی نے اپنے جبڑے
کو دباتے ہوئے کہا "شِشت! کیا میں بیس سال تک تمہاری والدہ کی خدمت
میں نہیں رہی؟ اس نے اپنے بستر مرگ پر مجھ سے یہ کہا تھا۔ کہ سیلی دیکھو
اس کی خبر گیری کرتے رہنا۔ خدا تمہارے باپ کو غریق رحمت کرے۔ بہت
ہی لائق انسان تھا لیکن نہایت نرم۔ نہایت ہی نرم مزاج تھا۔"
"خدارا ایسی باتیں نہ کرو" جولیا نے کہا۔
لیکن اسکی طبیعت نے جلد ہی پلٹا کھایا۔ اور وہ اشک آلود ہو کر کہنے لگی
"سیلی۔ میں بڑی بدقسمت ہوں۔"
"ہوں" سیلی نے اپنے فربہ بازوؤں سے کھیلتے ہوئے کہا۔
"یہ تو بہت عرصہ گذرا۔ کہ میں نے اپنے آپ کو کہا تھا۔ کہ مجھے اب دخل انداز
ہو کر کچھ کہنا پڑے گا۔ لیکن کہتے ہیں۔ کہ عقلمند لڑکی کے دانت دھیرے دھیرے
نکلتے ہیں۔ اور ایک دور اندیش دانا بڑھیا کچھ کہنے سے پیشتر بڑی دیر
تک سوچتی اور تولتی رہتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں حالات کی اہلیت
سے بے خبر تھی۔ اس ووشنگ کے لونڈے کا آنا جانا۔ اپنے کھلونا صفت
خاوند کا بھول جانا۔ اور پھر خود ہی اسکی تلاش میں آنا۔ یہ سب تو ظاہر من الشمس
ہے میں سمجھتی تھی۔ لیکن قبل از وقت دخل دینا مفید نہیں ہوتا۔ میں بھی تو آخر
عورت ہی تھی۔ خدا اسکی طفلانہ روح پر رحم کرے۔"
"لیکن اب میں کیا کروں؟" جولیا نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا:
"جو کچھ مجھ سے ہو سکتا تھا۔ کر گذری۔"
"شِشت!" سیلی نے کہا۔ "اس دو کوڑی کے آدمی کے پچوں پیچ ہر کوئی
دیکھ سکتا ہے۔ وہ تو کبھی بھی اس سے رشک یا حسد نہ کرے گا۔"
جولیا سخت تکان محسوس کرنے لگی۔ اتنے میں پُر فریب چمک اس کی آنکھوں
میں نمودار ہوئی۔ دونوں عورتوں کی آنکھیں آپس میں چار ہوئیں۔ دو نسوانی آنکھوں
کے جوڑوں کے اتصال سے بڑھکر کوئی چیز اتنی لطیف اور پرمعنی نہیں ہوتی۔
جولیا کی آنکھیں دوسری آنکھوں سے نفور تھیں۔ بڑھیا عورت نے ایک لمبا سا
سانس لیا۔ اور آنکھیں نیچی کرلیں۔ جولیا کے اوپر والے سیاہ لب میں ارتعاش
پیدا ہوا۔ اور وہ بے حد حسین نظر آنے لگی۔ بالکل ایک بلی کی طرح جو خوشی
میں نہیں بلکہ اپنے غصے کو چھپانے کے لئے خرخراتی ہے۔
"تمہیں اسے پیٹنا چاہیئے۔" سیلی نے سرگوشی میں کہا۔ "یہی ہے
جو تم کر سکتی ہو۔"
جولیا کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔
"ہاں ہاں۔ اسے خوب پیٹو۔" سیلی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے
کہا:۔ "میں اپنے خاوند کو تقریباً ہر ہفتے پیٹا کرتی تھی۔ وہ بڑا خوش طبع تھا۔
لیکن اسے فرش پر لیٹنا نہ آتا تھا۔ وہ بھی چینی کے برتنوں کے لئے بھاگا کرتا
تھا۔ میں اسے باقاعدہ پیٹا کرتی تھی۔ یہانتک کہ آخر کار وہ نہنگ اجل کا شکار
ہو گیا۔ خدا اسے غریق رحمت کرے۔ ہاں تم بھی اسے پیٹو۔ وہ اسی نوع کا
آدمی ہے۔ اور وہ عورتوں کی محض اسی سے قدر کرتے ہیں۔ اسے ہاتھ میں
پکڑ لو۔ اور دو سے ٹھکو۔ اور اتنا پیٹو۔ اتنا پیٹو۔ کہ رونے پر آجائے۔ اور بچے
کی طرح بلبلا اُٹھے۔ میں تمہارے قریب کھڑی ہونگی۔ اگر وہ یوں سیدھا
نہ ہو۔ تو عدالت میں دعویٰ دائر کر دو۔ ورنہ وہ نگوڑا ڈاکٹر تو تمہاری تباہی
کا باعث ہو گا۔"
جولیا بالکل ساکت رہی۔ اسکی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی۔ اس
بلی کی طرح جو کتوں کے حملوں سے دبک جائے۔ اور کسی کونے میں پناہ گزین
ہو کر اپنے پنجے ہوا میں مارتی ہو...... ایک شریف، خرخراتی ہوئی
پیاری بلی......
سیلی نے بڑی گرمجوشی سے خاوند کو پیٹنے کا بہترین طریقہ بالتفصیل

بیان کردیا۔ اس نے نہایت ہی دقیق تدابیر سوچ لیں۔ اور جولیا کی بےپروایانہ
سعی کو اپنا پاؤں زور سے مارتے ہوئے اور لبوں سے "شکست" کہہ کر
خاموش کر دیتی۔

وہ ابھی باتوں ہی میں مصروف تھیں۔ کہ بسٹر دروازے تک موٹر میں
داخل ہوا۔ "اب موقعہ ہے" سیسلی نے کہا۔ "اپنا ڈریسنگ گون اوڑھ
لو۔ اور یہیں انتظار کرو۔"

وہ گوش برآواز ہوگئیں۔ بسٹر کو گراج میں موٹر رکھتے ہوئے سُنا۔
صدر دروازہ کھلا۔ اور کمرے میں بسٹر کے لڑکھڑانے کی آواز آئی۔ "یا موسیٰ"
وہ بار بار ... بھدی آواز میں پکار رہا تھا۔ "یا موسیٰ! میں کیا کروں؟"

نشستگاہ میں داخل ہوکر وہ چیزوں کو ادھر اُدھر دھکیلنے لگا۔
کہیں ایک دیا سلائیاں توڑیں۔ پھر زور سے کسی چیز کو پاؤں سے ٹھکرایا۔ پھر
بالکل ساکن ہوگیا۔ ایک بار پھر بولنا شروع کیا۔ پہلے دھیمی آواز میں جو رفتہ
رفتہ اس بیتتے بیتتے بالآخر دعاؤں کا ایک طویل سلسلہ ہوگئی۔ "مجھے
میرے حال پہ رہنے دو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو" وہ کہہ رہا تھا "میں کشتی سمیت
غرق ہوجاؤں گا۔ میں گنہگار ہوں۔ ملعون ہوں۔ ایک بھٹکا راہوا۔ درگاہ ایزدی
سے راندہ ہوا عاصی ہوں۔ یہ میرا قصور نہیں .... میں اپنے بوجھ کو دھکیل
رہا ہوں۔ لیکن ... لیکن وہ مجھے اکیلا کیوں نہیں رہنے دیتے۔ مجھے میرے
حال پر کیوں نہیں چھوڑتے۔ میں پھر اس کا ارتکاب کرچکا ہوں۔ پھر اور پھر
اور پھر اس کو دور لے جاؤ۔ لنڈو' دور' دور' بہت دور ....."

"اب تمہارا وقت ہے" سسلی نے کہا۔ اور جولیا کو ہال دروازے
کی طرف دھکیل دیا۔ جولیا نے خود کو دھکیلے جانے کی اجازت دی۔ اور
ایش پلانٹ (Ash Plant) کو اُس کے ہاتھ میں زبردستی
دیا گیا تھا۔ قبول کرلیا۔

"یہ اتنا مضبوط نہیں" سیسلی نے اس کے کان میں کہا۔ "لیکن اگر تم
اس کے توڑنے میں کامیاب ہوگئیں۔ تو میں گولف سٹک لئے تمہارے
پیچھے کھڑی ہوں گی۔ اگر اس نے مقاومت کی کوشش کی۔ تو یہ اس کا کام
تمام کردے گی۔ لیکن یہ تمہیں اپنے ہاتھ سے کرنا ہوگا۔ ورنہ ....
تو اب آگے بڑھو۔ اس وقت وہ اپنے غصے کا اسیر ہے۔"

جب بسٹر فرش پر گر پڑا۔ تو سیسلی نے جولیا کے گولف بیگ میں سے
جو ہال کمرے میں آئینہ کی کِلی سے لٹک رہا تھا۔ ایک اسٹک نکال لی۔

بسٹر کے دھماکے سے کرسی کے بیٹھنے میں زلزلہ پیدا ہوا۔ اس کا ...
بیٹھنے والوں کی ہڈیوں کی طرح قالین سے ٹک ٹک کرنے لگیں۔
"یہی وقت ہے" سیسلی نے جولیا کو آگے دھکیلتے ہوئے سرگوشی
کی۔ "جب تک وہ شرارت پر آمادہ نہ ہو۔ تم اس کے سر پر ضرب نہ
لگانا۔ اس کی شکل کو مسخ نہ کرنا۔ صرف پشت پر ہی نشانہ باندھنا۔ ان
انہیں کوفت ہوتی ہے۔ کیونکہ انہیں اس سے بچپن کا احساس ہوتا
وہ کھلے ہوئے دروازہ سے نشستگاہ میں داخل ہوئیں۔ ...
تک ٹھڈے مارتا۔ قالین کو نوچتا۔ اور ناقابل فہم لہجے میں دعائیہ
فرش پر لوٹ رہا تھا۔

لیمپ کے شیڈ کو اتار کر اس نے زمین پر دے مارا تھا۔ جو
ریزہ ریزہ پڑا تھا۔ لیکن وہ لیمپ روشن کرنے میں ناکام ہی رہا۔ پھر
کمرہ اتنا منور تھا۔ جتنا کہ بڑی کھڑکیوں سے چاندنی کے ذریعے وہ
اسے بنا سکتے تھے۔ بسٹر لباس خوابی میں ملبوس تھا۔ چاندنی اس
سنہری گھنگھریلے بالوں سے اٹکھیلیاں کرکے انہیں جلا دے
رہی تھی۔ روشنی اس کی پشت پر پڑکر اس کی سیاہی کو نیم سبز رنگت
میں منتقل کررہی تھی۔ اس کا قد اچھا خاصہ لمبا تھا۔ لیکن اتنا تنومند کہ
گول مول اور پُر گوشت نظر آتا تھا۔ اس کا بدن چھریرا۔ مردانہ اور سڈول
کا حامل تھا .... چٹان کی مانند سخت۔ ٹھوس اور طاقتور اور ایک
گھوڑے کی طرح مہلک ....

جب اس نے عورتوں کو کمرے میں داخل ہوتے سنا۔ تو
قالین کے سرکو جسے دانتوں میں چبا رہا تھا۔ چھوڑ کر اپنا رُخ ادھر
کیا۔ اس کا چہرہ ایک نادان۔ سادہ لوح انسان کی طرح تھا۔
جسمانی طور پر اشتعال انگیز۔ یہ اس قسم کا چہرہ تھا۔ جسے دیکھ
عورتیں لرزنے لگ جاتی ہیں۔ اور آپ ہی آپ "کتنا وحشی ہے"
کہہ اٹھتی ہیں۔ لیکن جب وہ وحشی ان کے قریب پہنچتا ہے۔ تو وہ
عجیب قسم کی حرارت محسوس کرتی ہیں۔ جو ان کے چہروں کو تبسم
والوں کو پہلے سے زیادہ متحرک بنا دیتی ہے۔ ان کے جسم کی تمام
ان کے الفاظ کے غیظ و غضب کی تردید کرتی ہے۔ اور وہ کچھ خوف
کچھ لذت کی وجہ سے گر پڑتی ہیں۔

بسٹر نے اپنا سر اٹھایا۔ اور بیوی پر ایک ... کی طرح نظر کی

کا مشغلہ کھولا اور آنکھیں بھی بند تھیں - وہ بالکل مضحک بنا ہوا تھا۔ بیوی کا سامنا بظاہر اس کی غیر معمولی مایوسی اور اضطراب میں اضافہ کا موجب ہوا -

وہ بلند آواز میں "یا عیسیٰ" پکارا - اور عظیم سے اپنا سر فرشِ زمین پر ٹیک لیا -

"اب" اسیلی نے جولیا کو دیکھتے ہوئے جوش میں آہستگی سے کہا۔ جولیا تن گئی - اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ ڈریسنگ گاؤن کو ڈھیلا چھوڑ کر اور سینے کو عریاں کر کے دونوں جانب جا پڑے - وہ آہستگی سے بیش قیمت ڈریسنگ گاؤن کے اندر سے گلابی رنگ کی اونچی ایڑی والی گرگابی میں ملبوس چھوٹے چھوٹے پاؤں سے ڈگ بھرتی ہوئی آگے بڑھی - جب خاوند کے قریب پہنچی - تو غصے کی گڑواہٹ میں چھڑی کو بلند کیا -

پھر سکنت بے حس کھڑی ہو گئی -

"شرمت" سیلی نے دروازے پر کھڑے کھڑے کہا -

جولیا لرز گئی - اور ایک چھوٹا سا قدم اور آگے لیا - لبسٹر بلبلایا - اور ابھی اس نے ایک دوسری خوفناک چیخ کی تیاری کے لئے خود کو سمیٹا ہی تھا - کہ جولیا معاً آگے بڑھی - اور کمال بے رحمی سے جا کر ان اس کی پشت کو چیتایا - لبسٹر فوراً ساکت ہو گیا -

"پشت" سیلی نے پھر کہا -

جولیا نے آزاد ہاتھ سے اپنے سینے کو مضبوطی سے تھام لیا - اور ہانپ کر اپنے خاوند کی اسی جگہ پشت کے نچلے حصے پر ایک کافی شدید ضرب لگائی -

لبسٹر نے آہستگی سے اپنا سر اوپر اٹھایا - ذرا سا اپنے جسم کو پھرایا اور اپنی بیوی کی طرف دیکھا - حیرت اس کی آنکھوں میں جاگزیں تھی - اس نے ماتھے پر تیوری چڑھائی - ایسے گویا کہ وہ اسے پہچان رہا ہے - وہ اس آوارہ دیہاتی کے مشابہ تھا - جو پہلی مرتبہ شہر میں آئے - اور تھیٹر کے سامنے کسی نیم عریاں فیشن پرست خاتون کو موٹر سے اترتا ہوا دیکھ کر مبہوت کھڑا ہے جولیا نے بھی اسے دیکھا - اس کے چہرے کی کیفیت جلد ہی تبدیل ہو گئی - یہاں تک کہ اس کی آنکھیں تیزی سے چمک اٹھیں - اس کے دانت دکھائی دینے لگے - اس کے گالوں پر زردی چھا گئی - اور اس کی گردن کی رگیں پھول کر ابھر گئیں - شدت وحشت - تندی اور دیوانگی کے حدود تک بھی اتنی [illegible] صرف ایسی عورت ہی ہو سکتی ہے - جو جوش و عشق [illegible] -

"جولیا" - لبسٹر نے بڑی ملائم اور ہلکی آواز میں کہا -

یہ تلطف و نوازش تھی - وہ کبھی بھی اس سے اس طرح مخاطب نہ ہوا تھا - یہ اس آدمی کی آواز تھی - جو کسی خوبصورت عورت کو پہلی مرتبہ دیکھ کر جوش و محبت کے احساس شدید کی طوفان خیز امواج میں بے دست و پا بہہ نکلے - جونہی کہ اس نے اس کو اپنا نام لیتے سُنا - ایک پُر وحشت ہیجان اس پر مستولی ہو گیا - دانتوں کو پیستے ہوئے اس نے اس کی پشت پر ضربوں کی بوچھاڑ باندھ دی - پہلے وہ ایک ہاتھ سے مارتی رہی - پھر چھڑی کو دونوں ہاتھوں میں لیکر اپنی پوری طاقت سے ایک دیہاتن کی طرح جو کنوئیں پر کپڑے دھو رہی ہو - اسے بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا - وہ چیخنے لگا - اور جتنا اسے باز رہنے کی التجائیں کرتا - وہ اتنا ہی بوچھاڑ کو تیز کر دیتی - آخر زور سے ایک چیخ مار کر وہ پشت کے بل گر پڑا -

لیکن اب اس نے پیٹ پر مارنا شروع کر دیا - وہ ایک دفعہ اور پلٹا - تو بوچھاڑ اس کی پشت پر آ رہی - حتیٰ کہ اس نے کتے کی طرح ایک عجیب مضحکہ خیز آواز نکال کر سیٹی شروع کر دی - وہ سانس لینے کی خاطر ٹھہری - اس نے اپنے تئیں سمٹایا - اور ہاتھ پاؤں کو بلند کر کے چلایا -

"جولیا جولیا مجھے مت مارو" - اور اس کے آنسو اُمڈ آئے - دانتوں کو پیس کر چھڑی کو گردن کے گرد پھرا کر اس نے دوبارہ حملہ کیا - چھڑی اس کے دائیں بوٹ پر پڑی - اور تڑاخ کر کے ٹوٹ گئی -

جولیا ٹوٹی ہوئی چھڑی پھینک کر ہاتھ ملنے لگی - لبسٹر روتے ہوئے ابھی تک فرش پر اس کی زد سے بچنے کے لئے ادھر ادھر لوٹ رہا تھا - اس نے اس کے تعاقب میں ایک قدم لیا - پھر ٹھہر گئی - اور اپنا انگوٹھا چوسنے لگی -

"یہ لو براسی دگولف سٹک - شرمت" سیلی نے پیچھے سے اس کے کان میں کہا -

جولیا نے خادمہ کی طرف خشمناک غصہ میں گھور کر دیکھا -

"چلی جاؤ" - اس نے کہا - جاؤ جا کر سو رہو - تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اس نے براسی لے لی - اور خادمہ کو کمرے سے باہر دھکیل دیا - سیلی نے بڑے مؤدبانہ لہجہ میں اور معذرت کے انداز میں تعرض کیا - موجودہ حالت میں جولیا سے مذاق کرنا آسان نہ تھا - اس وقت شیطنت کا بھوت اس پر

سوار تھا۔

سیلی جولیا کی خواب گاہ میں گھس گئی۔ اپنی شمع لی۔ اور لباس خوابی کو سمیٹ کر زیر لب بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جولیا بھی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ دروازے کو مقفل کر کے کمال خستگی میں اسی پر جھک گئی۔ اس کا سر شانوں پر گر پڑا۔ اس کی ٹانگوں میں لرزش تھی۔ اور حلق خشک۔ لیکن وہ وحشیوں کی طرح ہشاش بشاش تھی۔

اس نے اپنے دل کی دھڑکن کو فرط مسرت سے سُنا۔ اس نے کس فعل کا ارتکاب کیا ہے؟ اسے قطعاً پرواہ نہ تھی۔ وہ بے باک اور کھوئی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اور مبہم کچھ سوچتی چلی جا رہی تھی۔

"اب کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں، میں کبھی بھی تکلیف میں مبتلا نہ ہونگی اب میں آزاد ہوں"۔

اشک اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ وہ لڑکھڑا کر پلنگ پر گر پڑی۔ اور فوراً ہی سخت خوف زدہ ہو گئی۔ ایک پہلو پر لیٹ کر اس نے چادر سر پر اوڑھ لی۔ اور ٹانگوں کو سمیٹ لیا۔ ہر لحظہ اسے یہ خیال تھا۔ کہ اب کپڑا اس پر سے کھینچ لیا جائے گا۔ اور پھر کوئی ہولناک حادثہ ظہور میں آئے گا۔ اس میں سانس لینے کی بھی جسارت اور سکت نہ رہی تھی۔ لیکن وہ واقعات کی منتظر رہی۔

مکان میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ اس سکوت سے وہ اور بھی گھبرا گئی۔ اور اپنا سر باہر نکال کر پھر خیالات کے گرداب میں پھنس گئی۔

"وہ سو گیا ہوگا۔ کسقدر مضحکہ خیز ہے۔"

یہ خیال اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس خیال سے کہ اس کو چھٹنے کا نتیجہ کسی پُرحول صورت میں ظہور پذیر ہو گا۔ خوف زدہ ہونے کی بجائے اب وہ متنفر سی ہو گئی۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر زار و قطار رونے کے قریب ہی تھی۔ کہ اسے ایک آواز سنائی دی۔ لیسٹر باہر برآمدے میں بڑے زور زور سے سانس لیکر بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ جولیا نے ایک گہرا سانس لیا اور مٹھیاں میٹ لیں۔ اسے احساس ہو رہا تھا۔ کہ چند ہی لمحوں میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ کیا وہ اس کے دروازے کے پاس سے گزرے گا؟

وہ ٹھہر گیا۔ جولیا نے اسے دروازے کے ہینڈل کو آہستہ گھماتے سنا۔ ایک عجیب انداز کی مسکراہٹ اس کے لبوں [illegible] کچھ وقفہ کے بعد اس نے یہ آواز سُنی۔

"لعنت ہو اس پر کمبخت مقفل ہے۔ جولیا"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"جولیا بولو تو سہی۔ کیا سو گئی ہو؟"

وہ بالکل نہ بولی۔ لیکن بستر پر اضطراب کی حالت میں کروٹیں [illegible] اس پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ جاگ رہی ہے۔ پلنگ [illegible] کر رہی تھی۔ "جولیا مجھے جواب کیوں نہیں دیتیں؟"

اس کی آواز میں آزردگی اور خستہ پن موجود تھا۔ میں جانتا ہوں [illegible] سوتی نہیں۔ دروازہ کھولو۔ جولیا۔ کیوں نہیں کھولتیں۔ میں ۔۔۔۔ کی توضیح کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں باہر سے بات نہیں کر سکتا۔ کتا نہیں ہوں۔ میں گنہگار ہوں۔ لیکن کتا نہیں۔ جولیا۔ میں [illegible] پر جھک کر اپنے گناہوں کا اعتراف کروں گا۔ مجھے ایک موقع [illegible]

جولیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس میں ایک تلاطم پیدا ہو [illegible] آواز کو ذرا سا بلند کر کے کہنے لگا۔

"میں ۔ میں صرف تم سے کہنا چاہتا تھا۔ لیکن [illegible] تھا۔ کہ تم مجھ سے اکتا گئی ہو۔ تنگ آ گئی ہو ۔۔۔۔ اور [illegible] مجھ سے یونہی شادی کی۔ میں اب چلا جاؤں گا۔ لیکن صرف گناہوں کی معافی مانگ لینے دو۔ دروازہ کھولو۔ اور مجھے [illegible] مجھ میں بھی خودداری ہے۔ دروازہ کھولو۔ میں کہتا ہوں۔ [illegible] انسان سے باتیں نہیں کر سکتیں؟"

وہ منتظر رہا۔ لیکن صدائے برنخاست۔ جولیا فرط جوش [illegible] کھولنا چاہتی تھی۔ لیکن کمال سعی اور ضبط سے اپنے آپ کو [illegible] رکھا۔ لیسٹر نے پہلے ہاتھوں اور پھر پاؤں سے دروازہ [illegible] کیا۔ یہ جدوجہد اور شائستہ آواز جو اس نے پیدا کی۔ اس کی [illegible] کو زائل کرنے میں مؤثر ثابت ہوئی۔ اور اس نے [illegible] تم مجھے تالا لگا کر باہر نہیں رکھ سکتیں۔ میں بھی اپنے [illegible] میں دروازہ توڑ دوں گا [illegible] ۔۔۔۔۔۔" پیچھے ہٹ کر اس نے تمام طاقت سے [illegible]

…دھکیلا۔ تالا ٹوٹ گیا۔ دروازہ ٹوٹ کر یکدم کھل گیا۔ اور کیواڑ دونوں طرف … گئے۔ بستر خوابگاہ کے دروازے میں لکڑی کے انبار پر گرا۔ جو لیا … ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ اور چادر سے سینہ کو ڈھانپ لیا … گھبرا کر اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہوا۔ اور پلنگ کے کنارے پر ہاتھوں کو ٹیک کے … پر نگاہ ڈالی۔

"جولیا"۔ اس نے آہستگی سے اس کے شانوں کو مس کرتے ہوئے کہا۔ … کے چھونے پر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اور اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کا ہاتھ اس کے شانوں پر مضبوط ہو گیا۔ اور اس کا منہ اس کے منہ کے قریب تر۔ معاً اس نے اُچک کر اسے اپنی آغوش میں لے کر بڑے زور سے لپٹا لیا۔ دونوں ساکت تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اس کے پہلو میں لیٹا سو رہا تھا۔ اس کا ندین گھنگھریالے سر اس کے شانے پر پڑا تھا۔ وہ غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چمک رہی تھیں۔

"لیکن وہ مسرت و شادمانی کے آنسو تھے"

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

(از جناب چودھری غلام رسول صاحب مہر بی اے - مدیر انقلاب)

مسلمانوں نے عرب کے بے آب وگیاہ ریگستانوں اور صحراؤں سے نکل کر
جس سرعت وتیز رفتاری کے ساتھ اقلیمیں اور سلطنتیں مسخر کیں اس سے زیادہ
سرعت وتیز رفتاری کے ساتھ علوم ومعارف کی سرزمینوں پر قبضہ کیا۔ تاریخ
اس حقیقت کی شاہد ہے کہ جس جس فضا میں اسلام کا پرچم حکومت لہرایا۔ وہاں
علم وحکمت کی تمدنیوں کا ایسا سامان ہو گیا کہ دنیا کا مشام جاں آج تک
ان کی خوشبوؤں سے معطر ہے۔ کسی اسلامی حکومت کی سرگزشت اٹھا کر دیکھئے
آپ کو اس کے ہر دور میں علم پروران علم وفضل کا ایک ایسا وسیع حلقہ
نظر آئے گا کہ دوسری حکومتوں کی صدیوں کی سرگزشتیں بھی اس کی نظیر پیش کر سکیں گی

ہندوستان میں سب سے پہلے عربوں نے اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی
لیکن ان کا اثر زیادہ تر صرف ایک گوشہ میں محدود رہا۔ ان کے بعد یہاں کی
تمام اسلامی حکومتیں عجمیوں کی قائم کی ہوئی تھیں اور حکومتیں قائم کرنیوالے
مجاہد اسلامی علوم کے چنداں ذوق شناس نہ تھے۔ تاہم اس سرزمین کا کوئی گوشہ
بھی اسلام کی علمی گوہر باریوں سے محروم نہ رہا اور شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو
جس میں یگانہ ارانِ فن کی ایک دو سرگرم شہسواری نظر نہ آتی ہو۔ لیکن
جامعیت علوم ظاہر وباطن کے اعتبار سے ہندوستان کے علماء میں جو مقام
بلند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہ ہوا۔ اور
بارھویں صدی کے اس مجدد اعظم کی شان سب سے الگ ہے۔ ہندوستان
میں شاہ صاحب اور ان کے مقدس گھرانے کا نام بہت مشہور رہا ہے اور اس
سرچشمہ علم وفضل کا فیض ہندوستان سے باہر بھی دور دور تک پہنچا ہوا ہے
لیکن بہت کم لوگ ہیں جنہیں شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی معلوم ہیں۔
یہ مختصر سا مضمون اسی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے۔

شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر
رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اور آپ کی والدۂ محترمہ کا سلسلۂ نسب
کاظم پر منتہی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے شاہ صاحب خالص عربی النسل
فاروقی تھے :

آباؤ اجداد

تحقیقی طور پر معلوم نہیں کہ شاہ صاحب
کے آباؤ اجداد نے کب سرزمین عرب سے قدم باہر نکالا۔ نسب نامہ
سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت فاروق اعظم کے بعد
پشت ہی میں افراد خاندان کے ناموں میں عجمیت آگئی تھی۔
کہتا ہے کہ یہ خاندان دوسری تیسری صدی ہی میں عرب سے نکل
آباد ہو گیا تھا :

اس خاندان کے جو بزرگ سب سے پہلے ہندوستان
وہ شیخ شمس الدین مفتی تھے۔ شیخ ممدوح غالباً اسلامی حکومت
میں یہاں آگئے تھے۔ انہوں نے رہتک میں اقامت اختیار کی۔
میں بڑا آباد اور پر رونق شہر تھا۔ وہ ظاہری وباطنی علوم کے
تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے باکمال اور صاحب کشف بزرگ
انہوں نے رہتک میں ایک دینی مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ ان کے
ان کے فرزند ارجمند شیخ کمال الدین مفتی ان کے جانشین ہوئے
بعد ان کے فرزند قطب الدین نے مسند ارشاد و افتاد سنبھالی۔ شیخ

اشارہ بیٹے کی طرف نہیں بلکہ پوتے کی طرف ہے۔ لیکن اس واقعہ کے چند روز بعد شیخ موصوف نے شیخ محمد کی صاحبزادی نکاح کیا۔ اسی خاتون کے بطن سے شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے اور بشارت پوری ہوئی۔ شاہ صاحب خود لکھتے ہیں۔ کہ میری ولادت سے پہلے میرے والدین اور بعض نیک لوگوں کو میرے متعلق بہت سی بشارتیں ہوئی تھیں۔ شیخ عبدالرحیم نے فالنامہی شادتو کی بنا پر بیٹے کا نام ولی اللہ رکھا۔ چند روز کے بعد خواجہ قطب الدین کے مزار والی بشارت یاد آئی تو قطب الدین احمد نام رکھدیا۔ لیکن اس نام کو آج کوئی جانتا بھی نہیں اور "ولی اللہ" آفتاب جہانتاب کی طرح شہرت عامہ کے اوج پر جلوہ گر ہے ؛

عہدِ طفولیت

عہد طفولیت کے متعلق زیادہ حالات معلوم نہیں ہیں۔ شیخ عبدالرحیم متوسط طبقہ کے آدمی تھے ۔ معاش کی صورتیں اطمینان بخش تھیں۔ اس لئے شاہ صاحب کو کسی مالی تکلیف کا سامنا نہ ہوا۔ طبیعت میں شروع ہی سے بے حد سادگی تھی۔ کبھی کسی بات کی خواہش نہیں کرتے تھے۔ جس قسم کا لباس ملجاتا تھا پہن لیتے تھے۔ اور جس قسم کا کھانا ملتا تھا۔ خوشی کے ساتھ کھالیتے تھے بچپن میں ان کی تمام حرکتیں اتنی محبوب و دلفریب تھیں کہ ہر شخص ان کا والہ و شیفتہ بنا ہوا تھا۔ پانچویں سال میں قرآن مجید کی تعلیم کے لئے مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ ساتویں سال میں قرآن مجید ختم کرلیا۔ اسی سال شیخ عبدالرحیم نے انہیں نماز کے لئے کہا۔ اور روزے رکھنے کی تلقین فرمائی۔ اسی سال میں فارسی کی درسی کتابوں کی تعلیم شروع کی ایک سال میں فارسی کی تعلیم کو مکمل کرکے عربی صرف و نحو پر متوجہ ہوئے دسویں سال میں شرح ملا پڑھ رہے تھے۔ پھر معقول کی کتابوں کی تعلیم شروع ہوئی۔ ان میں بھی بہت جلد کمال حاصل کرلیا۔ پندرہ سال کی عمر میں تمام متداولہ علوم کی رسمی تعلیم مکمل کردی۔ اور اسی چھوٹی سی عمر میں آپ ارباب علم و فضل کے زمرے میں شامل ہوگئے۔ شاہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار سے ہر فن کی ابتدائی کتابوں کے علاوہ جو کچھ پڑھا اس کی تفصیل وہ خود بیان فرماتے ہیں :-

علمِ حدیث ۔ مشکوٰۃ شریف۔ تمام و کمال۔ لیکن چند روز کی بیماری کے باعث "کتاب البیع" سے "کتاب الادب" تک کا حصہ والد صاحب سے نہ پڑھ سکا صحیح بخاری شروع سے "کتاب الطہارۃ" تک۔ شمائل النبیؐ اول سے آخر تک

تفسیر ۔ تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک کے کچھ حصے باقاعدہ پڑھے اور باقی حصوں کا خود مطالعہ کیا۔

علم فقہ ۔ شرح وقایہ ۔ پوری ۔ ہدایہ کی دونوں جلدیں ۔ صرف تھوڑا سا حصہ چھوڑ گیا۔

اصول فقہ ۔ حسامی اور توضیح و تلویح ۔

منطق ۔ شرح شمسیہ کامل اور بعض مختصرات ۔

علم کلام ۔ شرح عقائد کامل ۔ شرح خیالی اور شرح مواقف کے کچھ

علم سلوک یعنی تصوف ۔ عوارف المعارف کا بڑا حصہ اور رسا نقشبندیہ ۔

علم حقائق ۔ شرح رباعیات ۔ لوائح ۔ مقدمہ شرح لمعات نقد النصوص ۔

خواص اسماؤ آیات ۔ والد بزرگوار کا ترتیب دیا ہوا مجموعہ ۔

ان کے علاوہ طب ۔ حکمت ۔ نحو ۔ معانی ۔ ہندسہ ۔ حساب وغیرہ کی بعض کتابیں پڑھیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب یہ کتابیں پڑھ چکا تو میرے ذہن اس درجہ فراخی اور وسعت پیدا ہوگئی کہ ہر فن کے پیچیدہ مسئلے ادنے توجہ کے ساتھ حل ہونے لگے ؛

شادی

شاہ صاحب کی عمر چودہ سال کی تھی کہ آپ کے والد ماجد نے شادی کے لئے سلسلہ جنبانی کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ صا سسرال کے لوگ ضروری سامان فراہم نہ ہونے کی وجہ سے کس قدر تاخیر خواہاں تھے۔ لیکن شیخ عبدالرحیم کو اصرار تھا کہ نکاح جلد ہو جائے۔ وہ فر تھے کہ اس عجلت کی حکمت بعد میں ظاہر ہوگی۔ چنانچہ شیخ موصوف کی خواہ مطابق شاہ صاحب کے سسرال کے لوگ رضامند ہوگئے۔ شادی کے پا تکمیل پہنچنے کے چند روز بعد شاہ صاحب کی خوشدامن کا انتقال ہوگیا پھر خوشدامن کی والدہ فوت ہوگئیں۔ شاہ صاحب کے ماموں شیخ فخر الد رحلت فرماگئے۔ بعد ازاں شاہ صاحب کی علاتی والدہ وفات پاگئیں آخر میں شیخ عبدالرحیم ایک مدت تک بہت سخت بیمار رہے ؛

علمی استغراق

رسمی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شاہ صاحب نے بذا خود مطالعہ شروع کیا۔ دن رات انتہائی استغرا

محویت کے ساتھ کتب بینی کرنے لگے۔ اس دوران میں بہت کم کھاتے۔ بہت کم آرام فرماتے اور سارا وقت کتابوں ہی کی صحبت بسر کرتے۔ شیخ عبدالرحیم نے شاہ صاحب کے چودھویں ہی سال میں اُن کے سر پر دستارِ فضیلت باندھ دی تھی۔ اور اس مبارک تقریب پر ایک عالیشان جلسے کا انتظام کیا تھا۔ جس میں وقت کے مشائخ۔ قاضی۔ فقہا اور علما شریک ہوئے تھے۔ اب شاہ صاحب نے شب و روز کی محنت سے اس دستارِ فضیلت کا طرہ آسمان پر پہنچا دیا اور باطنی علوم میں بھی بڑا کمال پیدا کر لیا۔

سترھویں سال میں قدم رکھا تو آپ کے والد بزرگوار شیخ عبدالرحیم نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اور علم و عمل کی مقدس گدی اپنے نوجوان اور بلند اقبال بیٹے کے لئے خالی کر دی۔

درس و تدریس

والد بزرگوار کے انتقال کے بعد شاہ صاحب نے مستقل طور پر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آپ کے علم و فضل کا ڈنکا دور دور تک بج گیا تھا۔ ہر طرف سے تشنگانِ علم جوق در جوق آپ کے پاس آتے اور سیراب ہوتے۔ تقریباً کم و بیش بارہ سال تک شاہ صاحب نے انتہائی جانفشانی اور محویت کے ساتھ یہ اہم خدمت انجام دی۔ طبیعت کو علوم کتاب و سنت سے بہت وابستگی تھی۔ اس لئے درس و تدریس بھی زیادہ تر انہی علوم سے متعلق تھی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث کی صحیح ترویج کی بنا ڈالی تھی۔ لیکن شاہ صاحب نے ان کی ڈالی ہوئی بنا کے کنگرے فلک بوس کر دئیے۔ اور ہندوستان میں سب سے پہلی مرتبہ کتاب و سنت کے حقیقی ذوق کا دریا موجزن ہوا۔ اسی زمانے میں آپ کی توجہ گرامی قرآن حکیم کے ترجمے کی طرف مبذول ہوئی۔ جو فتح الرحمٰن کے نام سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اور قرآن حکیم کا جو ترجمہ شیخ سعدیؒ کے نام سے منسوب ہے اور جس کی نسبت کلیتہً مشتبہ ہے اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو فتح الرحمٰن ساری تاریخ اسلام میں قرآن حکیم کا پہلا ترجمہ ہے۔ جس کیلئے اللہ تعالےٰ نے شاہ صاحب کا سینہ کھولا اور جس کے بعد ترجمۃ القرآن کی [illegible] آج بھی اربابِ علم و فضل کی نظروں میں فتح الرحمٰن کے پایہ کا ترجمہ کوئی موجود نہیں۔

سفرِ حج

۱۱۴۳ھ میں شاہ صاحب نے سفرِ حج اختیار کیا۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ یہ سفر اس وجہ سے اختیار کیا تھا کہ ترجمۃ القرآن کی وجہ سے بعض مُلّا شاہ صاحب کی جان کے دشمن بن گئے تھے۔ اور آپ کے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ایک موقعہ پر جب شاہ صاحب مسجد فتحپوری میں عصر کی نماز پڑھ رہے تھے تو تمام مخالفین نے آپ کے قتل کے ارادے سے مسجد کے دروازوں کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن آپ نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے اُن کے ہجوم کو چیرتے ہوئے باہر نکل گئے اور کسی کو آپ کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ مخالفت و دشنام کے اس طوفان کو دیکھتے ہوئے شاہ صاحب نے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ مدت کے لئے ہندوستان سے باہر چلے جائیں۔ لیکن ہمیں سفرِ حج کی یہ علت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ مُلّا اور مخالفین نے کچھ شور و غل ضرور برپا کیا ہوگا۔ اور اہلِ حق کی جماعت میں سے کون سا بزرگ ایسا ہوا ہے جسے اعلانِ حق کے بعد اپنوں کے ظلم و جور کا تختۂ مشق نہیں بننا پڑا۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ یہ مخالفت سفرِ حج کی وجہ تھی۔ شاہ صاحب خود فرماتے ہیں کہ اس سفر سے مقصود محض حرمین کی زیارت تھی۔ اور یہ چاہتے تھے کہ مشائخ عرب سے علمِ حدیث کی سند لیں۔ غرض ۱۱۴۳ھ میں وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے مکہ معظمہ پہنچے۔ حج سے فارغ ہوئے۔ پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں بھی کچھ مدت تک کسبِ فیض کرتے رہے۔ پھر وہاں کم و بیش ایک سال تک علماءِ حدیث اور مشائخ سے دلچسپ صحبتیں رہیں۔ اور آخر کار ۱۱۴۴ھ میں دوبارہ حج کر کے ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ کو جمعہ کے دن صحت و سلامتی کے ساتھ دہلی واپس پہنچے۔ شہر کے تمام باشندوں اور نامی گرامی علما نے آپ کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ یہاں پہنچتے ہی علم کا یہ تاجدار پھر مدرسہ رحیمیہ کی مسندِ درس پر اپنے حقیقی وظیفہ میں مشغول ہو گیا۔

فیوضِ حرمین

قیامِ حرمین کے دوران میں شاہ صاحب نے متعدد علما و مشائخ سے کسبِ فیض کیا۔ انہوں نے حدیث پہلی مرتبہ شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھی تھی۔ پھر مدینہ منورہ میں شیخ ابوطاہر مدنی سے سند حاصل کی۔ شیخ ابوطاہر شاہ صاحب کے بڑے معتقد تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ولی اللہ الفاظ کی سند مجھ سے لیتے ہیں اور میں معنی کی سند ان سے حاصل کرتا ہوں۔ شیخ ابوطاہر کے علاوہ شاہ صاحب نے شیخ محمد وفد اللہ ابن شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی کی درسگاہ میں بھی شرکت فرمائی اور موطا یحییٰ اول سے آخر تک سنائی۔ اور اس کے بعد شیخ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی

تمام مرویات کی اجازت حاصل کی۔ شاہ صاحب شیخ تاج الدین صاحب حنفی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور بخاری کی سماعت کے علاوہ کتب صحاح ستہ کے بعض مشکل مقامات۔ مؤطا امام مالکؒ۔ مؤطا امام محمدؒ۔ کتاب الآثار امام محمدؒ اور مسند دارمی کی بھی سماعت کی۔ اور شیخ تاج الدین نے خصوصیت کے ساتھ شاہ صاحب کو تحریری اجازت نامہ عطا فرمایا۔

جن بڑے بڑے مشائخ سے آپ نے فیض حاصل کیا۔ اُن کے نام یہ ہیں۔ شیخ احمد سناوی۔ شیخ احمد قشاشی۔ سید عبدالرحمٰن ادریسی۔ شمس الدین بن علاء بابلی۔ شیخ عیسیٰ جعفری مغربی۔ شیخ حسن عجمی۔ شیخ احمد علی۔ شیخ عبداللہ بن سالم البصری۔

وفات

حج سے واپسی کے بعد کا کوئی واقعہ قابلِ ذکر نہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ علم کے خدمتگذاروں کی زندگیوں میں حصولِ علم اور نشر و اشاعتِ علم کے سوا اور قابلِ ذکر واقعہ بھی کیا ہو سکتا ہے؟ ۱۱۴۵ھ میں حج سے واپس ہوئے اور ۱۱۷۶ھ تک درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں معارفِ کتاب و سنت کا ایک ایسا چشمہ جاری کر دیا۔ جو انشاءاللہ قیامت تک تشنگانِ علم کے لئے انتہائی فیض رسانی کا سامان بنا رہے گا۔ اُن سے پہلے ہندوستان، کتاب و سنت کے نام سے بھی نا آشنا تھا۔ لیکن ان کے بعد یہ نام ہر زبان پر جاری ہو گئے۔ اور آج شاید ہی کوئی قابلِ ذکر علمی مرکز اس سرزمین میں موجود ہو۔ جس کا سلسلۂ فیض شاہ صاحب کے مقدس وجود تک نہیں پہنچتا۔ ۱۱۷۶ھ میں ایک خفیف سی بیماری کے بعد ۶۳ برس کی عمر میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اور شاہ جہان آباد کے جنوب میں پرانی دلّی میں اس آفتابِ علم و فضل کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ تاریخِ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے ؎ ع

او بود امامِ اعظمِ دیں!

اخلاق و عادات

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہ صاحب کی طبیعت میں بے حد سادگی تھی۔ وہ بچپن میں بھی عام بچوں کی طرح کھیل کود میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ ایک ہم عمر کے ہمراہ باغ کی سیر کے لئے تشریف لے گئے۔ واپس آئے تو والد بزرگوار نے دستِ شفقت سر پر پھیر کر کہا۔ کہ فرزند عزیز! تم نے آج دن رات میں کیا چیز حاصل کی؟ دیکھو ہم نے اتنی دیر میں اسقدر درود پڑھی۔ والد بزرگوار کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی آپ فرطِ ندامت سے پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اور اس کے بعد کبھی گھر سے باہر نہ نکلے۔ آپ مکارمِ اخلاق کا نہایت مقدس نمونہ تھے۔ طبیعت میں بے حد تواضع تھی۔ بڑے عالی ہمت۔ فراخ حوصلہ اور مہمان نواز تھے۔ خدمتگارانِ دین کا خدمت بڑی ہی رادمردی سے کرتے تھے۔

مقام و منصب

علم و فضل میں اُن کے منصبِ بلند کی نسبت کچھ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ نواب صدیق حسن خاں نے نہایت صحیح لکھا ہے کہ اگر شاہ صاحب صدرِ اول میں موجود ہوتے تو امام الائمہ اور تاج المجتہدین کہلاتے۔ آج بھی تاریخِ اسلام کی بہت کم شخصیتیں علم و فضل میں ان کی برابری کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔ اور ہندوستان میں تو آج تک ایک بزرگ بھی شاہ صاحب کے مرتبہ کا پیدا نہیں ہوا۔ شاہ صاحب خود اپنے ترجمہ میں لکھتے ہیں۔ کہ "نعمتِ عظمیٰ برایں ضعیف آن است کہ او را خلعتِ فاتحیت دادند و فتح دورہ آخر بریں بردستِ وے کردند"۔ کون ہے جو اس قول حق سے اختلاف کی جرأت کر سکتا ہے؟

شاہ صاحب نہایت خوش تقریر تھے۔ شعر بھی فرماتے تھے۔ چنانچہ عربی میں آپ کے بعض قصائد اور فارسی میں بعض غزلیں اور رباعیاں مشہور ہیں۔ فارسی میں امینؔ تخلص فرماتے تھے۔ مکاتیب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا جن میں سے دس گیارہ مکتوب شاہ صاحب کی مفصل اردو سوانح عمری "حیاتِ ولی" میں چھپ چکے ہیں۔

مسلک

ہمارے نزدیک شاہ صاحب کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اُن کی سعی و کوشش سے کتاب و سنت کا صحیح ذوق ہندوستان میں پیدا ہوا۔ وہ خود اپنے مذہبی مسلک کی نسبت فرماتے ہیں۔ کہ "میں مذاہبِ مشہورہ میں بقدرِ امکان جمع کی کوشش کرتا ہوں اور صوم و صلوٰۃ اور وضو و غسل اور حج کے مسائل اس طرح پر ادا کرتا ہوں کہ جسے تمام اہل مذہب صحیح جانتے ہیں۔ جب یہ جمع و تطبیق غیر ممکن ہوتی ہے تو میں اس مذہب پر عمل کرتا ہوں جو دلیل کی رو سے زیادہ قوی اور حدیثِ صریح کے موافق ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس قدر علم عطا کیا ہے کہ ضعیف و قوی میں اچھی طرح فرق کر سکتا ہوں۔ اور فتویٰ کے وقت مستفتی کے حال کی بخوبی رعایت کر سکتا ہوں۔ میں خلاف مذہب کر

…ی کے مسلک کے مطابق جواب دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام مذاہب مشہورہ کی معرفت عنایت فرمائی ہے"۔ اور یہی مسلک آپ نے سلاسل سلوک میں اختیار فرمایا۔

تصنیفات یہ شاہ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ اور ان کے یگانۂ روزگار ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ آپکی چھوٹی بڑی تصنیفات کی تعداد اکیاون بتائی جاتی ہے۔ جن میں سے کم وبیش انتیس تیس کتابیں چھوٹے چھوٹے رسائل پر مشتمل ہیں۔ ہم ان تمام تصنیفات کا یہاں ذکر نہیں کر سکتے اور ان میں سے اکثر اس وقت کمیاب ہیں۔ سب سے پہلی قابل ذکر کتاب **فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن** یعنی قرآن حکیم کا فارسی ترجمہ ہے۔ جس کی سلاست۔ روانی۔ جامعیت اور حقیقت رسی اس وقت تک عدیم النظیر ہے۔ اور اس کی نسبت اختصار کے ساتھ اوپر ذکر آچکا ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت تک یہ ترجمہ تقریباً ایک کروڑ کی تعداد میں چھپ کر بک چکا ہے۔ قرآن کے متعلق شاہ صاحب کے دو اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ ایک **فوز الکبیر** جو فارسی زبان میں ہے۔ جس میں شاہ صاحب نے اصول تفسیر کو نہایت جامعیت کے ساتھ بڑے سہل انداز میں بیان فرمایا ہے۔ دوسری کتاب **فتح الخبیر** ہے جو آیات قرآنی کی تمام ماثور تفسیرات کا مرقع ہے۔

علم حدیث میں شاہ صاحب کی دو شرحیں ہیں **مصفّٰی** فارسی زبان میں موطا امام مالکؒ کی نہایت جامع اور نہایت عمدہ شرح ہے۔ دوسری کا نام **مسوّیٰ** ہے۔ یہ موطا کی عربی شرح ہے۔ مصفّٰی اور مسوّیٰ کسی زمانے میں یکجا شائع ہوئی تھیں۔ لیکن اب بہت کمیاب ہیں۔

فقہ حدیث میں شاہ صاحب کی سب سے بڑی اور سب سے مشہور کتاب اور بلا شائبہ مبالغہ شاہ صاحب کی بہترین تصنیف **حجۃ اللہ البالغہ** ہے۔ جس کے متعلق تمام اکابر علماء کا متفقہ قول ہے۔ کہ تیرہ صدیوں میں آج تک اس فن میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ کسی زمانے میں اس کا اردو ترجمہ بھی چھپا تھا۔ لیکن وہ آج کل کمیاب ہے۔ فقہ حدیث میں شاہ صاحب کے دو چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ اول **الانصاف فی بیان سبب الاختلاف** دوم **عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید**۔ ان دونوں رسالوں میں اجتہاد و تقلید پر نہایت عمدہ بحث کی گئی ہے۔ دونوں کے اردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

خلافت صحابہ میں شاہ صاحب کی سب سے بڑی۔ سب سے جامع اور سب سے بلند پایہ تصنیف **ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء** ہے یہ کتاب شاہ صاحب کے علم حدیث وتفسیر و تاریخ اور کمال استخراج مسائل کا ایک ایسا مرقع ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ حجۃ اللہ البالغہ کے بعد شاہ صاحب کی بہترین تصنیف ہے۔ اصل کتاب کسی زمانے میں مولانا جمال الدین مدار المہام ریاست بھوپال (جو نواب سید صدیق حسن خاں کے خسر تھے) کی کوشش اور خرچ سے شائع ہوئی تھی۔ لیکن اب بہت کمیاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں شاہ صاحب نے تفضیل شیخین کے متعلق **قرۃ العینین** کے نام سے کئی دس گیارہ جزو کا ایک رسالہ تصنیف فرمایا تھا۔

علم تصوف میں شاہ صاحب کے متعدد چھوٹے چھوٹے رسائل ہیں مثلاً **فیوض الحرمین**۔ **الطاف القدس**۔ **الدر الثمین**۔ **تاویل الاحادیث** **شرح رباعیتین**۔ **ہوامع شرح حزب البحر**۔ **انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ**۔ **سطعات** وغیرہ **انفاس العارفین** اپنے بزرگوں کے حالات میں لکھی تھی۔ ایک نہایت عمدہ تصنیف **تفہیمات الٰہیہ** ہے۔ **چہل حدیث** کے نام سے شاہ صاحب نے وہ حدیثیں بھی جمع کی تھیں جو اسلام کی مدار علیہ ہیں۔ حدیث میں ان کی ایک کتاب **تراجم بخاری** حیدر آباد کے دائرۃ المعارف میں شائع ہوئی تھی۔ باقی چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ بعض کتابیں اس وقت تک طبع نہیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک بلند پایہ کتاب کا قلمی نسخہ دیوبند کے کتب خانے میں موجود ہے

اولاد شاہ ولی اللہ کے چار بیٹے تھے اور چاروں ان کے بعد علم و فضل کی خدمت میں مصروف رہے۔ سب سے بڑے شاہ عبدالعزیز تھے۔ اُن کے کوئی نرینہ اولاد نہ ہوئی۔ صرف تین لڑکیاں تھیں جن میں سب سے بڑی صاحبزادی کی شادی شاہ رفیع الدین کے فرزند محمد عیسیٰ سے ہوئی۔ دوسری کی شادی شیخ محمد افضل سے ہوئی۔ انہی کے بیٹے شاہ محمد اسحٰق اور شاہ محمد یعقوب تھے جو بعد میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ تیسری صاحبزادی کی شادی سید احمد بریلوی کے مشہور خلیفہ اور رفیق مولوی عبدالحی سے ہوئی تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شاہ عبدالعزیز ہی سے متعلق رہا۔ ان کی مشہور تصنیفات **تفسیر عزیزی**۔ **تحفہ**

اثنا عشریہ - بستان المحدثین - عجالہ نافعہ وغیرہ ہیں۔ ، شوال ۱۲۳۹ھ میں انتقال کیا۔

شاہ ولی اللہ کے دوسرے بیٹے شاہ رفیع الدین صاحب تھے - جن کا اردو ترجمۂ قرآن مجید مشہور ہے - شاہ عبدالعزیز جب بہت سن رسیدہ ہو گئے تھے تو شاہ رفیع الدین صاحب ہی درس و تدریس کا کام انجام دیتے تھے - ان کے چار بیٹے تھے - وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

شاہ ولی اللہ کے تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادر تھے - جن کا اردو ترجمۂ قرآن سب سے زیادہ مقبول ہے - انہیں قلعہ معلے میں بھی بڑا احترام حاصل تھا - تمام شہزادے ان کا بڑا ادب کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی تھے - یہ وضع و لباس میں اپنے والد بزرگوار سے بہت ملتے جلتے تھے - ان کی ساری عمر توکل و قناعت اور درس و تدریس میں بسر ہوئی - انہی کے صلب سے اسلامی ہند کے آخری دور کا وہ جلیل القدر مجاہد پیدا ہوا جسے دنیا اسمٰعیل شہیدؒ کے نام سے جانتی ہے - شہیدؒ ۱۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور غالباً ۱۲۴۶ھ میں اپنے مرشد سید احمد بریلوی کے ہمراہ سکھوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہو گئے - ان کے سوانح حیات کی تفصیل کا یہ موقع نہیں - اللہ تعالٰے کو منظور ہوا تو ان کی سیرۃ علیحدہ لکھی جائے گی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مقدس خاندان کا ہندوستان میں اس وقت کوئی پتہ نہیں۔

بقیہ صفحہ ۱۴۴

رُودلی شریف ضلع بارہ بنکی - قیمت صرف ۸ ر حجم ۱۲۴ صفحہ - طباعت - کتابت کاغذ عمدہ۔

اس مختصر کتاب میں بڑے کام کی چیزیں لکھی ہیں - مثلاً اس کتاب میں کل ۱۵ عنوانات ہیں - اور ہر عنوان کے نیچے اس کے متعلق قرآن مجید کی آیت کا ترجمہ ہے - جس سے اس کے متعلق صاف اور واضح احکام ملتے ہیں - مثلاً جادو کے تحت میں لکھا ہے - جادو سکھانا اور کرنا شیاطین کا فر کا کام ہے - (البقرہ ۲ ع ۱۲)

جادوگر کہیں فلاح نہیں پاتا - (طٰہٰ - ع ۲)

شاعری - سیاست - آزادی - ہجرت - بہتان - مشورہ - قتل - انتقام - نکاح - رزق - سفارش - وغیرہ وغیرہ کل ۱۵ عنوان ہیں - اس کتاب سے قریباً قریباً زندگی کے ہر موضوع پر قرآن مجید کے احکام اختصار کے ساتھ مل سکتے ہیں۔

نقد و نظر!

داستان

"دنیا کی سب سے رنگین کتاب" فرانس کے مشہور ادیب پیئر لوئی کی تحریر خصوصی افروڈائیٹ کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب پر مترجم کا نام درج نہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مترجم پبلک کی نظروں کے سامنے نہیں آنا چاہتا۔ بہر حال ہاشمی بک ڈپو لوہاری دروازہ لاہور سے یہ کتاب دو روپے میں مل سکتی ہے۔

کتاب ۳۴۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتابت طباعت عمدہ ہے کاغذ سفید عمدہ کتاب مجلد ہے۔ اس لحاظ سے دو روپے قیمت کم رکھی گئی ہے۔

داستان ایک افسانہ ہے جس کا موضوع آج سے دو ہزار سال قبل مصر کے شہر سکندریہ کی کسبیوں کے حالات کو بے نقاب کرنا ہے۔ ان کسبیوں کے حالات نمایاں کرنے وقت قابل مصنف نے جنسی اخلاق و بداخلاقی فلسفۂ جنسی اور مواصلت کے ہمگیر لذات کو اس رنگین پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ کہ انسان لرزہ براندام رہ جاتا ہے۔

اس قسم کی رنگین اور عریاں کتابوں کی تصنیف کے متعلق مختلف نظریے اہل علم نے پیش کئے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ایسی کتابوں کی اشاعت محدود ہونی چاہیئے۔ اور قیمت کثیر۔ تاکہ ہر خاص و عام اس کا مطالعہ نہ کر سکے۔ صرف ماہرین فن۔ پروفیسر اور ذی علم حضرات صرف فنی یا علمی معلومات کے لئے ایسی کتابیں پڑھیں۔ بعض کا خیال ہے کہ انسان کو اس کے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ بہر حال ہم اس مختصر ریویو میں اس مسئلہ پر کچھ لکھنا نہیں چاہتے۔ صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اعتدال ہر صورت میں مدنظر رہنا چاہیئے۔

ترجمہ کے لحاظ سے کتاب کامیاب ہے۔ بعض مقامات اتنے جوشیلے ہیں کہ قابل مترجم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن ہر باب کی ابتدا میں جو اشعار لکھے گئے ہیں وہ سراسر محل میں ٹاٹ کا پیوند ہیں۔ یہ اشعار خواہ غالب کے ہوں یا مصحفی کے، مومن کے ہوں یا میر کے اس کتاب میں کہیں بھی موزوں نہیں۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں انہیں خارج کر دیا جائیگا۔

کتاب جنسی اصولوں کو کھلم کھلا بے نقاب کرتی ہے اس لئے اسے ۲۰ سال سے کم عمر کے آدمیوں کو مطالعہ نہیں کرنا چاہئے۔

دکن کی پری

اس کا دوسرا نام سنجوگتا ہے۔ جسے دہلی کے مشہور اہل علم جناب حکیم خواجہ سید ناصر نذیر صاحب فراق نے لکھا ہے۔ دکن کی پری ایک افسانہ ہے جس کی بنیاد تاریخی حقائق و شواہد پر رکھی گئی ہے۔ زبان بے حد پیاری واقعات دلچسپ اور زیر حت ہیں۔ قیمت صرف ۸ ۔ کتب خانہ علم و ادب متصل جامع مسجد دہلی سے طلب فرمایئے۔

نگارستان شعر یعنی گلشن فانی

ڈاکٹر شیخ مجیب الدین احمد فانی لدھیانوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جو ۱۰۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کتابت۔ طباعت کاغذ گوارا ہیں۔ قیمت صرف ۸ ۔ ملنے کا پتہ درج نہیں۔ معرفت حیدر برقی پریس دہلی طلب فرمایئے۔

ڈاکٹر مجیب الدین صاحب حضرت بیخود دہلوی کے شاگرد ہیں۔ استاد کے قلم سے ہی اس مجموعہ کی تعریف سنیئے :۔

"ڈاکٹر شیخ مجیب الدین احمد صاحب فانی۔ لدھیانوی میرے شاگرد رشید ہیں۔ باوجود نیا زبان ہونے کے ان کی زبان اہل زبان کی سی ہے۔ حمد و نعت اور منقبت کے ساتھ عاشقانہ رنگ بھی ان کا خوب ہے۔ چست بندش کے ہمراہ معنی یاب طبیعت رکھتے ہیں۔ باوجود زود گوئی کے فکر سے شعر کہتے ہیں۔ (بیخود)

احکام القرآن

مؤلفہ حبیب حسن صاحب صدیقی۔ پتہ سجاد حسن عبدالرزاق نواب بازار

دیکھو صفحہ

از ملک الشعرا حسان الملک بہادر خان صاحب ابوالاثر حفیظ جالندھری

لب بشکرِ چارہ ساز کا نغمہ لئے ہوئے
دل - دردِ جاں گداز کا شکوا لئے ہوئے

اب اشتیاقِ عرضِ تمنا نہیں رہا
اب ہر کوئی ہے عرضِ تمنا لئے ہوئے

میری یہ زندگی ہے کہ مرنا پڑا مجھے
اِک اور زندگی کی تمنا لئے ہوئے

شعلے ہیں سنگ سنگ میں کیوں رنگ رنگ کے
تم تو چھپے تھے ایک ہی جلوا لئے ہوئے

دریا سے موج اٹھی سوئے دریا پلٹ گئی
مجھ کو لئے ہوئے میری توبہ لئے ہوئے

ساقی ہے آج کون کہ ہر کوزۂ سفال !
آتا ہے ایک نور کا دریا لئے ہوئے

پروانہ دل لیئے ہوئے جل جائے بھی تو کیا
جلتی ہے شمع صورتِ زیبا لئے ہوئے

توبہ کئے ہوئے ہوں میں - یوں ورنہ ہر کوئی
پھرتا ہے مے پیئے ہوئے مینا لئے ہوئے

مردودِ میکدہ کو بھلا منہ لگائے کون
بیٹھا ہوں خانقاہ میں توبہ لئے ہوئے

غارت گروں کی طرح کمینگاہ ناز میں
بیٹھا ہے کوئی برقِ تجلّے لئے ہوئے

پہلے تو اہلِ ظرف کی تخصیص تھی حفیظ
اب ہر کوئی ہے ساغرِ صہبا لئے ہوئے

(حفیظ جالندھری)

ورلگ حال

کے

قا ی معاونین

صاحبزادہ محمد عمر ایم اے جمو

ـ سردار شہزادہ محمد ابراہیم اد ب لدہاہ

جناب ر ـ عـ
ور اے ـ ـ

جناب محمد اکبر بیگ صاحب صوفی

صدر ہ را تدمی

سندر سنسار

از جناب مسعود حسن صاحب ذوقی - ایم اے (علیگ) گونڈہ

(۱)

ایک سنہرا خواب ہے پیارے ——— یہ سندر سنسار
جوت کا مالا گلے میں ڈالے ——— رات کھڑی ہے دیپ نکالے

کہری تصل روپہلا پانی — ابھی ابھی رات سہانی
ایک نگر جل میں چاند کی نیا — تیر رہی ہے بنا کھویا
میٹھی میٹھی مدھم سے میں — گیت سناریں چنچل لہریں

آکاش پہ یہ ننھے تارے ——— جھوم رہے ہیں خوشی کے مارے
ایک سنہرا خواب ہے پیارے ——— یہ سندر سنسار

(۲)

ایک سنہرا خواب ہے پیارے ——— یہ سندر سنسار
سن میٹھا بھونرے ——— کانوں میں جیون امرت گھولے

رات میں مہکی رات کی رانی — ہوا نشیلی فضا سہانی
ہنکی ہلکی بھینی خوشبو — اس پہ قیامت چاند کا جادو
نیند تو مانو بھاگ گئی ہے — من کی دنیا جاگ گئی ہے

گالوں پہ بکھرے کاجل پارے ——— ہنس ہنس کرتی ہیں اشارے
ایک سنہرا خواب ہے پیارے ——— یہ سندر سنسار

(۳)

ایک سنہرا خواب ہے پیارے ——— یہ سدر سنسار
بن بن پھیلی ہے اجیالی ——— ندی ستو بہا جوت نرالی

بہتے ہے ندیا دھیرے دھیرے　　لہریں، مانو ترتے ہیرے
کومل جھونکے، ہوا البیلی　　مہکی مہکی، ایسی گھلی!
اوس کے موتی بکھرے بکھرے　　دوب کے اوپر کھلے نکھرے

جھلمل جھلمل کرتے تارے ——— آنکھ رہے ہیں مینک کے مارے
ایک سنہرا خواب ہے پیارے ——— یہ سدر سنسار

(۴)

ایک سنہرا خواب ہے پیارے ——— یہ سدر سنسار
دل سے جوڑے رشتہ ناتا ——— موہن کھڑی ہے دھرتی ماتا

چاند کی کرنیں برسیں چھم چھم　　لہریں مل کر ناچیں باہم
پیڑ کی ڈالیں جھوم کے لچکیں　　سنبل کو چوم کے لچکیں
اڑتے جگنو چھم چھم چمکیں　　ہوا میں ناچیں تھم تھم چمکیں

جھوم رہے ہیں خوشی کے مارے ——— پنچھی جگنو اور تارے
ایک سنہرا خواب ہے پیارے ——— یہ سدر سنسار

(ادتی)

مقالۂ علمیہ:-

کوہِ نور ہیرے کی خونچکاں داستاں

(از جناب مولانا معین الدین صاحب رہبر فاروقی (منشی فاضل))

اس موضوع پر مختلف اوقات میں قلم اٹھایا جا چکا ہے۔ لیکن لکھنے والوں نے کافی تلاش اور محنت سے قریباً بہت کم کام لیا ہے اور اس معروفِ عالم جوہر کے تفصیلی واقعات جس قدر مل سکتے تھے۔ اتنے بھی ایک جا جمع نہیں ہوئے۔ میں نے اپنی تحقیق اور تدقیق کے ساتھ جس حد تک مواد میرے وسترس کی حدود میں تھا۔ اُسے ایک کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ بھی سمجھتا ہوں۔ کہ اس پر کام کرنے والے بہت کچھ اضافہ کر سکتے ہیں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے میں نے مشہورِ عالم جواہر کے نام سے کچھ لکھنا شروع کیا تھا۔ جو ابھی تک نامکمل اور غیر مرتب حالت میں ہے۔ اس میں سے اب صرف کوہِ نور موتیوں والے حصے کو ناظرین کی نظروں کے آگے مختصراً پیش کر رہا ہوں اصل موضوع پر رجوع کرنے سے قبل۔ تمہیداً "ہیرے کی حقیقت" سے متعلق چند سطریں بیان اضافۂ معلومات کے لئے سپردِ قلم ہیں۔ اس پر تفصیلی مباحث اصل کتاب میں شامل ہوں گے۔

خدا بھلا کرے حکمائے عرب کا کہ اُن کے انفاسِ قدسیہ کی بدولت اور اُن تھک مساعی کی وجہ سے "علم الکیمیاء" ایک خاص حیثیت سے دوبارہ معرضِ وجود میں آیا۔ اور وہ اپنے اخلاف کے لئے اس فن کی طرح ڈال کر چل بسے۔ جسے مشرقی ملک وقوم کا دشمن طبقہ۔ یعنی بعض نا آشنائے محض۔ مغربی تعلیم یافتہ "مجہو سمی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ سلف ان کے ذمہ تھے۔ اور خلف اُن کے یہ ہیں۔ آج ان ہی کی یہ جگرکاویاں ہیں۔ جنہوں نے دانایانِ فرنگ پر اس موجودہ "الکیمیاء" (کیمسٹری) کی معروف حقائق اور کارخانۂ عالم سے حجاب کے پردوں کو اُٹھا کر راستہ پیدا کرنے کی نئی نئی تدبیریں بتائیں۔ اور اب یہ زندہ قوم مسلمان حکماء سے حیات کا سبق لے کر۔ ساری دنیا کو "حیاتِ جدید" بخشنے پر کمر باندھے ہوئی ہے۔ ان کے انکشافات و ایجادات کو معجزہ سے تعبیر کرنا۔ اگر بے ادبی ہے تو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کرشمہ سے کچھ کم بھی نہیں میں اس تمہید سے آپ کو یہ سنانا چاہتا ہوں کہ "ماہرینِ علم الکیمیاء" نے ہیرے کی جو حقیقت معلوم کی ہے۔ وہ عوام کیلئے ایک حیرت انگیز ہے۔ اصولی اور فنی مباحث کے اختلافات سے ہٹ کر صرف چند معتبر روایتیں منقول ہیں کہ:-

یہ ایک عام اور مشہور قول ہے کہ "الماس" جسے ہیرا کہتے ہیں۔ درحقیقت ایک پارۂ کوئلہ ہے۔ جو صناعِ ازل کی "بہتر از قیاس" صنعتوں سے ترقی کرتے ہوئے ایک آب دار ہیرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ مشرق کا مشہور مایۂ ناز فاضل فلسفی سعدیؒ کہتا ہے۔

سنگے بہ چند سال شود لعلِ پارۂ
زنہار تا بیک نفسش نشکنی بہ سنگ

سعدیؒ نے گو یہ شعر پند و نصیحت کے لئے لکھا ہے۔ مگر پہلے مصرع سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے عقلاء بھی اس عہدے

نہیں تھے۔ گو تسلیم کہ اس کی کوئی قسم بیان نہیں کی گئی ہے۔ اسلئے کہ یہ اخلاق و موعظت کی کتاب ہے کوئی فنی نہیں۔

بعض علماء کے نزدیک کوئلے اور ہیرے کے اجزائے ترکیبی میں کوئی فرق نہیں۔ وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ کوئلہ میں بھی "کاربن" ہوتا ہے اور ہیرے میں بھی۔ اول الذکر اپنی غیر مصفیٰ حالت اور جسمیت کی وجہ سے سیاہی میں ضرب المثل ہے تو "ہیرا" اپنی صفائی اور شفافیت میں لیکن یہ مسلم ہے کہ دونوں ایک ہی مادے یعنی کاربن کی دو صورتیں ہیں۔ مگر قدرت کی کاری گری ہر ایک کی ترتیب اپنے منشاء کی تحت خاص طور پر کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہیرا بن جاتا ہے اور دوسرا کوئلہ۔

کہتے ہیں۔ کہ ہیرے کے کیمیاء اجزا سب سے پہلے فرانس کے ایک فاضل کیمسٹ لواز (LAVOISEV) نے دریافت کئے۔ مگر افسوس ہے کہ آج مسلمانوں میں بہت کم ایسے باقی رہے ہیں۔ جو اپنے اسلاف کی تحقیقات کو سمجھیں اور ان پر غور کریں۔ اور دنیا کے ان جدید محققوں کو بتلائیں کہ آج آپ جو جو اپنے انکشافات بے ثابت کرتے ہیں۔ وہ ہمارے اجداد کی ہی تحقیقوں کا نتیجہ ہے۔ ہیرے کی کیمیائی ترکیب کے متعلق مسلمانوں کی تحقیق معلوم کرنے کی ضرورت ہو تو آج بھی ہر شخص "تَذْكِرَةُ أُولِي الْأَلْبَابِ الْجَامِعُ لِلْعَجَبِ الْعُجَابِ" کو جو تذکرہ داؤد انطاکی کے نام سے مشہور ہے اٹھا کر دیکھ سکتا ہے جس میں صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ ہیرے کا اصل مادہ رصاصی یعنی پنسل جیسا ہوتا ہے۔ پنسل اور کوئلہ کے قریبی تعلق کو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اس فاضل حکیم کے اصل الفاظ اور اس کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ جو جلد اول صفحہ ۲۵ (مطبوعہ مصر ۱۳۰۰ھ) پر ان الفاظ میں موجود ہے

"ماس: بالمهملة معروف من نمس الاحجار تكون يكون ذهبيًا نعانه رطوبة غليظة وحر مفرط فاتحد يبسه ومادته ... وموضع الهندي منه ... "

کوئلہ کے بارہ میں ... اقوال ہیں مشہور ... لیونارڈ (LEONARD) کی تحقیق ہے کہ اس زمین کے اندر کاربن کے بخارات بننے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور پیرٹ (PARROT) کہتا

ہے کہ کاربن کے ٹکڑوں پر تاب آتش حیہ کے پڑنے سے الماس بنتا ہے۔ چند کہتے ہیں کہ گرمی کی امداد سے یہ کاربن یا کاربونک ایسڈ سے بنا ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ نہیں یہ کوئی نباتاتی اشیاء کے اجتماع اور تحصیل کا نتیجہ ہے۔

ہیرے کو انگریزی زبان میں "ڈائمنڈ" (DIAMOND) اور فرانسیسی جرمنی۔ اطالوی۔ ہسپانوی زبانوں میں ڈایامنٹ (DIAMANT) لاطینی میں "ایڈی مس" (ADIMAS) عربی میں ماس اور "الماس" کہتے ہیں۔ چینیوں کے نزدیک اس کا نام "چوساک" ... سراندیپ (لنکا) میں "بجرم" سے پکارا جاتا ہے۔ سنسکرت میں "...ر" کہتے ہیں۔

قریباً دنیا کے سارے لوگوں نے بالاتفاق یہ تسلیم کر لیا ہے کہ روئے زمین کی ساری معلومہ اشیاء میں "ہیرے" سے زیادہ سخت ترین چیز آج تک دریافت نہیں کی گئی۔ کہتے ہیں کہ اگر الماس کو "سندان"[1] پر رکھ کر ہتھوڑے سے ضرب لگائیں۔ تو ہتھوڑا کانپ اٹھتا ہے۔ اور سندان ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے اس کے وجود بنانے چند طریقے اور ترکیبیں بھی اس کو توڑنے کی دریافت کر لی ہیں ہیرے کی اسی صلابت و سختی کا نتیجہ ہے۔ ہزاروں سال کے ہیرے آج ہم تک پہنچتے چلے آتے ہیں۔ اور دنیا میں ان میں مثال کے طور پر۔ کوہ نور اور لعل اعظم کے نام لئے جا سکتے ہیں جن کے سینکڑوں برس پہلے کے وجود کی تاریخیں شہادت دیتی ہیں۔

یہ دنیا کا عزیز ترین جوہر پہاڑوں کی چٹانوں یا زمین کے اندر ... اور دریاؤں کی گہرائیوں میں کہیں کہیں دستیاب ہوا کرتا ہے۔ اس کا

---

(۱) ... جواہر نامہ ... جواہرات کے فن میں نہایت عمدہ زبان اردو میں لکھی گئی ہے اس کے مصنف کا نام پنڈت امرناتھ ہے ۱۹۱۳ء میں خادم التعلیم ... سٹیم پریس سے شائع ہوئی تھی۔ ہمارے موضوع کا بڑا ماخذ یہی ہے۔

[1] سندان = آہن انانی جس پر سنار سونا اور چاندی رکھ کر ہتھوڑے سے کوٹتے ہیں ✦

سبب یہ ہے کہ اکثر اتفاقات بارش اور طغیانی کی وجہ سے جب پانی چٹانوں اور پہاڑوں سے بہ نکلتا ہے۔ تو یہ بھی اپنے اصلی مقام سے پانی کی رَو میں بہتا بہاتا دریاؤں میں جا گرتا ہے۔ یا کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ریت میں بھی ملتا ہے۔ یہ جس مقام پر پیدا ہوتا ہے عموماً وہاں کئی طرح کی مٹی اور پتھروں کے طبقے در طبقے ہوتے ہیں +

سب حکماء اس بات پر متفق ہیں۔ کہ سب سے پہلے دنیا میں ہندوستان ہی کو اس جوہر بے بہا کا علم ہوا۔ اور سب سے اوّل یہیں سے ہیرے برآمد ہوا کرتے تھے۔ جب کہ کسی ملک میں الماس کا شان و گمان بھی نہ تھا۔ اور نہ لوگوں کو اس کے متعلق کچھ معلومات حاصل تھیں۔ رُوما کا مشہور فاضل "پلی نے" جس کا زمانہ حضرت عیسےٰ ؑ سے (۵۰) سال بعد کا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس کے زمانہ سے کچھ ہی قبل رُومۃ الکبریٰ میں ہندوستان سے ہیرا پہنچتا ہے اور قریباً ۱۷۲۸ء تک دنیا کے مختلف مقامات پر یہاں کے ہیرے پہنچتے رہے اور ہندوستان کا ایسا مقام جہاں سے ہیرے نکلتے تھے۔ وہ دکن ہی کی جواہر خیز سرزمین ہے اور آج تک گولکنڈہ کا اس خصوص میں زبان زد خاص و عام ہے۔

ہم اپنی کتاب میں تاریخی دلائل سے یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ دنیا کے سارے مشہور و معروف۔ اور بڑے بڑے ہیروں کی ایک بڑی تعداد دکن ہی کی اُگلی ہوئی ہے جو گنست لگاتے ہوئے مختلف سلطنتوں اور مال داروں کے لئے سرمایہ افتخار بنی ہوئی ہے اور اُس کتاب میں دکن میں ہیروں کے مقامات کی خاص طور پر تحقیق سے لستان دہی کی کوشش اور تفصیل لکھی جائے گی۔

دنیا کا سب سے زیادہ مشہور اور معروف ہیرا "کوہ نور" جس کی خون چکاں داستان کو ہم نے اپنا عنوان قرار دیا ہے۔ بڑی مقدار کے معلومہ مشہور جواہر اور اُن کی قیمتوں کے لحاظ سے بارھویں نمبر پر پہنچتا ہے۔ اس کو صرف اُس کے تاریخی واقعات کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ بھی خاکِ دکن کا ایک ذرہ ہے اس کے تاریخی حالات اور واقعات کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائیے +

"کوہ نور" کی ہزاروں سال قبل کی افسانوی داستان کو گو معتبر مورخین تسلیم نہیں کرتے اور اس کا ذکر کم کرتے ہیں۔ لیکن ان واقعات کو ہم بھی پایۂ تاریخ سے ساقط سمجھتے ہوئے۔ صرف ناظرین کی دلچسپی کی خاطر ایک "داستان" کے طور پر سُناتے ہیں۔

غیر ثقہ مورخین جو واقعات سے صحیح نتائج نہیں اخذ کر سکتے۔ کہتے ہیں۔ کہ اس ہیرے کا وجود دنیا میں پانچ ہزار سال قبل کا ہے۔ چنانچہ تاریخی طرز میں یہ بات پیش کرتے ہیں۔ کہ کشمیر کی سرزمین پر آج سے پانچ ہزار سال پہلے "بھوری شو" نامی ایک راجہ حکمران تھا۔ اور یہ ہیرا اُس کے بازو بند میں جڑا ہوا تھا۔ جب کوروں اور پانڈوؤں میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ کشمیر کا راجہ واسودھن نامی راجہ کے طرف داروں میں شامل تھا۔ جنگ میں کوروں نے چکابورا نامی ایک قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ تو بعض لوگوں نے موقع پا کر ارجن کی بیٹی کو جو اس قلعہ میں محصور تھی۔ قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ کے دوسرے روز اس کا انتقام لینے لے لئے ارجن نے شدت کے ساتھ جنگ کی۔ اور ایک تیر ایسا مارا کہ وہ اتفاق سے راجہ "بھوری شو" والئے کشمیر کا بازو کاٹتے ہوئے نکل گیا۔ اور اسی کٹے ہوئے بازو پر اس نے جواہر بہن رکھے ہوئے تھے۔ جس میں کوہ نور بھی شامل تھا۔ اور یہ لبند قبالی بد مشتر کے ہاتھ آیا۔

بعض یہ سمجھتے ہیں کہ "کوہ نور" وہی ہیرا ہے جسے راجہ کرن (جو مہابھارت کے زمانہ کا مشہور راجہ ہے) بہ طور طلسم پہنا کرتا تھا۔ جو پانچ ہزار سال پہلے مچھلی پٹم کے قریب دریائے گوداوری سے نکلا تھا۔ ممکن ہے کہ راجہ کرن کا کوئی الماس ایسا ہو جو گوداوری سے دستیاب ہوا ہو۔ لیکن یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ وہی "کوہ نور" الماس ہے۔

کم و بیش یہ روایت قرین قیاس ہو سکتی ہے کہ یہ کوہ نور راجہ بکرماجیت حضرت عیسےٰ ؑ سے (۵۷) سال پیشتر مالوے کا حاکم رہا۔ اس کے پاس تھا۔ یہ ہیرا اس کی اولاد میں چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ گوالیار کے راجہ نے جس کا نام بھی بکرماجیت تھا۔ اُس نے اس کو علاؤالدین خلجی کی نذر کیا۔ اس اجمال کی تفصیل ہم چند سطر بعد ہی بیان کریں گے۔ کوہ نور ہیرے کی صحیح تاریخی داستان تیرہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے بعض نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ یہ ہیرا۔ راجگان مالوا کے پاس تھا۔

اس کے نام کے متعلق مختصر طور پر پہلے ہی کچھ لکھ دینے کی ضرورت

ہے۔ اس لئے یہ ہیرا جو اس وقت کوہ نور کے نام سے مشہور ہے اس کی ابتدائے تاریخ سے نادر شاہ کے ہاتھ لگنے تک اس کا کوئی خاص نام ہی نہ تھا ۱۷۳۹ء میں جوں ہی کہ یہ ہیرا نادر کے سامنے آیا خوشی اور مسرت کے لہجہ میں اس کی زبان سے لفظ "کوہ نور" نکلا یعنی اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ ہیرا اس قدر آب دار ہے۔ جیسے نور کا پہاڑ کہہ سکتے ہیں۔ نام کی اس مختصر سی تشریح کو سمجھ لینے کے بعد آگے تاریخی واقعات سنئے۔

جے۔ بی۔ ٹیورنیر نامی ایک فرانسیسی سیاح جو ہیروں کی تجارت کرتا تھا اور دکن کے ہیروں کی شہرت سن کر یہاں آیا ۱۶۴۵ء سے ۱۶۵۳ء تک اُس نے اِس مقصد کے تحت دکن کے چپہ چپہ کی خاک چھانی تھی۔ یہاں کے ہیروں کی کانوں اور ہیروں کے واقعات اس تفصیل سے لکھے ہیں کہ آج بھی اُس کے اِس سفرنامہ کو پڑھنے کے بعد اُن کانوں کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کوہ نور ہیرا "کولور" کی کان سے نکلا تھا۔ مگر اس نے کان سے نکلنے کی کوئی صحیح تاریخ یا سنہ کا تعین نہیں کیا ہے۔ یہ کان دکن میں دریائے کرشنا کے کنارے (۱۶) درجہ (۴۲) دقیقہ (۳۰) ثانیہ عرض بلد اور (۸۰) درجہ (۵) دقیقہ طول بلد پر واقع تھی[1]۔ اور لکھتا ہے کہ یہ "کان کولور" گول کنڈہ سے ۱۳½ کوس ہے جو ہمارے (۵۵) لیگ کے مساوی ہوتی ہے مسلی پٹم سے اس کا فاصلہ (۳۶) کوس نکلتا ہے جس کے (۷۲) میل ہوتے ہیں۔

ایک اور سیاح "ولیم میتھولڈ" نے جس نے ۱۶۲۲ء میں سیاحت کی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ کان مسلی پٹم سے (۱۰۸) انگریزی میل ہے۔ مگر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ صحیح فاصلہ (۱۰۰) میل تھا۔ یہ کان گول کنڈہ کی مشہور ترین کان تھی۔ جس کے متعلق ولیم میتھولڈ اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتا ہے کہ یہاں کے کان کھودنے والوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے۔ اور اس کان سے بادشاہ کو سالانہ تین لاکھ پیگوڈا (یعنی ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ) آمدنی ہوا کرتی ہے جس سے اس کان کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہم کان کے متعلق مختصر طور پر نوٹ لکھنے کے بعد کوہ نور کے علاؤالدین خلجی کے ہاتھ لگنے کی تفصیل لکھتے ہیں۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ جب ۱۳۰۴ء میں علاؤالدین نے مالوے کے راجہ پر فتح پائی تو نذر کے طور پر یہ ہیرا اُس کی بارگاہ میں پیش ہوا۔ پھر جب صلح ہو گئی تو سلطان نے اس کو راجہ کے پاس واپس بھیج دیا۔ اور ان لوگوں کے خاندان میں ایک عرصہ تک چلا آیا۔ جب ۲۲۔ اپریل ۱۵۲۶ء میں ہمایوں بادشاہ نے اپنے باپ کی معیت میں پانی پت کے میدان میں معرکہ آرائی کی اور کامیابی نصیب ہوئی۔ تو اس ہنگامہ میں مالوے کا راجہ جو سلطان ابراہیم لودھی کے ساتھ لڑائی کے لئے آیا تھا مارا گیا۔ تو اُس کے وارثوں نے یہ ہیرا پیش کر کے امان چاہی اور شاہی خواطفت کی درخواست کی۔ اس طرح یہ ہیرا پہلی دفعہ مغلیہ خاندان کے ہاتھ آیا۔ چنانچہ بابر نے اپنی تزک میں ۴ مئی ۱۵۲۶ء کے واقعات کے ضمن میں یہ لکھا ہے کہ۔

"جب ہمایوں آگرہ میں آیا تو بکرماجیت کی اولاد بھاگنے کے خیال میں تھی۔ ہمایوں نے سپاہی متعین کر دیئے تھے۔ انہوں نے روکا مگر ہمایوں نے اُن کے لوٹنے اور مارنے کی اجازت نہیں دی۔ انہوں نے اپنی خواہش سے بہت سا جواہر ہمایوں کی نذر کیا اس میں ایک مشہور ہیرا تھا۔ جو سلطان علاؤالدین لایا تھا۔ کہتے ہیں کہ بعض نے اس کی قیمت ساری دنیا کے خراج کا نصف تشخیص کی تھی غالباً اس کا وزن (۸) مثقال ہے۔ جب میں آیا تو ہمایوں نے اس کو میرے آگے پیش کیا میں نے ہمایوں ہی کو دے دیا[2]"

بعضوں نے لکھا ہے کہ اس ہیرے کی قیمت ساری دنیا کے ایک روز کے خرچ کے برابر تھی۔

بابر نے آٹھ مثقال کا اور اس کے بیان میں "مثقال" کا وزن (۴۰) رتی لکھا

---

[1] اس کان کے تعین مقام کے لئے "اکنامک جیالوجی آف انڈیا" میں تفصیل درج کی گئی ہے۔ ۱۲ [2] سیاحت نامہ ٹیورنیر صفحہ ۱۱ [3] ترجمہ تزک بابری مترجمہ میرزا نصیر الدین حیدر گورگانی مطبوعہ ۱۹۲۴ء برہنٹنگ ورکس دہلی صفحہ ۲۰۶ اصل تزک۔ ترکی زبان میں تھی۔ جس کا ترجمہ فارسی میں عبدالرحیم خان خاناں نے کیا اور فارسی سے اس کا اردو میں ترجمہ ہوا۔ ۱۲

ہے۔ جس کے (۱۸۷) قیراط ہوتے ہیں۔ اور قیراط[1] آدھے دانگ کو کہتے
ں۔ جو چار جو کے مساوی ہوتا ہے (۸۰) مثقال رتیوں کے برابر ہوں گے۔
اس لحاظ سے کوہ نور کا وزن رائج الوقت اوزان کے لحاظ سے اُس وقت
(۲۶) تولے ۸ رتی تھا۔ مورخ فرشتہ لکھتا ہے کہ بابر نے رعایا کے
ل واسباب کے معاوضہ میں صرف اس ہیرے کو لینا پسند فرمایا۔
س کا وزن (۸) مثقال یا (۲۲۴) رتی تھا۔ تو فرشتہ کے حساب سے
ل مثقال کی مقدار ۲۸۔ رتی کے برابر قرار پاتی ہے۔

ہم طول طویل مباحث کے عوض صرف اس بات کے لکھنے پر
تفا کریں گے کہ بڑی چھان بین اور انتہائی دقیق نظری کے بعد بہت سے
محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بابر کا یہ ہیرا ہی درحقیقت کوہ نور ہے۔

تزک بابری کے مترجم مسٹر انصیرالدین حیدر گورگانی ترجمہ کے
حاشیہ صفحہ ۲۶۵ پر لکھتے ہیں کہ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اُس ہیرے
و سلطان ابراہیم کی ضعیفہ ماں نے قلعہ دہلی میں شہزادہ ہمایوں کی نذر کیا۔
عجیب ہے کہ انہوں نے بابر کے اصل بیان کے بعد بھی یہ غیر معتبر بیان بغیر
سی حوالہ کے لکھدیا ہے۔ جب کہ بابر خود کہتا ہے کہ اس کو گوالیار کی
لی اولاد نے ہمایوں کی نذر کیا۔

ہندوستان بر مسز بوریج کا احسان ہے کہ اس نے دنیا کو۔
ہمایوں نامہ" سے رُوشناس کرایا۔ یہ کتاب ہمایوں بادشاہ کے
حالات پر اس کی بہن گلبدن بیگم نے شہنشاہ اکبر کی فرمایش پر لکھی
ہے۔ اس کی وجہ سے جہاں اور چیزوں پر تاریکی روشنی پڑتی ہے۔ اس
سے کوہ نور کے متعلق بھی کچھ گمان ہو سکتا ہے۔ اس کے دلایل یہ ہیں کہ
جب شیرشاہ سوری کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے ہمایوں کو ہندوستان
چھوڑنا پڑا تو اُس نے اس موقع پر دارالسلطنت سے نکلتے ہوئے قیمتی

لعل و جواہر بھی اپنے ساتھ لے لئے۔ اگر یہ اس کے ساتھ نہ ہوتے۔ تو پھر
کوہ نور ہیرا۔ جس کو بابر نے ہمایوں کو واپس دے دیا تھا۔ خاندان مغلیہ
میں کس طرح محمد شاہ تک پہنچ سکتا تھا۔ گلبدن بیگم کے ذیل کے بیان
میں جس میں جواہر کی تفصیل اور اُن کے نام ہیں۔ اور اُن کے متعلق
تشخص نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی یہ یقینی ہے کہ ان میں ضرور کوہ نور ہیرا
شامل ہے۔ بیگم نے جواہر اور الماس کی عوض "لعل" کا لفظ استعمال کیا
ہے۔ جس سے اختلاف ہو سکتا ہے کہ جب خود نام بھی درج نہیں علاوہ لفظ
لعل لکھا ہے تو کس طرح یہ بیان کوہ نور پر صادق آئے گا۔ اس کا جواب
یہ ہو سکتا ہے۔ کہ اس وقت تک "کوہ نور" کسی نام سے موسوم نہیں
کیا گیا تھا اور "لعل" کا لفظ خصوصاً عورتیں لعل اور جواہر دونوں کے
لئے استعمال کرتی ہیں۔ گو ان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اصحاب
میری اس رائے سے اختلاف کریں۔ اور وہ کر سکتے ہیں۔ مگر میں نے اپنی فہم
کے لحاظ سے اس قصہ کو بھی کوہ نور کے حالات کے ذیل میں درج کرنا مناسب
سمجھا ہے ممکن ہے کہ آئندہ کچھ اور تاریخی اسناد ہاتھ لگیں۔ اور اس کی تصدیق
و تکذیب ہو سکے

ہمایوں نامہ کے اصل واقعہ کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ہمایوں بادشاہ جب
خراسان پہنچا تو یہاں کے حاکم شاہ طہماسپ نے اس کو پناہ دی۔ اس وقت
ہمایوں کے سارے اُمرا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ مگر آخر وقت تک روشن نامی
ایک کوکہ خواجہ غازی اور حمیدہ بانو بیگم کا بھائی خواجہ معظم ہمراہی کا شرف رکھتے
تھے۔ اس آفت اور مصیبت کے زمانہ میں باوجود وفادار رہنے کے روشن
کوکہ نے پانچ لعل چرا لیئے۔ ان کا علم سوائے بادشاہ اور حمیدہ بانو کے کسی
تیسرے کو نہ تھا۔ اور یہ ہمایوں کی پیٹی میں رہا کرتے تھے۔ اور جب کبھی
ہمایوں باہر جاتا تو حمیدہ کے سپرد کر جاتا۔ ایک دن بیگم ۔۔۔۔۔۔

---

[1] ۱۵۶۳ء میں گارشیا دی آرٹا نامی ایک شخص نے ہند کی مفرد اور مرکب ادویہ پر ایک کتاب لکھی ہے اس میں اس نے قیراط کو دو گرین اور اصلی تین گرین کی لکھی ہے گرین دانہ گندم کو کہتے ہیں۔ میور رتی کو ۱/۲ قیراط لکھتا ہے۔ بعضوں نے یہ تشریح کی ہے کہ قیراط جسے انگریزی میں کیرٹ کہتے ہیں۔ تین گرین یا ۳/۴ رتی کے برابر ہوتا ہے اور (۱۵۶) قیراط کا ایک اونس یا (۳) تولے ہوتے ہیں ۱۲

بادشاہ کی اس بیٹی کو رومال میں لپیٹ کر پلنگ پر رکھ کر کے سو رہنے کے لئے گئیں روشن کوکہ نے موقع پا کر اس میں سے پانچ لعل چرا لئے اور خواجہ غازی سے سازباز کر کے اس کے حوالے کر دیئے۔ جب یہ بیٹی کھلی معلوم ہوئی تو فوراً حمیدہ بانو بیگم کو شبہ ہو گیا۔ اور ان کے چوری چلے جانے پر حیران رہ گئیں۔ بیگم نے یہ قصہ اپنے بھائی خواجہ معظم سے کہا۔ اس نے سن کر کہا کہ میں ابھی پتا چلاتا ہوں۔ خواجہ غازی نے حال ہی میں جو گھوڑے اس غربت کے عالم میں خریدے ہیں۔ جب کہ ایک حبہ بھی پاس نہیں تھا۔ مجھے اسی وجہ سے اس پر شبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے خواجہ غازی کے متعلق معلومات حاصل کر کے گھوڑوں کے سوداگروں کے پاس بھیجا۔ اور پوچھا کہ تم نے ان گھوڑوں کو کتنے میں بیچا ہے۔ تو اس نے کہا کہ خریدنے والے نے اسے لعل دینے کا وعدہ کیا ہے خواجہ معظم سوداگروں سے یہ سن کر خواجہ غازی کے گھر گیا۔ اور اس نے نوکر سے دریافت کیا۔ کہ تمہارے آقا کے کچھ قیمتی کپڑے ہیں؟

تو اس نے کہا کہ کچھ نہیں صرف ان کے پاس ایک کپڑے کا تھان ہے۔ تو معظم نے پھر اس سے سوال کیا کہ وہ اس تھان کو کہاں رکھتا ہے؟

نوکر نے جواب دیا کہ وہ سوتے وقت اس کو سرہانے رکھ لیا کرتا ہے یا کبھی اپنی بغل میں رکھتا ہے۔ ان ساری باتوں سے خواجہ معظم کے شبہ کو یقین کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس نے ہمایوں سے اجازت لے کر جب کہ دوسرے دن خواجہ غازی ہمایوں کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر سے اس کپڑے کے تھان کو اچانک کھینچ لیا۔ جس میں سے ایک لعل ٹپک پڑا۔

اس واقعہ کی پوری تفصیل۔ گلبدن بیگم کی شیریں ترین زبان میں سنئے کہ وہ کس طرح لکھتی ہے۔

"در آں اثنا روشن کوکہ با وجود وفاداری و معاملات سابقہ در آں بیکسی و بے سر و پا خاطرہ۔ بیوفائی کرد کہ چند پارہ لعل قیمتی کہ در طومار ہائے جیبِ پادشاہ می بود کہ حضرت خود با حمیدہ بانو بیگم می دانستند و تا آلت را بر آں اطلاع نبود۔ اگر بادشاہ بجائے تشریف می بردند۔ آں طومار را بہ حمیدہ بانو بیگم می سپردند۔ روزے بیگم بہ سر شستن رفتند۔ آں طومار را در بقچہ پاک پیچیدہ بر بالائے پلنگ بادشاہی نہادند۔ روشن کوکہ فرصت را غنیمت دانستہ پنج لعل را دزدیدہ و بہ خواجہ غازی یکجہت شدہ و بہ خواجہ غازی سپردہ و بہ مرور ایام می خواستند صرف نمایند۔"

حمیدہ بانو بیگم کہ سر خود را شستہ آمدند۔ حضرت پادشاہ آں طومار را بہ بیگم دادند۔ بیگم از ہوائے دست فی الحال دریافتند کہ آں طومار سبک ظاہر می شود بیگم بہ پادشاہ می گفتند حضرت فرمودند ایں چہ معنی دارد۔ غیر ما و شما تا لتے اطلاع نہ دارد۔ چہ شدہ باشد۔ و کہ گرفتہ باشد۔ حیران شدند۔ بیگم برادر خود خواجہ معظم را گفتند کہ ہیچو امرے واقع شدہ۔ اگر دریں طور وقت برادری را بجا آرید۔ و تفحص ایں بہ یک روشے کہ شور نہ شود بکنید گویا مرا از خجالت می برآرید۔ و الا تا زندہ ام۔ از روئے پادشاہ خجل خواہم بود۔

خواجہ معظم گفت یک چیزے بہ خاطر من مے رسد کہ با وجود تقرب حضرت پادشاہ قوت آں نیست کہ تا توئے لاغر دو بلا گھوڑا) توانم خرید بہ خلاف خواجہ غازی و روشن کوکہ۔ کہ ہر کدام ایں ہا۔ برائے خود ہا اسپاں یوپاق خریدہ اند و ہنوز زر اسپاں را نہ دادہ اند۔ ایں خرید ایں ہا۔ بے یک امیدواری نیست بیگم گفتند۔ اے برادر وقت برادری است۔ البتہ تفحص ایں معاملہ باید کرد۔ خواجہ معظم گفت۔ ماہ چچم، شما بہ کسے نہ گوئید۔ انشاء اللہ تعالیٰ امید دارم کہ حق بہ حق دار برسد۔ از آں جا برآمدہ بہ خانہ ہموں سوداگراں پرسیدہ کہ ایں اسپاں را بہ چند فروختید؟

در بہائے اسپاں بشمار زر گے وعدہ کردہ اند و ادائے ایں زرہا را بہ ایں روش خاطرنشان کردہ اند۔ سوداگراں گفتند۔ کہ بما ایں ہر دو شخص وعدہ بیل ہا کردہ اند و اسپاں بردہ اند۔ خواجہ معظم از آں جا پیش نوکر خواجہ غازی آمد و گفت کہ "بقچہ سر دیا و زری دیری" یعنی قیمتی کپڑوں کی گٹھڑی) خواجہ غازی در کجا می شد؟ و در چہ جائے" می دارد بگم دیو کر؟ خواجہ غازی جواب داد کہ خواجہ ما" بقچہ زری دیری۔ دارد۔ یک طاقے دارد کہ وقت خواب گاہے زیر سر خود و گاہے در بغل خود نگاہ می دارد۔ خواجہ معظم فہمیدہ و در دل جزم و یقین کرد کہ آں لعل ہا در پیش خواجہ غازی ہست و در ہماں طاقے نگاہ داشتہ است۔ پیش حضرت آمد و عرض کرد کہ من نشاں لعل ہا را در طاقہ خواجہ غازی یافتہ ام۔ بہ یک روشے می خواہم از و

رُبایم۔ اگرچہ خواجہ غازی پیش حضرت آمدہ از من استغاثہ کند۔ حضرت بہ من چیزے نہ گویند۔ حضرت شنیدہ تبسم فرمودند۔ خواجہ معظم ازاں بار۔ بہ خواجہ غازی ہزل و طائبہ و مذاق می کرد۔ خواجہ غازی آمدہ بعرض حضرت بادشاہ رسانید کہ من مرد غریب درسم و رسمے دارم۔ و در ولایت بیگانہ خواجہ معظم خورد سال ایں چہ معنی دارد کہ بہ من ہزل و مطائبہ و مذاق بہ کند و بہ من اہانت رساند حضرت پادشاہ فرمودند بائے نہ دارو۔ خورد سال است بارے بہ خاطرش رسیدہ باشد۔ و از دلگیری ہا بے ادبی کردہ باشد۔ شما چیزے بہ خاطر نہ رسانید کہ او خورد سال ست"۔

"روز دیگر خواجہ غازی آمدہ در دیوان خانہ نشستہ بود کہ خواجہ معظم غافل ساختہ ویک بار۔ طاقیے را از سرش رُبود۔ و لعل بے بدل از طاقیے برآوردہ۔ پیش حضرتِ بادشاہ و حمیدہ بانو بیگم آوردہ نہاد۔ حضرت تبسم کردند و حمیدہ بانو بیگم خوش حال شدند و بہ خواجہ معظم شاباش و رحمت ہا گفتند۔ خواجہ غازی و روشن کوکہ از افعال ہائے خود شرمسار شدہ ہر دو پیش شاہ (مراد شاہِ خراسان) رفتہ و سخنانِ مخفی بہ عرض رسانیدند تا حدے چیزے ہا گفتند کہ خاطرِ شاہ (خراسان) مکدر شد۔ حضرت پادشاہ (ہمایوں) معلوم کردند کہ اخلاص و اعتقادِ شاہ بہ دستورِ سابق نیست۔ فی الحال از لعل و جواہر ہر چہ داشتند۔ بہ شاہ فرستادند۔ شاہ بادشاہ گفت کہ گناہِ خواجہ غازی و روشن کوکہ است کہ ما را از شما بیگانہ کردہ بودند۔ و الّا شما را بیگانہ نمی دانستم۔ باز ہر دو پادشاہ یک دل شدند و بایک دیگر خاطر راصاف کردند و آں ہر دو حرام خور مردود ہر بادشاہ شدند۔ و آں ہر دو را پادشاہ بہ شاہ سپردند۔ آں لعل لعل ہا را بہ ہر نوعے وقتے کہ دانست و توانست گرفت و آں ہا را فرمود کہ در قید نگاہ دارند . . . . . (چوں) حضرت بادشاہ متوجہ قندہار شدند . . . . . در آں وقت گناہِ آں ہر دو بے وفا را۔ از شاہ طلبیدہ و بخشیدہ ہمراہ گرفتہ متوجہ قندھار شدند"۔

سیاحت نامۂ ٹیورنیز کے مترجم نے صفحہ ۱۴۹ کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ یہ ہیرا ہمایوں نے قیام ایران کے زمانہ میں شاہ طہماسپ صفوی کی نذر کر دیا۔ پھر اس کو شاہِ طہماسپ نے احمد نگر کے والی برہان نظام شاہ کو اُس کے شیعہ ہو جانے کی خبر سُن کر تحفتہً بھیجا تھا۔ لیکن اب جب کہ دنیا کو ہمایوں نامہ کا علم ہو گیا۔ اور آپ کے سامنے جب وہ بیان آگیا تو خود مترجم صاحب کا یہ بیان غلط معلوم ہوگا۔ بہرحال اس کے بعد اس ہیرے کے متعلق پھر کوئی تفصیل معلومات نہیں ملتیں۔ ورق گردانی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ ہیرا ۱۶۵۶ء یا ۱۶۵۷ء میں میر جملہ نے اس کو غیر تراشیدہ حالت میں شاہ جہان کی نذر کیا تھا جس نے دکن کی سلطنتِ قطب شاہیہ سے لڑ کر۔ شاہ جہان کی ملازمت اختیار کی تھی اور وہ جب تک دکن میں رہا۔ دلی جانے سے قبل دکن میں ہیروں کے معاملات کیا کرتا تھا۔ "کوہ نور" وغیرہ کی کانوں میں اُس نے تلاش جاری کرا رکھی تھی۔ ڈاکٹر برنیر بھی۔ جو شاہ جہان اور اورنگ زیب کے عہد کا سیاح ہے۔ اس ہیرے کو "عدیم النظر" کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس کی نسبت لکھتا ہے کہ میر جملہ نے شاہ جہاں کی بارگاہ میں پیش کیا تھا۔ اور اُسی وقت گول کنڈہ پر فوج کشی کی رائے بھی دی تھی[1]

اس کوہ نور کے دکن آنے کے صحیح اسباب نہ معلوم ہو سکے۔ اور نہ یہ معلوم ہو سکا۔ کہ یہ میر جملہ کے ہاتھ کس طرح لگا۔ اور اس کا نذر کردہ ہیرا درحقیقت کوہ نور ہی ہے؟ یہ امر بہت زیادہ قابلِ تحقیق ہے۔

۱۶۵۶ء میں خود ٹیورنیز نے اس ہیرے کو اورنگ زیب کے جواہر خانہ میں دیکھا ہے۔ جب خود اُس نے اس کے وزن کی تحقیق کی تو ۳۱۹ ½ رتی نکلا۔ اس کی مقدار کے کم ہو جانے کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ جہان کے زمانہ میں اس کو وینس کے ایک باشندے "ہارٹنشیو بارگیو۔ (HARTENSIS BORGIS)" نے انتہائی بے دردی کے ساتھ اس قدر گھس کر اس کا وزن کم کر دیا۔ تو بادشاہ نے اجرت کی بجائے اس سے دس ہزار روپیہ بطور جرمانہ وصول کئے[2]

یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ جہان جب تک قلعہ آگرہ میں مقید رہا[3]

---

[1] سیاحت نامہ ٹیورنیز صفحہ ۱۴۲ [2] سیاحت نامہ ٹیورنیز صفحہ ۱۵۷ [3] [illegible] حسن حیدر آباد صفحہ ۱۴۲ بابتہ نومبر ۱۸۹۱ء

خاص خاص جواہر بھی اس نے اپنے ساتھ چھپا رکھے تھے۔ جب اس کا انتقال ہوا۔ اور اورنگ زیب آگرہ پہنچا۔ تو جہاں آرا بیگم نے تمام شاہی جواہرات اس کے نذر کئے۔ اس میں کوہ نور بھی شامل تھا۔ عالمگیر کے انتقال کے بعد ۱۷۳۹ء تک یہ مغلیہ خاندان میں برابر چلا آیا۔ اب اس کے بعد سے اس ہیرے کی تفصیلی تاریخ اور قریباً سب صحیح صحیح حالات ملتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جب نادر شاہ نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ساری دولت و جواہر لوٹ لئے۔ تو اس کو اولاً اس میں کوہ نور دستیاب نہ ہوا۔ اس لئے کہ یہ ہیرا جواہر خانہ کی بجائے ہر وقت محمد شاہ کے ساتھ اُس کے صافہ میں چھپا رہتا تھا۔ اور اس بات کا علم حرم سرا کی ایک لونڈی کے علاوہ اور کسی کو نہ تھا۔ اس نے بدقسمتی سے یہ راز نادر شاہ پر ظاہر کردیا۔ اس وقت قتل و غارت گری اور لوٹ کے بعد نادر محمد شاہ سے دوستی کا عہد و پیماں کر چکا تھا۔ جب یہ خبر سُنی تو بہت بے چین ہوا کہ اب تو جبراً لینے کا کوئی موقع نہیں رہا۔ بالآخر اس نے ایک تدبیر نکالی اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہنگامہ کے کچھ دنوں بعد بظاہر عوام کے لئے یہ اعلان کیا کہ وہ ایک جشن منعقد کرکے محمد شاہ کو خاندانی تخت شاہی پر متمکن کرنا چاہتا ہے۔ مقررہ دن یہ جلسہ منایا گیا۔ اور محمد شاہ خود اس جشن کے اصلی مقصد سے آخر وقت تک لاعلم رہا۔ نادر نے اس کو تختِ شاہی پر بٹھانے کے بعد ایک عجیب و غریب چال چلی۔ جس کا کہ محمد شاہ کو ساں و گمان نہ ہوسکتا تھا یعنی اس نے تخت نشینی کے لوازم کی تکمیل کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت محبت و دوستی کا بے پایاں تقاضا ہے کہ آپ میں اور ہم میں رابطہ مودت و اتحاد کو مؤکد بنانے کے لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے صافے بدل کر۔ اس رشتہ خلوص کو مضبوط سے مضبوط تر کرلیں۔ اس سے مجھے بڑی مسرت ہوگی چنانچہ اس نے اپنا صافہ اتار کر محمد شاہ کے سر پر رکھا اور اُس کا خود پہن لیا۔ محمد شاہ اچانک اس حرکت سے سکتہ میں آگیا۔ اور یہ ظاہر بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس کے اُس صافہ میں ایک ہیرا پوشیدہ ہے اور نہ اس سے ہیرا کو واپس مانگنے کی ضرورت تھی اور نہ جرات۔ اس نے اپنی مشرقی وضع داری سے اس وقت کام لیا۔ اور نادر کو اس بات کا اندازہ نہ ہونے دیا کہ اس کی کوئی چیز جاتی رہی ہے۔ اور اس سے وہ متاثر ہے کہتے ہیں کہ وضع داری اور استغنا پر نادر کو شک ہوگیا کہ شاید اُسے دھوکا دیا گیا ہے۔ اس لئے فوراً دربار برخواست کرنے کا حکم دیا اور انتہائی بے چینی کا عالم میں گھر آکر محمد شاہ کی پگڑی کھولی جس میں سے یہ جوہر ٹپک پڑا۔ اس کی آب و تاب گرتے ہوئے نادر کی نظروں کو اتنی خیرہ کر گئی کہ بے ساختہ اس کی زبان سے "اس ہیرے کے لئے لفظ "کوہ نور" نکل پڑا۔ جس کا یہی نام قرار پایا۔ اور آج تک بھی اسی نام سے مشہور و معروف ہے۔

حیدرآباد کی ایک مشہور تاریخ رشید الدین خانی ہے۔ جو ۱۸۴۲ء میں تالیف ہوئی۔ اس کے مؤلف نے صفحہ ۲۶ پر لکھا ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک یہ جوہر منحوس ہے انہوں نے اس کا نام "کھسر جھوٹر" بھی مشہور کر دیا ہے[1]

نادر نے کتنے جواہر ہندوستان سے حاصل کئے۔ اس کی کوئی تفصیل واقعات اور فہرست جس میں اُن کے اوزان وغیرہ درج ہوں۔ دیکھنے میں نہیں آئی نادر کے اس ہیرے کے متعلق ایک انگریز "مسٹر فاربس" کا بیان ہے کہ "ایک ایرانی امیر جس کے پاس (۱۱۷) قیراط کا ہیرا تھا۔ اور جو سمندر میں بعد کو کھو گیا تھا ۱۷۸۱ء میں کھمبات میں مجھ سے یہ بیان کیا تھا کہ اصفہان کے شاہی خزانے میں دو ہیرے ہیں۔ ایک کوہ طور (یا کوہ نور) جس کا وزن (۲۶۴) قیراط اور قیمت (۵) لاکھ پونڈ ہے۔ اور دوسرا "دریائے نور" جو چوڑا ہے۔ ان دونوں کی قیمت سات آٹھ لاکھ پونڈ ہے۔ انہیں نادر شاہ ہندوستان سے ۱۷۳۹ء میں لے گیا تھا[2]

۱۷۴۷ء میں بہ مقام قلات نادر شاہ قتل ہوگیا۔ تو اُس وقت سارے جواہر اس کے قبضہ میں تھے اس کے بعد اس کے پوتے یا بیٹے شاہ رُخ کو ملے جس میں کوہ نور بھی شامل تھا۔ کہتے ہیں کہ خصوصیت سے اس ہیرے کی

---

[1] آصفہ جواہر صفحہ ۱۸۱

[2] سیاحت نامہ ٹیورنر صفحہ ۱۴۶

وجہ سے اس پر مصائب کا آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ یہاں تک کہ (اندھا ہو گیا) اور آخر پر اُسے "مشہد مقدس" میں حاکم ضلع بن کر زندگی گذارنی پڑی۔ آغا محمد میر عالم خاں کو اس کے پاس کے ان جواہر کی شہرت ملی۔ تو وہ رات دن ان کے حاصل کرنے کی فکر میں رہا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک ترکیب یہ کی کہ ایک بڑی فوج اپنے ساتھ لے کر اس ارادہ سے نکلا کہ وہ مشہد مقدس۔ حضرت امام رضا (رضی اللہ عنہ) کے روضۂ مبارک کی زیارت کے لئے جا رہا ہے۔ یہاں پہنچکر فوراً شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اور بھیس بدل کر نابینا شہزادہ کے پاس پہنچا۔ اور اُسے اپنے سارے جواہر سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا۔ اور اتنی تکالیف پہنچائیں کہ بے چارے کو آخر بہت سے ہیرے دینے پڑے۔ لیکن کسی ترکیب سے "کوہ نور" کو بچائے رکھا۔ آغا محمد کو جب یہ ہیرا نہ ملا۔ اور انتہائی اذیتیں پہنچانے اور طلب کرنے کے بعد بھی ناکامی ہوئی تو اس نے اپنی کمینگی سے نہایت چھچھوری حرکت کی اور حکم دیا کہ شاہ رخ کا سر منڈا کر اس کے سر پر خمیر اور نشاستہ کا تاج بنا کر پہنایا جائے۔ اور اُس کے حلق میں اُبلتا ہوا تیل ڈالا جائے۔ اس ہمت کے پورے نے اس ناقابل برداشت اور دردناک تکلیف پر بھی سوائے ایک بڑے یاقوت کے جس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ اورنگ زیب کے تاج میں مزین تھا۔ اور نادر شاہ کو لوٹ میں ملا تھا۔ کوہ نور ہرگز نہ دیا۔ ان شدائد سے وہ جان بر نہ ہو سکا۔ مرنے سے قبل جب ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ درانی اس کی مدد کو آیا۔ تو اُس نے اس امداد کے صلہ میں اس کو "کوہ نور" ہیرا پیش کیا جس کی وجہ سے وہ آلام و مصائب کا شکار ہو رہا تھا۔ اس ہیرے کی بدولت خاندان درانی بھی آفتوں سے نہ بچ سکا۔

احمد شاہ کے انتقال کے بعد یہ الماس اس کے بیٹے تیمور کے قبضے میں آیا۔ یہ کابل میں رہا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کے بڑے بیٹے شاہ زماں کو ۱۷۹۳ء میں ملا۔ اس کے بھائی محمدؐ نے اس کو تخت سے اُتار اندھا کر کے مقید کر دیا۔ تو یہ ہیرا بھی قید خانہ میں اس کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اس نے احتیاطاً اس کو ایک دیوار میں چھپا رکھا تھا۔ اتفاقاً دیوار کے اس حصہ سے جس میں یہ الماس پوشیدہ تھا کچھ مٹی گر گئی تھی جس سے ہیرے کا ایک گوشہ نظر آنے لگا۔ اور ایک عہدہ دار نے اس کو دیکھ پایا۔ تو یہ راز ظاہر ہو گیا۔ غالباً اس وقت محمدؐ کو تخت سے اُتار کر شاہ شجاع کو کابل کا حاکم بنایا گیا تھا۔ اور محمدؐ مقید تھا۔ اس طرح یہ ہیرا شاہ شجاع کو ملا۔

۱۸۰۹ء میں الفنسٹن صاحب۔ گورنمنٹ ہند کی جانب سے سفیر بن کر شاہ شجاع کے دربار میں پشاور پہنچے تو انہوں نے اس ہیرے کو بادشاہ کے ایک کنگن میں جس کو کہ وہ پہنے ہوئے تھا دیکھا۔ شاہ شجاع کے بڑے بھائی شاہ محمد نے جو تیمور شاہ کا تیسرا بیٹا تھا۔ اس کو تخت سے اُتار کر جلاوطن کر دیا۔ اس موقع پر کوہ نور اسی کے پاس رہ گیا۔ ۱۸۱۲ء کو اس عالم میں وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اپنے بھائی شاہ زماں کو لئے ہوئے نکل پڑا۔ اور لاہور آیا تو یہاں رنجیت سنگھ نے اسے روک لیا۔ اس اثناء میں عطا محمدؐ خاں حاکم کشمیر نے شجاع الملک کو کشمیر کی فرماں روائی کا لالچ دے کر اپنے پاس طلب کیا۔ جب وہ لاہور سے یہاں پہنچ گیا۔ تو اس نے دھوکہ سے اس کو گرفتار کر لیا۔ اور یہ ہیرا جس وقت وہ کشمیر جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ہی کے پاس تھا۔

کہتے ہیں۔ کہ جب تک شجاع لاہور میں رہا۔ رنجیت سنگھ نے اس بات کی کوشش کی کہ یہ الماس کسی طرح شجاع پر قبضہ کر کے حاصل کرے۔ بالآخر عطا محمدؐ سے غالباً ساز باز کر کے اس کو کشمیر میں قید کرا دیا۔ کشمیر میں قید ہونے سے قبل۔ شجاع کئی دن تک دانائی اور لطائف الحیل سے کوہ نور کے مطالبہ کو ٹالتا رہا۔ رنجیت سنگھ نے قیمت بھی دینی چاہی جو نہایت قلیل تھی۔ اس لئے وہ راضی نہ ہوا۔ اس ہیرے کی شہرت وہ کئی دن سے سنتا چلا آتا تھا۔ اس لئے بڑی بڑی تدبیریں کیں۔ چوں کہ یہ سب آفت زدہ جلاوطن ہو کر آئے تھے۔ اور پریشان تھے رنجیت سنگھ نے پہلے خاطر مدارا کا طریقہ اختیار کیا کہ یہ لوگ خود پریشان ہیں۔ اور میرے اس انعام و اکرام سے خوش ہو کر ضرور ہیرا دیں دیں گے اس لئے بڑی خاطر تواضع شروع کی۔ اور خود شاہ شجاع کی قیام گاہ پر پہنچ کر حال

؎ تاریخ خورشید جاہی صفحہ ۲۲۲

گی۔ اس طرح دونوں میں بڑی دوستی ہوگئی۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ ان لوگوں نے آپس میں اپنی پگڑی بدلی۔

اور اس کی خاطر شاہ محمود[1] سے لڑکر کشمیر چھین[2] لیا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ علاقہ پنجاب سے جاگیر بھی مرحمت کی۔ اور لڑکر کابل دلانے کا وعدہ کیا۔ ان عنایت کے بعد مطالبات کی شدت شروع ہوئی۔

شاہ شجاع کی بیوی وفادار بیگم نے وفادار خاں وزیر سے رنجیت سنگھ نے کوہ نور کا تقاضا شروع کیا۔ جو "شاہدرہ" میں قیام پذیر تھی۔ اُس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میرے پاس کوئی الماس نہیں ہے۔ اس قسم کا جواب سن کر رنجیت سنگھ بہت جھنجھلا اُٹھا۔ اور حکم دیا کہ بیگم کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کر کے لاہور لایا جائے۔ چنانچہ جب یہ اسباب پہنچا تو اس کو اس میں سے بڑے بڑے قیمتی جواہر ملے۔ لیکن کوہ نور ہی دستیاب نہ ہوا۔ اس لئے رنجیت سنگھ نے دوبارہ حکم دیا۔ کہ بیگم کی تلاشی لی جائے۔ اور اس کی معتبر خادمات کو گرفتار کر کے ان سب کے لئے کھانا پانی بند کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کی دو معتبر علیہ خادمہ گرفتار کر لی گئیں اور کسی کو تلاشی دیئے بغیر بیگم کے پاس آنے جانے کا حکم نہ تھا جب یہ نوبت آپہنچی۔ تو اس نے مجبور ہو کر چند اور قیمتی جواہر روانہ کئے۔ جن میں ایک بڑا بیش قیمت یاقوت بھی تھا۔ رنجیت سنگھ کو چونکہ جواہر کی شناخت کا ملکہ نہ تھا۔ اور اس کو اس کی تمیز نہ تھی۔ اس لئے اولاً اس نے اس یاقوت کو ہی "کوہ نور" تصور کیا۔ اور تصدیق کے لئے ایک شخص کو بلایا۔ جو کوہ نور کو دیکھ چکا تھا۔ سب جواہر رکھ کر اُس سے یہ سوال کیا کہ "ان میں کوہ نور کونسا ہے"؟

اس شخص نے جواب دیا کہ ان میں سے کوئی جواہر بھی کوہ نور نہیں یہ سب اُس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ اس سے مہاراجہ کے سمند شوق پر ایک اور تازیانہ ہوا۔ پھر شاہ شجاع کی بیگم کو اذیتیں پہنچانی شروع کیں۔ اس وقت تک کشمیر ہی میں شاہ شجاع مقید پڑا تھا۔ دو دن تک بھوکا رکھنے سے بھی جب یہ الماس نہ مل سکا تو قریباً رنجیت سنگھ ناامید ہوچکا تھا لیکن مصائب کی شدت برداشت کرکے بیگم نے اس کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر شاہ شجاع کو کشمیر سے رہا کرا کے عمر بھر کے واسطے جاگیر دی جائے۔ تو اس وقت میں کوہ نور تمہیں دے دوں گی۔ اس نے یہ سن کر شاہ شجاع کو فوراً رہا کر دینے کا حکم دیا۔ کہتے ہیں کہ دوسری شرط کی تکمیل نہ کی۔ اس لئے بیگم نے کہا کہ وہ الماس میرے پاس نہیں ہے بلکہ قندھار میں ایک سوداگر کے پاس ہے۔ ان انکاری جوابوں سے اس پر مصائب کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ مجبور ہو کر خود شجاع نے جو کشمیر سے رہا ہو کر آچکا تھا کوہ نور دینے کا وعدہ کر لیا۔

اوّل یکم جون ۱۸۱۳ء کو رنجیت سنگھ الماس لینے کے لئے شاہ شجاع کے پاس "شاہدرہ" پہنچا۔ ملاقات کے بعد دونوں آمنے سامنے مسند پر بیٹھے رہے۔ شجاع رنج و غم کے عالم میں مبہوت بنا بیٹھا تھا۔ اور اس کے پیش نظر وہ سارے مصائب تھے جو اُس نے اس ہیرے کی خاطر برداشت کئے تھے یہانتک کہ اپنی زندگی تباہ کرلی تھی چہرہ پر ایک رنگ آتا اور جاتا تھا۔ سوچتا تھا کہ آخر ایسی عزیز از جان چیز آج جدا کرنی پڑ رہی ہے۔ ادھر رنجیت سنگھ "کوہ نور" کے تصور اور اُس کے ہاتھ آنے پر اپنی قسمت پر ناز کر رہا تھا۔ اور

---

[1] سیاحت نامہ مورکرافٹ ضمیمہ افغانی مترجم۔
[2] اس سے پہلے ہوئے اس کا نام عطا محمد لکھا ہے اور آئینہ جواہر میں شاہ محمود ہے۔
[3] آئینہ جواہر صفحہ ۱۵۲

سحر لمحہ

IKHRAJI

KAILA
دوائی کیلا

JOSH

زور
Sure Cure

بے چینی کے ساتھ کہ اب ملے۔ اور عیب ملے۔ حرص و طمع اُسے مضطرب کئے دے رہی تھی۔ کچھ دیر تک ان دونوں کے حواس ظاہری و باطنی پر یہ آثار، انتہائی سکوت کے اثر انداز ہو رہے تھے اُس وقت دونوں کی صورتیں اور یہ منظر کچھ عجب تھا۔ شاہ شجاع جو اس وقت بالکل کھویا ہوا تھا۔ اور رنجیت سنگھ ہیرے کو حاصل کرنے کے لئے مضطرب تھا۔ اُس کے لئے ایک ایک لحظہ پہاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے اُسی نے خود بے تاب ہو کر اپنے ایک خاص ملازم سے کان میں کہا کہ وہ شہزادے کو یہاں آنے کا مطلب و مدعا یاد دلائے اور کوہ نور کا مطالبہ کرے۔ شجاع نے ایک سرد آہ کھینچی اور آنسو بھری آنکھوں سے اپنے خواجہ سرا کو سر سے اشارہ کیا۔ وہ اندر گیا۔ اور کچھ دیر بعد کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک چیز لایا۔ اور ان دونوں کے درمیان اِس کو مسند پر رکھ دیا۔ رنجیت سنگھ نے اشارہ کیا۔ تو اس کو کھولا گیا۔ ایک ڈبیہ نکلی جس میں سے یہ آفت رماں ہیرا نکلا۔ رنجیت سنگھ نے جوہریوں سے اس کی شناخت و تصدیق کرائی۔ شجاع کی شجاعت اِس وقت جواب دے چکی تھی۔ پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ صبر کے سوائے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس کی زبانِ حال رَہ رَہ کر اس کی افسردہ دلی پر یہ شعر سنا رہی تھی ؎

دل کہ افسردہ شد از سینہ بدر باید کرد
مردہ ہر چند عزیز ست نگہ نتواں داشت

کہتے ہیں کہ رنجیت سنگھ کو۔ کوہ نور ملنے سے قبل۔ اس کا وزن۔ (۳۹) قیراط کم ہو گیا تھا۔ اس لئے محققین گمان کرتے ہیں۔ کہ شاید۔ شاہ رُخ۔ شاہ زماں اور شاہ شجاع کے ہنگاموں میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہو۔ یا ان میں سے کسی نے ضرورت کی وجہ سے اس کو کچھ توڑ کر پیسے حاصل کئے ہوں۔ خورشید جاہی کے مؤلف نے رنجیت سنگھ کو جس وقت یہ ہیرا ملا ہے۔ اس کا وزن (۴۲) ماشہ تھا۔

کوہ نور کو دیکھ کر رنجیت سنگھ نے شجاع سے پوچھا کہ آپ اس کی قیمت کا کیا اندازہ لگاتے ہیں۔ تو اس نے جواب میں کہا کہ صرف۔ " اقبال" کیونکہ یہ ہمیشہ ایسے شخص کے ہاتھ آیا ہے جنے اپنے اقبال کے زور پر اس کے مالکوں پر فتح پائی۔

کہتے ہیں۔ کہ اس کی بیوی نے رنجیت سنگھ کو اس ہیرے کی قیمت کا اندازہ اس طرح کرایا کہ اگر کوئی شخص پانچ پتھرے کر چاروں سمت اپنی طاقت و قوت کے موافق پھینکے اور ایک آسمان کی طرف اور ان پتھروں کی درمیانی جگہ (خلا) کو سونے اور جواہر سے بھر دے۔ تو اس وقت بھی یہ قیمت اس ہیرے کے لئے بہت کم ہو گی۔[1]

مؤلف آئینہ جواہر نے صـ۱۹۳ پر ایک شخص کا نام وغیرہ بتلائے بغیر اُس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ شخص اِس ماجرے کو بچشم خود دیکھ رہا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ شاہ شجاع نے اس موقع پر ایسی فراخ حوصلگی سے کام لیا کہ سب حاضرین دنگ رہ گئے۔ اور مہاراجہ نے اسے سوا لاکھ روپے دیئے۔

. . . .

مترجم سیاحت نامہ موسیو ٹیو ریز صـ۱۵۸ پر جنرل السلیمان سے اور جنرل السلیمان۔ اسمتھ کے حوالہ سے بیان کرتا ہے۔ جو ان دنوں لدھیانہ میں فوج کا کمانڈر تھا۔ اور اُس نے اِس ہیرے کے متعلق خود شاہ زماں سے یہ سُنا کہ :۔

" جب شاہ شجاع لاہور آیا تو رنجیت سنگھ نے اُسے روک لیا۔ اور چاہا کہ مع ہیرے کے اپنے قبضہ میں کرلے۔ مگر شاہ شجاع نے اِسے ایک عرصہ تک لیت و لعل میں رکھا۔ اور رنجیت سنگھ کی قلیل قیمت لینے پر راضی نہ ہوا۔ آخر مہاراجہ نے خود شجاع سے ملاقات کی۔ اور ان دنوں میں بڑی دوستی ہو گئی اور پگڑی بدلی گئی۔ ہیرا رنجیت سنگھ کو مل گیا۔ جس نے شاہ شجاع کی بسر اوقات کے لیے پنجاب میں اُسے جاگیر دے دی۔ اور وعدہ کیا کہ کابل دلا دوں گا۔ یہ واقعہ [illegible] پھر شاہ شجاع لاہور سے " راجا دری " کو کوہستان میں بھاگ گیا اور بہت تکلیفیں جھیلتا اور مصیبتیں اٹھاتا ہوا لدھیانہ پہنچا۔ یہاں آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی اور اُس کے بھائی زماں کی

---

[1] آئینہ جواہر صـ۱۹۳ سے کسی وجہ سے شاہ شجاع پھر بھاگ گیا اس کی [illegible]

نہایت تعظیم اور توقیر کی۔ اور ان کی بسر اوقات کے لئے ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔"

۱۸۳۹ء میں جب لارڈ آکلینڈ یہاں حکمران تھا شاہ شجاع کو انگریزی فوج نے کابل کے تخت پر بٹھایا۔ جو دو سال بعد اپنی واپسی کے وقت غارت ہو گئی [1]

بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ شاہ شجاع کی مدد کے لئے جب انگریزی سفارت بھیجی گئی تھی اس وقت لارڈ منٹو کی ہمراہی میں مسٹر الفنسٹن سفیر بن کر پشاور میں اس کے دربار میں پہنچا۔ اور اس نے شجاع کو جس لباس میں دیکھا ہے۔ اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"شاہ شجاع جو بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا تابع فرمان اور اس کا وظیفہ خوار ہو گیا تھا اس موقع پر اعلیٰ قسم کی۔ مخمل کی ایک قبا پہنے ہوئے تھا کہ جس میں جا بجا قیمتی ہیرے اور موتی ٹنکے ہوئے تھے۔ اور سینہ پر جواہر کی بکثرت تھی ہوئی تھی۔ دائیں بازو کے بازو بند میں کوہ نور گول کندہ کا بیش بہا الماس کی طرح جگمگا رہا تھا [2]"

۱۸۳۹ء میں جب رنجیت سنگھ کی زندگی سے لوگ مایوس ہو گئے۔ تو اس وقت لوگوں نے اس سے کہا کہ اگر یہ ہیرا جگناتھ جی کے مندر اڑیسہ میں بھیج دیا جائے۔ تو بہت بڑا ثواب ہوگا چنانچہ اس نے سر کے اشارہ سے اجازت دیدی لیکن جب اس کے انتقال کے بعد لوگوں نے خزانچی سے مانگا تو اس نے دینے سے انکار کیا اور کہا کہ مجھے کوئی حاکم ہوتا تو دیتا۔ اس طرح یہ ہیرا مندر جانے کی عوض اس کے بیٹے دلیپ سنگھ کے تخت نشین ہونے کے بعد۔ اس کے ورثہ میں آیا اس وقت اس کی قیمت کا اندازہ دس لاکھ پونڈ تھا۔

۱۸۴۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس قرضہ کی بابت جو ریاست پنجاب پر عاید تھا۔ اس کی ادائیگی میں صوبہ پنجاب کو اپنے اقتدار میں لے کر برٹش علاقہ میں شامل کر لیا۔ اور ساری جائداد ملک واملاک ضبط ہو گئی جس میں یہ ہیرا بھی شامل تھا۔ گورنمنٹ بورڈ پنجاب نے جو اس صوبہ کے انتظامات کے لئے مقرر ہوا تھا۔ کوہ نور کو "سر جان لارنس" کے حوالہ کیا کہ وہ ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریہ کے حضور میں اس کو بھیجدیں۔ یہ مشہور ہے کہ ایک چھوٹے سے ٹین کے ڈبہ میں جس میں کہ یہ ہیرا رکھا جاتا تھا جب لارنس صاحب کے سپرد کیا گیا۔ تو انہوں نے اس کو اپنے واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اور کام کی کثرت کی وجہ سے یہ بکس ان کو یاد نہ رہا جب دو ہفتے گزرنے کے بعد ان سے اس کا مطالبہ ہوا تو اس وقت ان کو یاد آیا وہ گھبرا کر اپنے مکان کو دوڑے آئے اور خادم سے دریافت کیا۔ تو اتفاق کی بات ہے کہ اس نے ان کی جیب سے اس ہیرے کو نکال کر حفاظت سے اپنے پاس رکھا تھا اور اس کو شیشہ کا ایک ٹکڑا سمجھتا تھا۔ جب لارنس صاحب نے کوہ نور واپس کر دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۶۔ اپریل ۱۸۵۰ء مطابق ۱۲۶۶ھ کو لارڈ ڈلہوزی کے زیر اہتمام۔ کوہ نور کو انگلستان بھیجا۔ اس کے متعلق لارڈ موصوف کا ایک تحریری بیان لکھا ہے کہ وہ اس کی وجہ سے کسقدر مضطرب اور پریشان تھے لکھتے ہیں:۔

"کوہ نور ۶۔ اپریل کو جہاز "میڈیا" کے ذریعہ بمبئی سے انگلستان روانہ کیا گیا۔ اور اس کی روانگی انتہائی راز میں رکھی گئی۔ بڑی پریشانی اور احتیاط کے ساتھ اس کو لاہور سے لایا۔ ایک کپڑے میں سی کر۔ کمر سے باندھے ہوئے تھا اس کپڑے کے ایک سرے کو زنجیر لگائی۔ اور اس زنجیر کو گلے میں ڈالے رکھا۔ رات اور دن اس کو اپنے سے جدا نہ کر سکتا تھا۔ جب میں ڈیرہ غازیخاں گیا۔ تو خزانہ کے ایک صندوق

---

[1] سیاحت نامہ ٹیورنیز کے مترجم کا ضمیمہ صفحہ ۱۵۹ [2] رسالہ حسن حیدرآباد صفحہ ۲۰ جلد چہارم نمبر (۱۱) بابتہ نومبر ۱۸۹۱ء۔ تعجب ہے۔ کہ اس بیان کو کس طرح سچ سمجھا جائے جب کہ وہ کوہ نور کو یکم جون ۱۸۱۳ء کو رنجیت سنگھ کو دے چکا تھا اگر ہمارے سامنے "الفنسٹن" کے اصل الفاظ ہوتے۔ تو تصفیہ کر سکتے اور کسی ایک بیان کی تکذیب کی جا سکتی ۱۲

میں بند کر کے ایک کپتان کو اس صندوق پر۔ اپنے واپس ہونے تک نہایت احتیاط کے ساتھ بیٹھے رہنے کا حکم دیا۔ جب خزانہ بمبئی کے سپرد کیا۔ تو کہیں مجھے آرام ملا۔ اور بڑی نجات پائی۔

بالآخر ۳۔ جون ۱۸۵۰ء کو یہ الماس انگلستان پہنچا اور قیصرہ ہند کی نذر کیا گیا۔

کہتے ہیں کہ ہندوستانی سنگ تراش نے اسے ایسا بھدا کاٹا تھا۔ کہ یہ بلور ہی معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی لوگ اس کی آب و تاب دیکھ کر دنگ ہو گئے۔ ناتراشیدہ حالت میں اس کا وزن (۱۹۳) قیراط تھا۔ ایک ہندو جگاک کے تراشنے کی وجہ سے (۱۸۶ $\frac{1}{16}$) قیراط رہ گیا۔ انگلستان میں جب یہ پہنچا۔ تو یہی وزن نکلا۔ اس کی تراش نادرست ہونے کی وجہ سے شہزادہ البرٹ نے "ڈیوڈ بریوسٹر (DAVID BREVSTER) سے مشورہ کیا۔ اور کہا کہ اسے عمدہ ترشوانا چاہئے۔ تاکہ خوب صورت ہو جائے۔

لکھا ہے کہ اس میں چھوٹے چھوٹے نشیب اور کئی عیب بھی تھے اس لئے انہوں نے مشورہ دیا کہ اس کے دوبارہ کاٹنے میں بہت زیادہ نقصان ہوگا۔ اس کے بعد "ایمسٹرڈم" کے کارخانہ کاسٹر (CASTER) کے کاریگروں سے رائے دی کہ فن دان اور ماہر کی صناعی سے جواہر کے بہت سے عیوب چھپ سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے مختلف "کاٹ" کے نمونے پیش کئے۔ جن میں سے "برلینٹ" وضع کا کاٹ پسند آیا۔ اسلئے کاسٹر کے کارخانہ کے کاریگر۔ ۔ وُرسینگر (VOOR SANGRES)[۱] کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ جو روزانہ بارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد (۳۸) روز میں ختم ہوا۔ اس دفعہ کوہ کو تراشنے کے بعد اس کا وزن (۱۸۶ $\frac{1}{16}$) کی عوض (۱۰۶ $\frac{1}{16}$) قیراط رہ گیا۔ اور (۸) ہزار پونڈ خرچ آیا۔ لکھا ہے۔

کہ اس کے بعد بھی شہزادہ اور دیگر ماہرین نے تشفی ظاہر نہ کی یہ بھی لکھا ہے کہ اگر یہ ایمسٹرڈم بھیج دیا جاتا تو ممکن تھا کہ نتیجہ حسب منشاء نکلتا۔

کوہ نور اب قلعہ ونڈسر (WENDSAR) میں رکھا گیا ہے اور اس کی ایک نقل عوام کے لئے قلعہ لندن کے جواہر خانہ میں رکھی گئی ہے تراشے جانے سے قبل اس کی قیمت (۱۴) لاکھ قرار پائی تھی۔

سلطنت حیدر آباد کے سب سے بڑے امیر کبیر نواب معین الدولہ بہادر (امیر پائیگاہ) کے سب سے بڑے صاحبزادے اور مشہور نوجوان نواب ظہیر الدین خاں بہادر بی اے عثمانیہ۔ جن کی حیدر آباد کی علمی دنیا میں بڑی شہرت ہے۔ انہوں نے حال ہی میں اپنا ایک سیاحت نامہ یورپ و امریکہ شائع فرمایا ہے۔ اس میں موصوف صد ۱۰۹ پر عینی شاہد کی حیثیت سے اس ہیرے کے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہم سیر کرتے ہوئے جواہر خانہ (JEWEL HOUSE) میں داخل ہوئے جس میں انگلستان کے شہنشاہ اور ملکہ کے بیش قیمت جواہر رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے جواہر کے من جملہ ہم نے "ملکہ میری" کے تاج میں لگا ہوا دنیا کا مشہور و معروف کوہ نور ہیرا بھی دیکھا جو ایک مرغی کے انڈے کے برابر ہے۔ ان جواہر کو شیشے اور فولاد کی سیخوں کے ذریعے محفوظ کیا گیا ہے۔ اور ان کے اندر تاروں کے ذریعے ایک نہایت ہی زبردست برقی قوت دوڑائی گئی ہے۔ کہ اگر کوئی بدنیتی سے انہیں ہاتھ لگائے۔ اور لوٹ لینا چاہے۔ تو فوراً اس کا وہیں کام تمام ہو جائے۔"

۱۸۵۱ء میں ہائیڈ پارک کے قصر کرسٹل پیالیس" کی نمائش میں اسے عام طور پر لوگوں کو دکھایا گیا۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں پہلی دفعہ لاکھوں آدمیوں نے جوق در جوق پہنچ کر اس کا معائنہ کیا۔

تاریخ رشید الدین خانی کے مؤلف نے یہ لکھا ہے۔ کہ اس کو معلوم ہوا کہ ملکہ نے حکم دے رکھا ہے کہ اس ہیرے کی نحوست کو دفع کرنے کے لئے ہر سال ایک مناسب رقم خیرات کی جایا کرے۔

اس نحوست کے متعلق موجودہ دور میں یہ بات مشہور ہے۔ کہ یہ ملکہ انگلستان کے تاج میں اسی لئے مزین ہے کہ وہ حالات اور تاریخ کی رو سے بادشاہوں کے منحوس ثابت ہوا ہے۔ اسی لئے

---

[۱] سیاحت نامہ ٹیور نیر صد ۱۹ پر اس کے مترجم نے لکھا ہے۔ کہ ملکہ معظمہ نے اس ہیرے کو تراشنے کے لئے "مسٹر گارار ڈس" کو دیا۔ اور انہوں نے ورسانگر الماس تراش کو مقرر کیا۔

ملکہ وکٹوریہ اور شاہانِ انگلستان نے اپنے وارثوں کو اس کے پہننے سے منع کر دیا ہے۔ اور اسی لئے یہ ملکہ کے تاج کی زینت بنایا جاتا ہے۔

مولانا نیاز فتحپوری نے اپنے رسالہ نگار میں بھی اس پر ایک مضمون لکھا تھا۔ موصوف نے بغیر کسی حوالہ کے یہ عبارت لکھی ہے۔ جسے ہم اپنے مضمون کے آخر پر درج کئے دیتے ہیں۔ ان کے اصل الفاظ ہی پڑھ لیجئے:۔

"افغانی روایت بھی سننے کے قابل ہے۔ اس کی رُو سے جو ثابت ہوتا ہے۔ کہ احمد شاہ ابدالی کو یہ ہیرا نادر شاہ کی بیوی نے اُس کے حُسن خدمات کے صلہ میں دیا تھا۔ اور اُس وقت سے برابر درانیان افغانستان کے پاس رہا۔ یہاں تک کہ جب محمد زئی خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔ تو امین الدولہ۔ شاہ شجاع کے حکم سے جو بعد کو قتل کیا گیا یہ ہیرا لے کر ہندوستان چلا آیا۔ لاہور میں بعض انگریزی تاجروں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے بزبردستی چھین لیا اور لندن بھیج دیا۔ امین الدولہ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ اسے جنون سا ہو گیا اور اس نے ولایت پہنچ کر ملکہ وکٹوریہ سے درخواست کی کہ یہ ہیرا اُسے واپس دے دیا جائے۔ لیکن جب یہ التجا قبول نہ ہوئی تو اس نے کہا کہ ایک نگاہ ہیرے کو دکھا ہی دیا جائے۔ چنانچہ یہ ہیرا اس کو دکھایا گیا۔ تو وہ دیر تک گھورتا رہا۔ اور پھر ہندوستان واپس آ کر چند دن کے بعد مر گیا۔"

افغانستان میں یہ قصہ بہت مشہور رہے۔ اور ہر شخص اپنے اولاد کو وصیت کر جاتا ہے۔ کہ اس ہیرے کو واپس لانے میں اپنی ساری کوشش صرف کر دے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں افغانی وفد ہندوستان سے واپس گیا۔ اور سرحد پر سرداروں نے اس کا استقبال کیا۔ تو ان میں سے ایک نے سلام کرنے سے پہلے ہی یہ پوچھا کہ کوہ نور بھی آ گیا ہے یا نہیں۔[1]

[1] مولانا کے ان پیش کردہ بیانات پر اگلے واقعات اور تاریخی شہادتوں سے آپ خود تطابق کر کے نتیجہ نکال لیجئے؟ ۱۲

ایک پُراسرار افسانہ

منوہر

مشہور افسانہ نگار خاتون مسز عبدالقادر کے قلم سے

(۱)

میں متمول باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ میرے والد احمد آباد کے مشہور تاجر تھے۔ میری نانی اماں اور ماموں جان مجھے بہت چاہتے تھے۔ اِس لئے میری والدہ ہر روز سہ پہر کو مجھے ملازم کے ہمراہ ماموں جان کے گھر بھیج دیا کرتیں۔ میرے ننہال کے محلے میں ایک بوسیدہ مکان تھا جس کی مالکہ ایک ادھیڑ عمر کی زرد رو مگر حسین عورت تھی۔ اِس عورت کو محلے کے چھوٹے بڑے سب بہن رکمنی کہتے تھے۔

یہ عورت بہت غریب اور دھرماتما تھی۔ اُس کے بوسیدہ مکان میں نادار اور اپاہج لوگوں کا ڈیرہ لگا رہتا تھا۔ وہ دن بھر سوت کاتا کرتی اور رات کو جو کچھ اُسے میسر آتا وہ غریب لوگوں کی مدد میں صرف کر دیتی۔ میں نے نانی اماں کی زبانی سُن رکھا تھا۔ کہ بہن رکمنی کا شوہر اپنی شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد کہیں روزگار کی تلاش میں نکل گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ اُنہی دنوں سے بہن رکمنی اپنے خاوند کے گھر بیٹھی زندگی کے دن کاٹ رہی ہے۔

بہن رکمنی نہایت خوش خلق اور ملنسار تھی۔ نانی اماں کے گھر جاتے ہوئے کبھی میرا اُس کا سامنا ہوتا تو وہ نہایت محبت سے میری والدہ وغیرہ کی خیر و عافیت پوچھا کرتی۔ ایک دفعہ گرمیوں کے موسم میں جب میں نانی اماں کے گھر گئی تو اُس کا دروازہ بند تھا۔ اُس کے بعد ہر روز اُس کا دروازہ بند پا کر میں نے نانی اماں سے دریافت کیا تو اُنہوں نے بتایا کہ وہ تیرتھ یاترا کرنے گئی ہے۔

مدت دراز تک اُس کا دروازہ بند رہا۔ اب میں عمر کی سولہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ ایک دن نانی اماں کے گھر گئی تو گلی میں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ آگے بڑھی تو معلوم ہوا کہ بہن رکمنی کا دروازہ کھلا ہے اُس کے گھر ڈھولک بج رہا ہے۔ اور بہت سے برہمن اکٹھے ہو کر کچھ مذہبی رسوم ادا کر رہے ہیں۔

میں نے نانی اماں سے جا کر اس بھیڑ بھاڑ کے متعلق دریافت کیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ رکمنی بیچاری باوجود مفلسی کے تمام دنیا کے تیرتھ یاترا کر کے واپس آئی ہے۔ اب اُس نے تُلسی کا بیاہ رچایا ہے میں نے تعجب سے کہا نانی اماں تلسی کون ہے۔ وہ بولیں تلسی ایک پودا ہوتا ہے جسے ہندو لوگ مقدس سمجھتے ہیں۔ اور اکثر مذہب کے پابند کارِ ثواب سمجھ کر اس کی شادی رچاتے ہیں۔

دوسرے دن شام کے قریب جب میں نانی اماں کے گھر سے رخصت ہو کر بہن رکمنی کے دروازے سے گزرنے لگی۔ تو میں نے دیکھا کہ اُس کے وسیع صحن کے ایک کونے میں پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک چبوترا بنا ہوا ہے۔ اُس پر بہن رکمنی پالتی مارے بیٹھی ہے اُس کے سامنے ایک پیتل کی تھالی میں آٹے کے بنے ہوئے چند دیئے جل رہے تھے۔ شاید وہ عبادت کر رہی تھی۔

میں دروازے پر کھڑی ہو کر نہایت دلچسپی سے اُس کی حرکات و سکنات کو دیکھنے لگی۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر اُٹھی تو مجھے دروازے پر کھڑا پا کر بہت خوش ہوئی اور بڑے خلوص سے مجھے اندر بلایا میں اسی بات کی منتظر تھی۔ فوراً اندر چلی گئی۔ اُس نے مجھے لکڑی کی چوکی پر بٹھایا۔ اور گھر والوں کے حالات دریافت کرنے لگی۔

میں نے ادھر اُدھر کی باتیں جلدی ختم کرتے ہوئے کہا "بہن رکمنی کل تمہارے گھر میں کیا تقریب تھی"۔

وہ بولی "بیٹی تلسی کا بیاہ تھا"۔ میں نے کہا "تلسی کون ہے"۔

وہ کہنے لگی "بیٹی تلسی ایک دیوی تھی جو کرشن بھگوان کی پٹ رانی تھی۔ ہم لوگ کرشن بھگوان کی مورتی سے اُس کی شادی کرتے ہیں اور برہمنوں کو دان دیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے انسان کی مصیبتیں دور ہو جاتی ہیں"۔

میں نے اُس کی خوش اعتقادی پر مسکراتے ہوئے کہا کسی برہمن نے تمہیں یہ طریقہ بتایا ہوگا۔ وہ بولی "نہیں بیٹی برہمنوں کے کہنے سے تو میں نے یہ کام نہیں کیا۔ میں نے تو ایک یوگی کا فرمان پورا کیا ہے"۔ پھر مجھے اُس کی تفصیل کی مشتاق پا کر بولی "بیٹی میں بہت غریب ہوں۔ اور باوجود اس مفلسی کے تیرتھ یاترا کرنے کا مجھے بہت شوق تھا مگر مجبور تھی بغیر روپیہ کے یہ کام محال تھا۔ ایک دفعہ میرے گھر میں ایک بھگت مہاراج آئے جو تمام دُنیا کے تیرتھ یاترا کر چکے تھے میں نے اُن سے اپنے شوق کا اظہار کیا اُنہوں نے مجھے بتایا کہ کئی آدمی بغیر روپیہ کے تیرتھ یاترا کرتے ہیں کیونکہ یاتریوں کی بہت عزت کی جاتی ہے جس منزل پر وہ قیام کرتے ہیں لوگ اُن کی سیوا کرتے ہیں۔

اُن کی زبانی یہ حالات سُن کر مجھے بھی شوق چرایا۔ میں گھر سے نکل [illegible] راستے میں ایک مفلس ٹولی سے متعارف ہو گئی۔ جو تیرتھ [illegible] کرنے جا رہی تھی۔ چنانچہ میں بھی اُن یاتریوں کے ساتھ ہو لی۔ جوں جوں ہم لوگ آگے بڑھتے گئے۔ ہماری ٹولی میں اضافہ ہوتا گیا۔ امرناتھ [illegible] ہماری ٹولی میں ایک نوعمر اندھا یوگی بھی شامل ہوا۔ گو یہ اندھا تھا مگر بہت ہی شوخ اور لاپرواہ تھا۔ باوجودیکہ اُس کی شوخیوں اور شرارتوں کے میں نے اُس کی چند ایک کرامات ایسی دیکھیں جس کی وجہ سے میرے دل میں اُس کا احترام ہو گیا۔ میں خلوص و عقیدت سے اُس کی خدمت کیا کرتی۔

وہ میری اِس بے لوث خدمتگذاری پر بہت خوش ہوتا۔ ایک دن اُسے مہربان پا کر میں نے کہا "یوگی میرے لئے دُعا کر کہ پرماتما میرے دُکھ دور کرے"۔

میری اِس التجا پر وہ خاموش ہو کر سوچنے لگا پھر کچھ وقفہ کے بعد بولا "تم گھر جا کر تلسی کا بیاہ کرو۔ اور برہمنوں کو دان دو۔ تمہاری سختی دور ہو جائے گی"۔ میں پہلے ہی اُس کی کرامات کی قائل تھی۔ لیکن اُس وقت میں نے اُس کے معصوم چہرے پر ایسا جلال دیکھا جیسا کسی مہاتما یا رشی کے سوا ممکن نہیں مجھے یقین ہو گیا۔ کہ یوگی کا کہنا کبھی خطا نہیں ہوگا۔ اُسی دن وہ اندھا یوگی غائب ہو گیا۔ سو اسی لئے میں نے گھر آتے ہی سب سے پہلے یہ کام ضروری سمجھا۔

میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "اچھا بہن رکمنی خدا کرے تمہارا شوہر جلدی واپس آئے اور تم سکھی ہو جاؤ"۔

وہ آہ سرد بھر کر بولی "بیٹی ان باتوں سے مرے ہوئے تو کبھی بھی واپس نہیں آ سکتے۔ البتہ پرماتما میری بیماری دور کر دے تو بے شک سکھی ہو جاؤں"۔ میں نے پوچھا "تمہیں کیا بیماری ہے"۔ وہ بولی "بیٹی مجھے بچپن سے کلیجہ پر پھوڑا ہے۔ جو اب خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے پٹ پر سے کپڑا اُٹھا کر کلیجہ سے پٹی ہٹائی۔ اُف اُس کے کلیجہ پر اتنا بڑا ناسور تھا کہ میں کانپ اُٹھی نہ جانے وہ کیونکر زندہ تھی۔

میں نے کہا "بہن رکمنی کبھی کسی ڈاکٹر کو بھی تم نے یہ پھوڑا دکھایا ہے"۔

وہ بولی "نہیں بیٹی میں ڈاکٹروں کو دکھانا پسند نہیں کرتی کیا خبر اُن کی دوائیاں کیسی بھلی بُری چیزوں کی آمیزش سے تیار ہوتی ہیں میں دُنیا کے پیچھے اپنا جسم بھرشٹ کیوں کروں"۔

ایسی نیک عورت کو دکھ درد میں مبتلا دیکھ کر میرا دل بہت آزردہ ہوا۔ میں دل برداشتہ اپنے گھر چلی آئی۔ گھر آ کر میں نے ابا جان سے اُس کا ذکر

کیا وہ کہنے لگے "میرے پاس ناسور کی ایک مرہم ہے۔ جو ایک بزرگ کا عطیہ ہے۔ اگر رکمنی مسلمان ہوتی تو میں اُسے ضرور مرہم دیتا کیونکہ اُس بزرگ نے مرہم کے ساتھ قرآن کریم کی ایک آیت کا ورد لازمی قرار دیا ہے"۔ میں نے کہا "یہ تو معمولی بات ہے۔ جب میں مائی اماں کے گھر جایا کروں گی تو وہ آیت پڑھ کر اُس کے پھوڑے پر دم کر دیا کروں گی"۔

دوسرے دن میں وہ مرہم لے کر اُس کے گھر گئی۔ اور اُس کو سب معاملہ سمجھایا۔ اُس نے میری ہمدردی سے متاثر ہو کر اُس مرہم کا استعمال شروع کر دیا۔ خدا کے فضل سے چند ہی دنوں میں اُسے افاقہ معلوم ہونے لگا۔ وہ میری بہت شکر گذار تھی۔ رفتہ رفتہ اُس کا ناسور بھرنے لگا۔ اور ڈیڑھ دو مہینے کے اندر اُس کا وہ خوفناک پھوڑا بالکل اچھا ہو گیا۔ غسل صحت کے بعد وہ ہمارے گھر آئی۔ وہ مجھے دیوی کا اوتار کہتی۔ اور بار بار میرے پاؤں کی دھول اپنے ماتھے پر لگاتی۔ اُس کو ہمارے خاندان بھر سے عقیدت ہو گئی۔

(۳)

اُس کے صحت یاب ہونے کے چند دن بعد ابا جان یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے فوت ہو گئے۔ ہم لوگوں پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ بہن رکمنی بھی دوسرے عزیزوں کی طرح ہماری شریک غم تھی۔ ابا جان کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہماری تجارت بگڑ گئی ہے۔ اور لوگوں کا بہت سا روپیہ ہمارے ذمہ ہے یہ وقت ہم لوگوں پر بہت نازک تھا ماموں جان نے بہت کوشش کی کہ ہماری عزت بچی رہے مگر اُن کے بنائے کچھ بن نہ پڑا۔ اور چند دنوں میں ہماری تمام جائیداد قرضخواہوں نے قرق کرا لی۔ میں اور میری والدہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئیں۔

ہم لوگوں کو ماموں جان اپنے گھر لے گئے۔ وہ دولت مند آدمی تھے۔ ہمارے آرام و آسایش کا خاص خیال رکھتے تھے مگر میری والدہ کے دل پر شوہر کی وفات اور گھر کی بربادی کا ایسا صدمہ ہوا کہ چھ مہینے کے اندر اندر وہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔

میری منگنی ابا جان کی زندگی میں ہی نیاز کے ساتھ ہو چکی تھی۔ نیاز کے والدین میرے ابا کے عزیزوں میں سے تھے۔ وہ اپنے لڑکے کو ولایت بھیجنا چاہتے تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ ولایت جانے سے پہلے اُس کی شادی کر دی جائے۔ چنانچہ والدہ کی وفات کے چند ماہ بعد ہی وہ شادی کا تقاضا کرنے لگے۔ اور مجبوراً ماموں جان کو میری شادی کر دینی پڑی۔

نیاز شادی سے ایک مہینہ بعد ولایت چلا گیا۔ اور میں اپنی ساس کے پاس رہنے لگی میری ساس کے دو ہی بچے تھے ایک نیاز اور دوسری رابعہ۔ جو نیاز سے چار سال چھوٹی اور بے حد لاڈلی تھی۔ وہ شادی شدہ تھی۔ اُس کا خاوند پونا میں انجنیئر تھا۔ میری شادی کے چند ماہ بعد اُس کے خاوند اختر کا تبادلہ احمد آباد میں ہو گیا اور رابعہ اپنے خاوند کے میکے میں ہی رہنے لگی۔

رابعہ تند خو اور آتش مزاج لڑکی تھی۔ وہ مجھ پر بے جا سختیاں کرنے لگی۔ گو ساس میری حمایت کیا کرتی مگر اُسے کسی کی پرواہ نہ تھی۔ اُس نے میرا ماموں جان کے گھر جانا بند کر دیا۔ اور اس پر ہی اکتفا نہ کیا۔ بلکہ میری شکایتیں لکھ کر نیاز کو بھیجنے لگی جس پر وہ مجھے خطوں میں ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہا آخر جانے اُس نے بھائی کو کیا لکھا کہ وہ مجھ سے بالکل متنفر ہو گیا۔ اور خط و کتابت بند کر دی میں ہمیشہ رابعہ کی منت اور خوشامد کیا کرتی۔ مگر وہ سنگدل دن بدن میرے خون کی پیاسی ہوتی گئی۔ اسی ابتر حالی میں میری شادی کو تین سال گزر گئے۔ نیاز اب بیرسٹری پاس کر کے آنے والا تھا۔ اُس کے والدین بہت مسرور تھے۔ بڑی دھوم دھام سے اُس کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مجھے امید تھی کہ ساس کہہ سن کر نیاز سے میری صلح کرا دے گی۔ لیکن نیاز کو دیکھ کر میری سب امیدوں پر پانی پھر گیا کیونکہ اُس کے ساتھ ایک یورپین عورت تھی۔

میم صاحبہ کے لئے گھر کا آدھا حصہ خالی کر دیا گیا۔ وہ اور نیاز علیحدہ رہنے لگے۔ رابعہ مجھ سے بدستور دشمنی رکھتی۔ میم صاحبہ کے آنے سے اتنی سہولت ضرور ہوئی کہ مجھے ماموں جان کے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ سوتیا ڈاہ کی بلا ہے یہ صدمہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ میں اپنے ماموں جان کے گھر چلی آئی۔

ننھیال پہنچکر میں نے دیکھا کہ جہاں پرانی بوسیدہ مکان کی جگہ ایک عالیشان حویلی کھڑی ہے۔ میں نے نانی اماں سے اُس کے متعلق دریافت

گیا تو اُنھوں نے بتایا کہ بہن رکمنی کا خاوند بائیس سال کے بعد بہت سا روپیہ کما کے واپس آیا ہے۔ اور اب وہ بہت سکھی ہے۔ میرے آنے کی خبر سُن کر وہ دوڑتی آئی اور میری بلائیں لینے لگی۔ وہ سونے میں پیلی ہو رہی تھی اُسے اچھی حالت میں پا کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

ماموں جان کے گھر آکر مجھے سوت کے جلاپے اور ساس کی سختیوں سے نجات مل گئی مجھے ایک گونہ سکون محسوس ہوا اور سسرال سے نفرت ہو گئی اُس دن سے پھر میں نے سسرال کا دروازہ نہ دیکھا یہاں میرا بہت سا وقت بہن رکمنی کی محبت میں گزرتا۔ وہ مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی خدا کی قدرت اسی سال بہن رکمنی ماں بنی۔ اُس کے دو توام لڑکے پیدا ہوئے یہ لڑکے نہایت حسین تھے۔ لیکن اُن میں سے ایک لڑکا مادر زاد اندھا تھا۔ اُس نے اندھے بچے کا نام منوہر رکھا اور دوسرے کا پرکاش

مجھے اندھے سے [illegible] بہت تھی۔ وہ جب بھی میرے بغیر پل بھر چین نہ لیتا۔ بہن رکمنی نے اِس بڑھی ہوئی محبت کے احساس سے وہ بچہ مجھے دے دیا۔ اب میں اُسی اندھے بچے کی محبت کے سہارے اپنی زندگی کے دن گزارنے لگی۔

میں اکثر تنہائی میں پیارے کی سنگدلی اور اپنی بدقسمتی پر آنسو بہایا کرتی جب یہ بچہ کچھ سیانا ہوا تو میری سسکیوں کی آواز پر وہ بھی رونے لگتا۔ منوہر کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی میں بیٹھی رو رہی تھی۔ یہ کھیلتا ہوا آیا اور میرے گلے میں باہیں ڈال کر پیار سے میرے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ میرے رخسارے آنسوؤں سے تر پا کر اداسی سے کہنے لگا "ماں تم کیوں رو رہی ہو۔ تمہیں کون مارتا ہے؟"

میں نے اُسے بہلانے کے لئے کہا۔ "تم اُسے نہیں جانتے" وہ بولا "نہیں ضرور بتاؤ وہ کون آدمی ہے" میں نے کہا "وہ ظالم آدمی ہے" اُس نے کہا "وہ کہاں رہتا ہے" میں نے جواب دیا "بہت دور" وہ نہایت بھولے پن سے کہنے لگا۔ "اب کبھی مارنے آئے تو مجھے بتانا میں اُسے ٹھیک کر دوں گا" مجھے اُس کی باتوں پر ہنسی آگئی۔ میں نے کہا "بڑھے کے ہاتھ [illegible] ہو۔ اگر وہ تمہیں دیکھ پائے۔ تو اتنا پیٹے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے" وہ شوخی سے کہنے لگا "اونہہ وہ کون آیا بڑا پیٹنے والا میں اُسے گنگی کا ناچ نچا دوں"

اُس دن سے منوہر کے دل میں کچھ ایسا خیال سمایا کہ وہ اکثر رات کو سوتے وقت ظالم آدمی کا ذکر چھیڑتا تا اُس کی شکل وصورت اور نام وغیرہ دریافت کرتا۔ اسی طرح زمانہ گزرتا گیا۔ حتیٰ کہ منوہر دس سال کا ہو گیا۔ وہ بہت ہی شوخ لڑکا تھا۔ سوائے پرکاش کے وہ کبھی کسی سے ملنے آیا کرتا اور کسی کو پاس بیٹھنے بھی نہ دیتا۔ وہ پھولوں کا بہت شائق تھا۔ اس لئے میں ہمیشہ شام کے قریب اُس کو کسی باغ میں لے جایا کرتی (۳)

گلابی جاڑے کی بانکی شام تھی چاند کی ٹھنڈی میٹھی روشنی دل کو لبھا رہی تھی شفق کی سُرخی نے روئے فلک پر گلال چھڑک رکھا تھا۔ رنگ و بو میں سرشار ہوا کے ننھے ننھے جھونکے لطیفانہ شوخی سے کھیل رہے تھے میں اور منوہر ایک باغ میں بیٹھے تھے۔ منوہر ظالم آدمی کا اس طرح ذکر کر رہا تھا جیسے وہ عنقریب اُس سے بدلہ لیگا۔

ہم کافی دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ منوہر میٹھی میٹھی باتوں پر اپنی شیشیاں بکھارتا ہوا پھولوں سے کھیلتا رہا۔ آخر کار میں نے کہا۔ منوہر وقت بہت ہو گیا ہے بیٹا۔ اب چلنا چاہیے" وہ بولا "میں ابھی نہیں جا سکتا"۔ میں نے کہا "کیوں" وہ کہنے لگا "ابھی وہ وقت نہیں آیا" میں نے کہا "کونسا وقت" اُس نے کہا۔ "ظالم آدمی سے ملنے کا" یہ کہہ کر وہ قلانچیں بھرتا ہوا گھاس کے تختوں پر دوڑنے لگا۔ اُس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اندھا نہیں ہے۔

میں نے اُس کی حالت پر تعجب کرتے ہوئے کہا "منوہر اس طرح بے تحاشا نہ دوڑو کہیں گر کر تمہیں چوٹ نہ آجائے" وہ بولا "چوٹ کیوں آ گئی ماں پرکاش ہر روز اس طرح دوڑتا ہے۔ اُس کے کبھی چوٹ نہیں آئی" میں نے کہا "وہ تو آنکھوں والا ہے" وہ کہنے لگا "تو کیا میں آنکھوں والا نہیں"۔ میں اُس کا جواب سن کر خاموش ہو گئی۔ مجھے گوارہ نہ تھا۔ کہ اندھا کہہ کر اُس کا دل دکھاؤں۔ اس لئے میں نے اُسے ٹالتے ہوئے کہا۔ "وہ سکول میں پڑھتا ہے تم اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے" وہ لاپرواہی سے کہنے لگا۔ "اونہہ سکول میں پڑھنا کونسی بڑی بات ہے۔ اگر میں پڑھنے لگوں تو کبھی وہ میرا مقابلہ نہ کر سکے مگر پڑھنے میں میرا دل نہیں لگے گا۔"

وہ پھر کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ اور میں چپ چاپ اُس کی دلچسپ حرکتوں کو دیکھتی رہی۔ آج سے پہلے میں نے کبھی اُسے اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ اُس کی معصومانہ شوخیوں سے میرا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔

بہت دیر تک اسی طرح کھیل کود میں مصروف رہنے کے بعد خود بخود کہنے لگا۔ "چلو ماں گھر چلیں"۔ میں نے طنزاً کہا۔ ابھی کاہے کو جاتے ہو کیا کھیل کود سے اتنی جلدی اُکتا گئے"۔ وہ مُنہ بنا کر کہنے لگا۔ "اُکتایا تو نہیں لیکن اب جانا ہی بہتر ہے"۔

ہم دونوں باغ سے باہر نکلے میرا ارادہ سواری پر جانے کا تھا۔ مگر منوہر مچل گیا۔ کہ میں پیدل ہی چلوں گا۔ میں نے اُسے پیار سے سمجھایا پھر سختی سے کہا تاہم اُس پر کچھ اثر نہ ہُوا۔ بلکہ بسورنے لگا۔ میں مجبور ہو گئی۔ رات کا وقت ویران راستہ۔ اندھے بچے کا ساتھ عجب مصیبت کا سامنا تھا۔ میں آگے تھی۔ منوہر مجھ سے دو قدم پیچھے تھا۔ میں اُس کا ہاتھ پکڑے اُس کو بیجا ضد پر ملامت کرتی ہوئی آہستہ جا رہی تھی۔

ایک جگہ یکایک منوہر ٹھیر گیا۔ میں نے کہا۔ "اب ٹھیرنے کا وقت نہیں جلدی چلو"۔ اور اُس کا ہاتھ کھینچنے لگی۔ وہ متانت سے بولا۔ "یہاں ٹھیرنا ضروری ہے"۔ میں نے خفگی سے پوچھا "کیوں"۔ اُس نے جواب دیا۔ "وہ آ رہا ہے"۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "کون آ رہا ہے"۔ وہ بولا "ظالم آدمی"۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو دور سڑک پر ایک شخص سر جھکائے اندھا دھند آ رہا تھا۔ گو دور ہونے کی وجہ سے اُس کی شکل و صورت تو نہ دکھائی دیتی تھی مگر اُس کی لڑکھڑاتی ہوئی چال سے ظاہر تھا کہ کوئی شرابی ہے۔ میں نے کہا۔ منوہر خاموش ہو جاؤ کوئی شرابی آ رہا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے میں سڑک کے ایک طرف سرکنے لگی۔ منوہر بولا۔ "ماں سیدھا چلو۔ درختوں کی طرف کیوں جا رہی ہو"۔ مجھے حیرت تھی کہ میرا سڑک سے نیچے اترنا اور اُس شرابی کا آنا جو ابھی بہت دور ہے اسے کس طرح معلوم ہُوا۔ میں نے اُسے بہلانے کے لئے کہا۔ میں تو بالکل ٹھیک چل رہی ہوں"۔ وہ ہنس کر کہنے لگا۔ "ماں مجھے چکمے دیتی ہو"۔ میں نے کہا۔ "تم نے کیسے دیکھا کہ یہ غلط راستہ ہے"۔ وہ بولا۔ "جیسے تم دیکھ رہی ہو"۔ میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری طرح اندھی تو نہیں ہوں"۔

آج یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اُسے اندھا کہا۔ میرا خیال تھا کہ ابھی منوہر مجھ سے پوچھیگا۔ کہ اندھا کسے کہتے ہیں مگر وہ بولا۔ "اچھا ماں ہم نے آنکھوں سے ہی ظالم آدمی کو پہچان لیا۔ لیکن تم آنکھوں والی ہو کر بھی نہ پہچان سکیں"۔ اس اثنا میں وہ شخص کچھ قریب آ گیا۔ منوہر پھر بولا "چلو ماں ظالم آدمی سے ملو"۔ میں نے کانپ کر کہا۔ "منوہر خدا کے لئے چپ رہو نہ جانے وہ کون ہے میں عورت ذات ہوں۔ اگر کوئی کچھ کہہ بیٹھے تو کیا ہو"۔ منوہر کہنے لگا۔ "ماں میرے ساتھ ہوتے کے باوجود بھی کیوں اتنا ڈرتی ہو"۔

میں نے اُس کی لاف زنی سے تنگ آ کر کہا۔ "ہاں تمہارے ساتھ ہوتے مجھے کیا خوف ہو سکتا ہے۔ تم تو بڑے تیس مار خاں ہو"۔ وہ بولا۔ "کہاں تیس مار خاں"۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے زور سے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا لیا۔ اور آنے والے آدمی پر جھپٹا۔ اُس نے ہوا میں کوئی لمبی سی چیز اچھالی یہ شاید اُس کی چھڑی تھی جو اُس نے آنے والے شخص پر پھینکی۔

یہ سب کچھ آن واحد میں ہو گیا۔ میں بوکھلائی ہوئی اُس کی طرف دوڑی۔ لیکن وہ جست کر کے آگے بڑھ گیا۔ یکایک کسی زبردست چیز کی ٹکر سے میں بیہوش ہو گئی۔

(۴)

جب میری آنکھ کھلی۔ تو میں ہسپتال میں پڑی تھی۔ منوہر مغموم صورت بنائے میرے پلنگ کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھا تھا۔ میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ "منوہر میں کہاں ہوں"۔ میری آواز سُن کر اُس کا مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ مگر قبل اِس کے کہ وہ کچھ جواب دے ایک نرس میرے قریب آ کر کہنے لگی۔ "بی بی تم ہسپتال میں ہو رات کو ایک رحمدل آدمی تمہیں یہاں لایا تھا۔ موٹر کی ٹکر سے تمہاری ٹانگوں میں چوٹ آئی ہے لیکن کچھ فکر کی بات نہیں۔ آپ جلدی اچھی ہو جائیں گی"۔

جب نرس چلی گئی تو منوہر میرے گلے میں باہیں ڈال کر پیار کرنے لگا میں نے اُسے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "دیکھو منوہر تمہاری شرارتوں کی بدولت میری یہ گت ہوئی"۔ وہ محجوب ہو کر کہنے لگا۔ "ماں اب معاف کرو آئندہ کبھی شرارت نہ کروں گا۔ انسان پر جو بھی تکلیف آتی ہے۔ اُس میں بھی

کوئی مصلحت ہوتی ہے۔" اس کی مدبرانہ گفتگو پر میں نے اُسے چوم کر کہا باقی لڑکے تجھے یہ عاقلانہ باتیں کیسے آئیں۔

وہ بہت دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اور اس دوران میں اکثر کئی دفعہ دروازے پر جا کر کھڑا ہوتا جیسے کسی کا انتظار ہو۔ دس بجے کے قریب دروازے سے ہٹ کر پھر میرے پاس آیا۔ اور مجھ پر جھک کر سرگوشی سے کہنے لگا۔ "وماں وہ آگیا ہے۔" میں نے کہا "کون؟" وہ بولا "ظالم آدمی" میں نے اُکتا کر کہا۔ "بیہودہ بکنے لگے ہو۔" اُسی وقت دروازہ کھلا اور نرس کے ہمراہ ایک شخص اندر داخل ہوا منوہر بولا۔ "تو میں جھوٹ کہتا تھا؟"

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سچ مچ نرس کے ہمراہ نیاز آرہا تھا۔ منوہر کی پیشگوئی پوری ہوتی دیکھ کر ایک ہلکی چیخ میرے مُنہ سے نکل پڑی۔ نیاز نے پہلے نرس سے میرا حال دریافت کیا پھر میرے قریب کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ وہ سخت شرمسار تھا کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر کہہ نہ سکتا تھا۔ ادھر میں بھی اس غیر متوقع ملاقات سے سہم کر دم بخود ہو رہی تھی۔ لیکن منوہر نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا "ماں اس نیک آدمی نے تمہیں سڑک سے اُٹھا کر ہسپتال پہنچایا تھا" نیاز تعجب سے کہنے لگا۔ "تم نے مجھے کس طرح پہچانا کیا تمہیں کچھ دکھائی دیتا ہے؟"

نیاز پھر خاموش ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ منوہر اُسے خاموش پا کر دوبارہ کہنے لگا "ماں اس آدمی کا شکریہ ادا کرو" اور نہایت چلبلے پن سے میرا ہاتھ پکڑ کر نیاز کے ہاتھ میں دیدیا۔ مجھے منوہر کی اس چاپلوسی پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ نیاز بھی ہنس دیا اس کے بعد دیر تک گلے شکوے ہوتے رہے۔ نیاز گذشتہ سلوک پر بہت پشیمان تھا۔ وفور مسرت سے میرے آنسو رواں تھے۔ نیاز کی بھی ہچکی بندھ رہی تھی۔ نیاز نے پوچھا "یہ بچہ کون ہے؟" میں نے بیتی زندگی کی ساری داستان اُسے سنائی۔ اُس نے خوش ہو کر منوہر کو گود میں اُٹھا لیا۔

میرے عزیزوں کو رات والے حادثے کی اطلاع کی گئی سا موں جان میری گمشدگی سے سخت ہراساں تھے میری خبر پا کر فوراً ہسپتال میں آئے۔ نیاز کے اس اتفاقیہ ملاپ سے سب کو خوشی ہوئی۔ اس اچانک حادثے سے میری قسمت کھُل گئی۔ نیاز اکثر دن بھر میرے پاس رہتا۔ وہ میرا مدۂ بے دام ہو چکا تھا۔ اور منوہر سے بھی ایسی ہی محبت کرتا جیسا ایک حقیقی باپ اپنے پیارے بچے سے۔

دس سال کے بعد میں پھر اپنے گھر آباد ہوئی میری ساس اور خسر کا مدت سے انتقال ہو چکا تھا۔ رابعہ گو اب بھی گھر میں موجود تھی۔ مگر وہ پہلے کی طرح بدمزاج رابعہ نہ تھی۔ بلکہ اُس کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ خود مظلوم تھی۔ نیاز نے مجھے بتایا کہ میم صاحبہ نے جس کو نیاز ولایت سے لائے تھے بے وفائی کی اور طلاق حاصل کر کے انگریز سے شادی کر لی۔

ہمارے ملاپ کے ایک ماہ بعد منوہر شام کے قریب نیاز کے ساتھ سیر کو گیا۔ میری طبیعت کچھ ناساز تھی اس لئے میں نہ جا سکی۔ جب وہ واپس آیا۔ تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ آتے ہی میرے گلے لگ کر رونے ہوئے کہنے لگا۔ "ماں تم نے میری بہت خدمت کی ہے مجھے بخش دو۔ موت میرے قریب تر آچکی ہے۔" نیاز نے بتایا کہ راستے میں منوہر کو قے ہوئی ہے۔

قے ہونا معمولی بات تھی۔ میں نے منوہر کو تسلی دی۔ اور ڈاکٹر کو فون کیا مگر ڈاکٹر کے آنے سے پیشتر اُس کو پھر قے ہوئی اور ڈاکٹر کے آنے تک اُس کی حالت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اُسے بچانے کے بہت کوشش کی۔ لیکن موت کا خونی پنجہ اُس تک پہنچ چکا تھا۔ وہ سب سے پُرعجب اور الوداعی باتیں کرتا ہوا رات کے بارہ بجے کے قریب راہیِ عدم ہوا۔

(۵)

منوہر کی موت کا مجھے بہت صدمہ ہوا میرا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا میں اکثر وقت بے وقت اُس کی قبر پر جا کر پہروں رویا کرتی اور پاگلوں کی طرح قبر سے *

نے جواب دے دیا۔ رفتار سست ہوگئی تاہم وہ ابھی سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے رو کر کہا "خدا کے لئے ذرا توٹھر جا میں ایک دفعہ تجھے جی بھر کر دیکھ لوں۔" میری اِس التجا پر وہ ٹھیر گیا میں ہمت کر کے گرتی پڑتی ٹیلے پر چڑھ گئی۔ وہ بالکل خاموش کھڑا تھا۔ میں نے بے تابی سے پوچھا "پیارے تم کون ہو" وہ آہستگی سے بولا "منوہر" محبت وارفتگی سے میری چیخیں نکل گئیں۔ میں آغوش پھیلا کر اُس کی طرف بڑھی۔ مگر وہ تڑپ کر علیحدہ ہوگیا۔ اور مری ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "ہاں تمہارا منوہر مرچکا ہے۔"

میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئی اور مایوسی سے کہا۔ "پھر تم کون ہو" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "ہاں اِن باتوں کو بھول جاؤ۔" میں نے کہا تمہیں ایسا کہنے کا کیا حق ہے۔ میں منوہر کو کیسے بھول سکتی ہوں۔" وہ غمگین لہجہ میں کہنے لگا "تمہارے رونے دھونے سے منوہر کو بہت تکلیف ہوگی۔ اگر تم ایسا نہ کرو۔ تو شاید تمہیں وہ کبھی کبھی ملتا رہے" میں نے کہا۔ "آہ وہ تو مرچکا ہے۔ اب مجھے کیسے مل سکتا ہے۔" وہ کپکپائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "وہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے اور زندہ رہیگا"۔

انتہائی مایوسی انسان کو خوش اعتقاد بنا دیتی ہے۔ مجھے یاد آگیا۔ کہ اس کی قبر خالی ہے۔ اور یہ منوہر ہی ہے۔ میں نے ملتجیانہ انداز سے کہا۔ "منوہر خدا کے لئے مجھے پاگل نہ بناؤ۔ تم کسی معجزانہ طور پر زندہ ہو۔ میں نے تمہاری قبر کھود کر بھی دیکھا تمہاری لاش غائب تھی۔ مجھے سچ بتاؤ۔ یہ کیا ماجرا ہے" وہ بولا۔ "اپنی زندگی کا راز کیسے بتاؤں ہاں یہ بتا سکتا ہوں کہ میں کسی وقت تمہارا منوہر ضرور تھا۔" میں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ "لیکن کیا اب منوہر نہیں ہو۔" وہ کہنے لگا۔ "نہیں"۔ میں نے کہا "تو کیا تم منوہر کی روح ہو۔" وہ کہنے لگا۔ "بالکل نہیں" میں نے دوبارہ کہا "پھر تم کون ہو۔" وہ بولا "ہاں چلی جاؤ اس پھیر میں نہ پڑو۔" میں نے کہا "منوہر مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے مگر تم مجھ سے اتنے بیگانہ ہوگئے ہو۔" وہ سنجیدگی سے کہنے لگا "ہاں مجھے بھی محبت ضرور ہے۔ لیکن میں تمہیں بھلا دینا چاہتا ہوں تاکہ تمہاری محبت ایک دفعہ پھر مجھے انسانی زندگی پر مجبور نہ کر دے۔ میں نے کہا "منوہر اگر تم مجھے یہ راز بتا دیتے تو شاید میں مطمئن ہو جاتی" وہ "بھلا چھوڑو ہاں اِس ذکر کو سن کر کیا کروگی۔" یہ کہہ کر پھر گہری سوچ میں پڑگیا۔ پھر یکایک کہنے لگا۔ اچھا ہاں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں ایک داستان سناتا ہوں۔"

(۶)

چاند کی روپہری کرنیں ریت کے نورانی ذروں پر مچل رہی تھیں۔ نقرئی چاندنی میں منعکس سمندری لہریں سیاہ فام چٹانوں کی ٹکر سے اِس طرح پارہ پارہ ہو کر ہوا میں اُڑتیں۔ جیسے سمندر میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔ معتدل سمندری ہوائیں دھیرے دھیرے چل رہی تھیں۔ ہم دونوں ٹیلے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

وہ کہنے لگا۔ "آج سے سالہا سال پیشتر جبکہ دنیا گناہوں سے پاک اور دیوتاؤں سے پُر تھی وادیٔ گنگا کی پاکیزہ سرزمین میں ایک خوبصورت مندر تھا۔ یہ ایک روحانی درس گاہ تھی۔ جہاں عشق حقانی کا سبق ملتا۔ وہ میخانہ تھا۔ جہاں مئے عرفان کے پیاسے روحانی تسکین حاصل کرتے یہ پُرعظمت مندر دیوتاؤں کا مرکز تھا۔ اِس مقدس مندر میں کسی دیوی کی ایک حسین پجارن رہتی تھی۔ خلوص و عقیدتمندی سے اُس کی آواز میں البیلا رس پیدا ہوگیا۔ کہ پوجا کے دوران میں جب وہ اپنی مترنم آواز میں معرفتِ حق کے گیت گاتی تو گنگا کا پانی رک جاتا۔ صبح کے ستارے کانپنے لگتے اور ہوا کی نبضیں ساقط ہو جاتیں۔ وہ دیوتاؤں کی منظورِ نظر تھی۔ بلکہ خود دیوی تھی۔

بدقسمتی سے ایک نووارد دیاتری اُس کی پُرسوز و شیریں آواز پر عاشق ہوگیا۔ پجارن کو اِس عشق کا بالکل علم نہ تھا۔ اُس کی ذات دنیاوی خواہشات اور لہو و لعب سے بالاتر تھی۔ پوجا کے وقت وہ نوجوان گل پیراہن جھاڑیوں اور صنوبر کے گنجان سایوں میں چھپ کر اُسے دیکھا کرتا۔ جب وہ پوجا سے فارغ ہو کر واپس جاتی تو وہ اُس کی جدائی میں نقش پا کی طرح بیٹھ جاتا۔ ایک دن ایک دیوتا کا ادھر سے گزر ہوا۔ یہ دیوتا شوخ اور زندہ دل تھا۔ اُس نے اُس کی آشفتہ حالی کی وجہ پوچھی۔ نوجوان نے اپنی داستانِ عشق کہہ سنائی۔

دوسرے دن پجارن تلسی کی پوجا کے لئے آئی۔ اُس کے ہاتھ میں طلائی انگیٹھی تھی جس میں بڑے بڑے انگارے سلگ رہے تھے۔ دوسرے ہاتھ میں سونے کا تھال تھا جس میں ہون کا سامان اور پھول وغیرہ رکھے تھے تلسی کے قریب پہنچ کر اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ اس کا دل بجھ گیا۔ وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی نہ جانے اُس کا پُرعظمت دل کیا چاہتا تھا۔ یہ سب اُس دیوتا کے سحر کا نتیجہ تھا۔ پجارن کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر اُس دیوتا نے قہقہہ لگایا اور بھاگ گیا۔ اچانک بدقسمت پجارن کی نگاہ صنوبر کے پیڑ میں چھپے ہوئے نوجوان پر پڑی محبت کے اثر سے اُس پر مدہوشی طاری ہوگئی۔ اور انگاروں سے لبریز انگیٹھی اُس کے ہاتھ سے گر گئی۔

یکایک دردناک چیخ فضا میں گونج اٹھی اور آناً فاناً تمام دیوتا جمع ہو گئے۔ تلسی کا پودا جھلس چکا تھا جس سے زرد دھواں نکل رہا تھا۔ دیوتاؤں نے تلسی کے پودے پر گنگا کا پوتر پانی چھڑکا اور اپنی سحر کار طاقتوں سے اُسے از سرِ نو تر و تازہ کر دیا۔ پجارن عبرتناک سزا کی مستحق تھی۔ اُس کو ہلاک کر دینے کا فیصلہ ہوا کہ وہ مختلف جنموں میں دکھ بھری زندگی بسر کرے۔ اور تلسی کو جلانے کی سزا میں ہر جنم میں اُس کے سینے پر ایک ناسور رہے۔

اِس کے بعد اعلان کیا گیا کہ جو اِس پجارن سے ہمدردی کرے گا۔ وہ دیوتاؤں کی لعنت میں گرفتار ہو کر ذلیل و خوار ہو گا۔ اُس دیوتا کو جس کے سحر سے پجارن بیہوش ہوئی تھی۔ اس فیصلے پر بہت ہی افسوس ہوا مگر دیوتاؤں کی سوگند سے ڈر کر خاموش رہا۔ چنانچہ بدقسمت پجارن سالہا سال تک مختلف جنموں میں دکھ جھیلتی رہی ناسور برابر اُس کے کلیجے پر موجود رہا۔

موجودہ صدی میں پھر اُس نے نیا جنم لیا۔ وہ بہت نیک اور خداترس تھی۔ اکثر محتاجوں اور بیواؤں کی دعائیں حاصل کرتی رہی اُس نے دُنیا کے تمام تیرتھوں کے درشن کئے۔ جن کی برکت سے ایک اندھے یوگی نے اُسے ایسا طریقہ بتایا جس سے دوبارہ وہ تلسی دیوی کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

اندھا یوگی اُس کی چارہ سازی کی بنا پر مجرم گردانا گیا۔ اور دیوتاؤں کے غیض و غضب کا شکار ہو گیا۔ لیکن یوگی خود ایک زبردست طاقت کا مالک تھا اِس لئے اُسے صرف یہ سزا ملی کہ وہ اُس دکھیا کے گھر جنم لے کر دس سال تک اُس کی ہستی میں رہے۔

اندھے یوگی کے فرمان کے مطابق اُس عورت نے تلسی کا بیاہ رچایا تلسی جی اُس سے خوش ہو گئیں تاہم وہ دیوتاؤں کو ناراض نہ کرنا چاہتی تھیں۔ اِس لئے اُنہوں نے تمہارے دل میں اس عورت کی ہمدردی پیدا کر دی اور تمہارے ذریعے اُس دکھیا تک ایک ایسے دیوتا کا کلام بھیجا جس کی طاقت سب طاقتوں سے بلند تر تھی۔ اس کلام کی برکت سے اُس عورت کو ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی مگر تم اُس کی ہمدردی کے جرم میں دیوتاؤں کی موردِ عتاب ہو گئیں اور تمہیں کئی سال تک بے اطمینانی کی زندگی گزارنی پڑی۔

اُس عورت کا ناسور دور ہوتے ہی اُس کے دوسرے دکھوں کا بھی خاتمہ ہو گیا اُس کا خاوند واپس آ گیا۔ اُس کے دو توام لڑکے پیدا ہوئے۔ جن میں ایک اندھا تھا۔ اور دوسرا آنکھوں والا۔ یہ اندھا لڑکا وہی یوگی تھا جس نے اُس عورت کو تلسی جی کی خوشنودی کا راز بتایا تھا۔ اور اب سزا کے طور پر اُس کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اِس لڑکے سے تمہیں محبت ہو گئی۔ جس نے اپنی موت کے قریب بھیجکر تمہاری محبت کے عوض اپنی سحر کار طاقت سے نیاز کا دل تمہاری طرف پھیر دیا۔ اور دوسری آنے والی مصیبتوں کو بھی رد کر دیا۔ پھر وہ یوگی سزا کی میعاد ہونے پر بظاہر مر گیا۔ لیکن درحقیقت وہ مرا نہیں بلکہ اپنے اصلی روپ میں چلا گیا۔"

اس انوکھی داستان سے میں دیر تلک حیرت میں غرق ہو گئی تھوڑے وقفے کے بعد وہ پھر بولا۔"ماں اندھا یوگی دراصل وہی دیوتا تھا جس نے کسی زمانے میں نوجوان یاتری کی حالت پر رحم کھا کر تلسی کی حسین پجارن کے دل پر عشق کا تیر چلایا تھا" میں نے گھبرا کر سر اُوپر اٹھا کر دیکھا۔ وہی معصوم چہرے والا منوہر کھڑا تھا گلاب اُسکے خوبصورت سڈول شانوں پر نورانی پر سایہ کئے تھے اُسکے گرد ایک نورانی ہالہ تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پھولوں کی ایک بانکی کمان تھی

اُسکے ملکوتی تقدس اور عظمت جلال سے مرعوب ہو کر میں نے اُسے تعظیم دی اور بے اختیار میری زبان سے نکلا " آہ عشق کا دیوتا کام دیو اور میرا منوہر ایک ہی ہیں۔

(مسز عبدالقادر، والدہ سراج الدین ظفر بی۔ اے)

آرٹ کے چار نادر
نمونے
تانبے-پیتل ... اور
لکڑی کا کام دونوں
[illegible] دکھائے گئے ہیں
... کا اور آدمی
... لکڑی کا ...
ہوا ہے۔

ادیبِ عصر

پریم چند

از جناب محمود نظامی صاحب بی۔ اے

اردو زبان کس قدر مظلوم ہے۔ کہ اس میں یا تو اچھا ادیب پیدا ہی نہیں ہوتا یا پھر ہوتا ہے۔ تو وقت سے پہلے اُٹھ جاتا ہے۔ پہلے دو تین سالوں میں اردو کے جوز بردست ارباب جلدی جلدی اُٹھ گئے۔ ان کی اموات سے ہمارے ادب کو ایک المناک صدی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس قحط الرجال کے سمے میں منشی پریم چند جیسے عالی مرتبہ ادیب کا اُٹھ جانا ہماری بہت بڑی بدبختی ہے پریم چند کی موت سے گویا قصر اردو کا ایک بہت بڑا ستون گر گیا ہے۔ یہ ایک ایسا وطنی حادثہ ہے۔ جس کی تلافی مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

پریم چند کی ذات جامع کمالات تھی۔ اس کی قلم سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو فیض پہنچتا رہا۔ چنانچہ اس وقت ٹھیک طور کہا نہیں جاسکتا کہ اس کے اٹھ جانے سے کون سی زبان کو زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ اُردو ناول نویسی کے اس فرسودہ میدان میں جہاں افراط و تفریط کی وجہ سے اچھے اور برے اسان پر جوشے مایہ لا امتیاز ہی نظر نہیں آتی۔ اگر کسی شخص نے اپنے لئے الگ نئی راہ نکالی اور بھٹکتے ہوئے ادبار کے سامنے ایک نیا نمونہ پیش کیا۔ تو وہ پریم چند ہے یہ پریم چند ہی کا کمال ہے۔ کہ اس کی تصنیفات کے طفیل ہمارا جمود ایک اضطراب میں تبدیل ہو رہا ہے۔ اور اُردو ناول ایک زندہ اور چلتی پھرتی مخلوق نظر آتا ہے۔

پریم چند نے اپنے قلم سے دیو و پری کے لطلے سیدھے قصے اور غیر فطری انسانوں کے افسانے سنانے کی بجائے معاشرہ کی ناہمواریوں پر تنقید کی۔ ہماری معاشرت مغربی شائستگی کے مجہول اثرات کی وجہ سے اب تک عجیب کشمکش عام میں پڑی ہوئی ہے۔ معاشرہ کے کسی نمونے کو ہم اپنا نمائندہ سمجھ سکتے ہیں یہ ایک بہت اہم سوال ہے۔ عوام قدامت پسند ہیں۔ تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ابھی تک افراتفری کے عالم میں ہے۔ اعلےٰ طبقہ مغربی تہذیب کی مدح سرائی میں اپنی روایات کا سرے سے منحرف ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ ہمارے ناول کی مقبی زمین کس قدر کھوکھلی ہوگی اس کے علاوہ ہمارا سیاسی تنزل بھی قابلِ غور ہے۔ جو درحقیقت ہماری قومی زندگی کے ایک سے زیادہ پہلوؤں پر حاوی ہے۔ خود ہماری اقتصادی اور معاشی حالت بھی ہمارے سماج کی کئی کمزوریوں کو مضبوطی کے ساتھ پاؤں جمانے میں مددگار ہے اس صورت میں آسانی کے ساتھ ایک صحیح نصب العین قائم کرنا۔ یقیناً بہت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستانی زندگی ناول کی مقتضی نہیں۔ ہمارے ہاں رہنے سہنے کا طریقہ رسموں کی تیار خاندانی خصوصیات۔ قومی رعایات۔ نظریۂ زندگی۔ غرضیکہ ہمارے ہاں کی کوئی چیز معین نہیں۔ خیالات کا رجحان اور طبائع کا میلان صدہا مختلف ہے اور سب سے مقدم یہ کہ ہم میں صنفوں کے ارتباط و اختلاط میں بھی آزادی نہیں۔ اس صورت میں ناول کو ترقی ہوتی تو کیونکر دوسری طرف فرقہ وارانہ ذہنیت ہم پر اس قدر مسلط ہیں کہ کسی مسلمان یا ہندو مصنف کے لئے ممکن نہیں

نا قابلِ تذکرہ کر سکے۔ اور خواہ وہ کتنی ہی فراخ دلی سے [illegible] کوشش کرے۔ پھر بھی ممکن نہیں اور پر تعصب کا الزام نہ لگے۔ مگر اس تنگ فضا میں رہ کر منشی پریم چند نے صحیح ناول نویسی کی داغ بیل ڈالی۔ اس کی لازوال شہرت کسی اخبار کی ہنگامہ خیزی یا پراپیگنڈے کی مرہون احسان نہیں۔ وہ جو کچھ ہے اپنی ادبی قابلیت اور عالمانہ استعداد کا نتیجہ ہے۔ اس نے اردو کی ایک فرسودہ صنف کے توسط سے ایک ناقدر ماحول میں رہ کر بھی جو کچھ کیا وہ ریاض اردو کے ایسے سدا بہار پھول ہیں جنہیں استبدادِ زمانہ کی خزاں کے جھونکے کملا نہیں سکتے۔ یہ ایسے نقوش ہیں۔ جن کی آب و تاب گزرتے ہوئے وقت اور بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ ماند نہیں پڑ سکتی۔

پریم چند نے لفظی صناعیوں اور دلکشیوں پر توجہ دینے کی بجائے اور مفروضات اور نرے تخیلات کے مقابل میں جس طرح حقائق اور واقعات زندگی کو موضوعِ تحریر بنایا وہ اُس کی انفرادیت کا ثبوت ہے۔ اس کی کتابیں نہ صرف ہمارے ناقص سماجی نظام کی مذمت کرتی ہیں۔ بلکہ ایک ہی قومیت اور وطنیت کے جذبے کی علمبردار بھی ہیں وہ اپنے معاصرین کے برعکس اپنی کتابوں میں اسی وطن کی وسیع دنیا کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس کے مسائل حاضرہ پر غور و فکر کرکے اسی کی روزمرہ زندگی کی پیچیدگیوں کے حل کرنے کی بہترین صورتیں اور اصول پیش کرتا ہے اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے ملکی ماحول معتقدات اور روایات کے درمیان رہ کر لکھا ہے تاکہ ارباب حل و عقد سنجیدگی کے ساتھ اس کی گتھیوں پر غور کرسکیں۔ پریم چند کو یہ فخر اپنے ملک سے عشق ہے اور وہ اس کی روایات کا بہت بڑا محافظ ہے۔ اس لئے وہ ضرور ایک حد تک قدامت پسند نظر آتا ہے۔ مگر اس کی قدامت پسندی جہالت کی کسی حد کو نہیں پہنچتی۔ وہ مغربی تہذیب کو شکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بھی اس سے ہر وہ چیز قبول کرنے کے لئے تیار ہے جس سے ہماری فطرت مسخ نہ ہو جائے۔ ہم اپنی اصلیت کھو نہ دیں۔

ہندوستان سے عشق رکھنے کی وجہ سے وہ کسانوں کا بھی سچا عاشق ہے۔ چنانچہ اپنی کتابوں کے اوراق میں پریم چند نے کسانوں مزدوروں دیہاتیوں اور ادنیٰ درجے کے ملازمین کے جن مصائب کا نقشہ کھینچا ہے وہ اس قدر سچا اور اس قدر صحیح ہے۔ کہ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا عکسی فوٹو دکھائی دیتا ہے۔ اس کے تمام کردار ہندوستانی ماحول کے جیتے جاگتے آزاد ہیں جو آپ کے سامنے اسی طرح چلتے پھرتے ہیں جس طرح آپ کو ہر روز اپنے شہر کی گلیوں اور بازاروں میں ان سے سابقہ پڑتا ہے۔ اسی طرح پریم چند کے افسانوں کی مائیں۔ بہنیں۔ اور بیویاں بالکل وہی ہیں۔ جن کے پاکیزہ جلووں سے ہندوستانی گھر معمور ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے ناولوں میں بعض اوقات پلاٹ کی کمزوری پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لئے ناول آٹھ نو صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور دو دو جلدیں کم و بیش ہر ایک کی ہیں۔ اسی طویل نویسی کی وجہ سے اس کے بعض حصوں میں پلاٹ کی وہ دلکشی مفقود ہو جاتی ہے۔ جو دوسرے مقامات میں نظر آتی ہے۔ مگر اس کے برعکس مختصر افسانوں میں یہ کمزوری سخت سے سخت نقاد کو بھی نظر نہیں آسکتی۔ ان کی کردار نویسی کا کمال بھی ان کی مختصر کہانیوں ہی میں نظر آتا ہے۔ یہاں انہوں نے ذرا ذرا سی بات سے عجیب عجیب نتائج مرتب کئے ہیں اور جہاں انہوں نے اپنے قلم کو نفسیات کے لطیف ترین احساسات کا مظہر بنایا ہے۔

پریم چند کی تمام تصنیفات نہایت زبردست اور پر اثر ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ زندگی کی بہت سی ایسی باتیں جنہیں ہم آسان اور قابل توجہ سمجھتے ہیں۔ فی الحقیقت پیچیدہ اور دقائق سے بھری ہوئی ہیں بعض لوگ اس طرح کی غیر مساعی طبیعت رکھتے ہیں جن کے دلوں میں دنیا کی چیزیں بہت ہی کم کشش رکھتی ہیں۔ وہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کی دید سے محروم رہتے ہیں۔ اس لئے وہ اس دنیا میں رہ کر بھی اس دنیا سے الگ ہی رہتے ہیں۔ بعض اس طرح کے خوش قسمت لوگ بھی ہیں۔ جن کی آنکھ دل اور دماغ ہر جگہ بیدار رہتا ہے۔ فطرت کے گوشے گوشے میں انہیں پیغام ملتا ہے۔ دنیا کی طرح طرح کی تحریکات ان کے دل کی تاروں کو طرح طرح کے نغموں سے معمور کر دیتی ہے

پریم چند انہیں قسم کے انسانوں میں سے تھے۔ ان کی نگاہ دوربین ہر چیز پر پڑتی تھی۔ اور اپنی ضرورت کی چیزیں اس میں سے چن لیتی تھی

یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں ہماری معاشرتی زندگی کی ایک ایسی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ جسے ہم کئی مغربی مصنفین کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔

پریم چند کے ہاں ہماری معاشرت کی بلندی اور پستی دونوں نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں امرا اور روٴسا کا تذکرہ ہی نہیں۔ بلکہ راہگیری۔ سرائے والوں۔ کسانوں۔ مزدوروں۔ دیہاتیوں۔ چھوٹے چھوٹے شہروں میں رہنے والوں غرض ہندوستان کی وسیع مملکت کے ہر قسم کے حقیر لوگوں کا حال بھی موجود ہے۔ بلکہ انہوں نے التزاماً کوشش کی ہے۔ اڑائی کے ناول کا پس منظر دیہات ہی رہے۔ اور سچ پوچھیئے تو دیہات کی صحیح سپرٹ کو سمجھنے والا ان سے بہتر نہیں مل سکتا۔ اسی دیہاتی فضا کی وجہ سے پریم چند ہندو مسلم اتحاد کے بھی بہت بڑے علمبردار ہیں تعصب اور فرقہ کی جو فضا آج ہندوستان میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کا یہ پرتو دیہات میں نہیں پہنچا۔ اس پرسکون فضا میں ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ وہاں ہندو اور مسلمان پوری صلح اور آشتی سے اپنی زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں۔ اور ان کی تمام روایات باہمی محبت اور رواداری کی آئینہ دار ہیں۔ اسی امن پسندی اور برادرانہ برتاؤ کا نقشہ آپ کو پریم چند کے افسانوں میں جگہ جگہ پر بکھرا ہوا ملیگا۔ جہاں ہندو مسلمان کج نہاد سرمایہ دار یا ظالم زمیندار کے مقابلے میں دو علیحدہ علیحدہ قومیں نہیں۔ بلکہ ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ شہروں میں آئے دن جو فرقہ دارانہ سانحات رونما ہوتے رہتے ہیں ان کی جو گھناؤنی تصویر "پردہ مجاز" میں ملتی ہے۔ وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ یقیناً کوئی شخص اسے اس سے بہتر پیرائے میں بیان کر کے اس سے عمدہ نتائج مرتب نہ کر سکتا تھا۔ پریم چند نے جو کچھ لکھا ہے۔ ان کی مختصر ترین کہانی سے لے کر ان کے طویل ترین ناول تک سب میں واقعات کا ایک ایسا سلسلہ ملتا ہے جس سے آخر میں کچھ خاص طرح کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ایسے انسان نہیں جن کی عشق سے ابتدا ہوتی ہے۔ ہجران نصیبی پر سارے قصے کی بنا اور وصل پر ناول کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور ناول نویس اس اخلاقی تعلیم کا جس کیلئے یہ سب کچھ لکھا گیا ہے۔ کہیں بھی ذکر نہیں کرتا۔ اور نہ ناول کے پڑھنے کے بعد آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ناولسٹ نے آپ کو کوئی خاص فلسفہ کوئی مخصوص نظریہ سمجھا دیا ہے مگر پریم چند نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ایک خاص غرض ایک مخصوص غایت کے نتیجے میں ہے۔ "بازار حسن" میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مصنف قارئین کے سامنے سماج کا ایک نہایت تاریک رخ پیش کرتا ہے۔ اور ملک کے عصمت فروشی کے اڈوں کی لعنت کے استیصال کے لئے قلم اٹھاتا ہے۔ "گوشہ عافیت" میں غلام اور آقا۔ کسان اور زمیندار میں جو غیر فطری امتیاز ہے اس مکروہ واقعہ کی تذلیل کرتا ہے۔ "یزدگار ہستی" میں دکھلاتا ہے کہ دیہات کے تباہ ہونے سے مجلسی زندگی کی تباہی اور بے راہ روی کا اثر کس طرح محیط ہوتا ہے سرمایہ دار کے گھناونے مقاصد کے سامنے انسانیت کس طرح بے دست و پا ثابت ہوتی ہے۔ "غبن" وہ دکھاتا ہے کہ بعض اوقات ہماری ذرا سی بے احتیاطی ہمارے لئے کتنے بُرے نتائج پیدا کرتی ہے "میدان عمل" میں وہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح صبر اور استقلال کے سامنے استبداد اور جبر کو بالآخر شکست ہوتی ہے۔ غرضیکہ پریم چند شروع سے آخر تک ایک ماہر اتالیق کی طرح چپکے چپکے آپ کے دل اور دماغ پر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ آپ کو اپنا ہمنوا کر لیتا ہے۔ اور آپ کے پاس اختلاف رائے کا موقعہ نہیں چھوڑتا۔

پریم چند کی عالمگیر کامیابی کا راز اس کی سیرت نگاری ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں عام مصنفین ہمیشہ ناکام رہ جاتے ہیں یا اس لئے کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ کہ کسی شخصیت پر ماحول کا کیا اثر پڑتا ہے۔ روز بروز کے چھوٹے چھوٹے واقعات کیونکر خیالات کو بدل دیتے ہیں۔ یا ان میں استواری پیدا کر دیتے ہیں۔ آپس کی چپقلش، ملک و قوم کی تمدنی و معاشرتی حالت مذہبیت کا جوش اقتصادی کیفیت سیرت کے نمو پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں نیک چلنی سے بدمعاشی رند منش سے فرشتہ سیرت۔ جنگجو سے صلح پسند۔ اور وطن پرست سے ملک فروش ہونا سب کچھ انسان کے لئے ممکن ہے۔ لیکن واقعات و ماحول تربیت و تعلیم سوسائٹی اور معاشرہ کی تبدیلیاں ان کا باعث ہوتی ہیں۔ ان کا اظہار ان کا بتدریج اثر دکھانا ضروری ہے۔ پھر یہ اصول

دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر ایک طینت جدا۔ طبیعت علیحدہ۔
مزاج الگ ان تمام امور کا خیال لازمی اور ضروری ہے۔ ایک ہی طرح کے
واقعات دو مختلف شخصیتوں کو پیش آئیں تو یقیناً ان کے نتائج ان کے افعال
کردار اور ان کے خیالات بھی جداگانہ ہوں گے۔ لیکن ہمارے اردو ناولوں
میں ---- کردار ایک ہی قطع ایک ہی نمونے اور ایک ہی قسم کے ہوتے
ہیں۔ اور افسانہ کے تمام افراد کا کریکٹر حتمی ہوتا ہے۔ یا تو وہ فرشتہ ہے۔ یا
شیطان۔" مگر پریم چند کا کلیہ یہ ہے۔ کہ انسانی فطرت نہ بالکل سیاہ
ہوتی ہے نہ بالکل سفید اس میں دونوں رنگوں کا ایک عجیب اتصال
و امتزاج ہوتا ہے۔ اگر حالاتِ گرد و پیش موافق ہوں۔ تو وہ ٹھیک رہتا
اور ناموافق ہونے تو برا ہو جاتا ہے۔ انسان حالاتِ موجودہ کا محض ایک
کھلونا ہے۔ جو اس کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ گو کہ ان ہستی میرت دا
سند رکھا اور گوتمہ کا فسہ [illegible] حالما
پہلی نظر میں آپ ان دونوں کو نہایت اچھا آدمی سمجھتے ہیں۔ مگر جوں جوں
افسانہ بڑھتا ہے۔ اور حالات بدلتے جاتے ہیں۔ ان کی سیرتیں منقلب
ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا اولین اور آخری رنگ ایک دوسرے
سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پریم چند کے تمام افراد مکمل
ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے کا ہر فرد اسی مادی دنیا کا باشندہ ہے۔
جنت کا فرشتہ یا دوزخ کا شیطان نہیں۔ ہر کردار میں چند خوبیاں بھی
ہیں۔ اور کمزوریاں بھی کسی میں خوبیاں زیادہ ہیں کسی میں خامیاں مگر
وہ نری خوبی یا محض بدی کا ہی مجموعہ نہیں پریم چند کے متعلق یہ چیز یقیناً
باعثِ حیرت ہے کہ انہوں نے اخلاقِ انسانی کی صحت سے زیادہ اس کی
بیماریوں کی طرف توجہ کی ہے۔ اور ان کی نگاہ کا رجحان انسانی ہستی کی طرف
ہے۔ بلندی کی طرف ہی بلند پروازی ہیں یعنی انہیں پڑھ کر ہم اس
پستی سے زیادہ واقف ہو جاتے ہیں۔ جس میں نادانی اور قسمت کی خرابی
انسان کو گرفتار کر سکتی ہے۔ یہ پستی اس بلندی کے حسن پر اس کی
فطرت کی پوشیدہ قوتیں سے پہنچا سکتی ہیں۔ مگر پریم چند جن مفلس
مصیبت زدہ اور بدچلن انسانوں کا ہم سے تعارف کرتے ہیں۔ ان
کی طبیعت سفر بت اور دس کی طرح کمزوریوں کی زنجیروں میں اس

بری طرح جکڑی ہوئی ہے۔ کہ ان کے ماحول میں راہِ راست پر چلنے کی
ترغیب دلانے والی اثرات کام نہیں کرتے لیکن انسانیت کی اس
عبرت انگیز بربادی میں بھی ایک روشنی کبھی کبھی نظر آ جاتی ہے۔ جس پر اگر
ہم اپنی نظر قائم رکھ سکیں۔ تو پریم چند کے تمام ویرانے آباد معلوم ہونے لگتے
ہیں۔ اس کی بیماریوں میں صحت کے وہ تمام آثار مردوں میں زندگی کے
وہ تمام علامات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ جو ہم کو یقین دلا دیتی ہیں کہ انسانیت
کا شعلہ کمزور پڑ سکتا ہے۔ مگر اس کی چنگاری کبھی بجھ نہیں سکتی۔ پریم چند نے
انسانیت کا جو جوہر دریافت کیا ہے۔ وہ انسانی ہمدردی ہے۔ اور اس کی
مدد سے وہ بدلی کی تاریکی کو روشنی میں تبدیل کر کے دکھا دیتا ہے۔ پریم چند
انسان کی فطرت کے متعلق بہت بلند رائے رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ
فطری بلندی انسان سے بآسانی زائل نہیں ہوتی۔ اس کی سیرت منقلب
ہو کر بھی اپنی سلامتی نہیں کھوتی۔ پریم چند کے ناول اپنے نتائج کے لحاظ
سے عبرت اور تعلیم کا ذریعہ ہیں۔ مگر صرف ایسی عبرت کا نہیں جو ہمارے سامنے
دوسروں کی حماقتیں ایک یقینی تنبیہ کی شکل میں کرتی ہے۔ بلکہ اس عبرت کا
جو ہمارے دلوں کو انسانی ہمدردی کی جولانگاہ محبت اور ایثار کا سرچشمہ بنانے
کا حوصلہ دلاتی ہے۔ جس سے زیست میں وسعت دل میں درد۔ اخلاق
میں نفاست اور ہمدردی پیدا ہو گو پریم چند کے یہ اصول پہلی نظر میں مبالغہ
یا ان فراموشی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم زیادہ غور کریں۔ تو ہمیں یقین
ہو جائیگا۔ کہ کوئی دیدہ دانستہ خیال آرائی نہیں ہے۔ نہ ایسی جدت پسندی
جو حدت اس حد تجاوز کر گئی ہے۔ کہ مضحکہ یا ناگوار ہو جائے۔ مثلاً پریم چند
کا خیال ہے کہ اپنے تعلیمی اور مادی اثرات کی وجہ سے انسان کے لئے غصہ
اور حسد کذب و دغا جیل و فریب بھی ضروری ہیں۔ وہ ضبط نفس کا قائل
نہیں۔ ضبط اور احتیاط خلقی نشوونما میں مانع ہیں وہی پودا تناور درخت
ہو سکتا ہے۔ جو صبا اور سموم مینہ اور اولے خشکی اور تری میں یکساں کھڑا
رہے اس کے لئے سموم اتنی ہی ضروری ہے جتنی صبا خشکی اتنی ہی
ضروری ہے جتنی تری۔ اسی طرح تکمیل نفس کے لئے بھی زندگی تجربات
لازمی ہے یہاں تک کہ کذب و دغا میں بھی بیش بہا تعلیمی اثرات پوشیدہ
ہیں۔ چنانچہ مختلف تجربات سے سیرت کے مختلف پہلوؤں کی تربیت و

تکمیل ہوتی ہے۔ درحقیقت پریم چند کو اپنے تجربے کے دوران جو ناگوار تیں دریافت ہوئیں ہیں ان کے اعلان کرنے میں اس نے مطلق تکلف نہیں کیا اور اس نے اس خیال پر بھی وقت ضائع نہیں کیا کہ دنیا کیا کہے گی۔ اور کیا سمجھے گی۔ مثلاً غریبی امیری کے غیر فطری امتیاز کا بہت بڑا دشمن ہونے کے باوجود اور افلاس کو مارِ سیاہ سمجھتے ہوئے بھی پریم چند اسے تکمیل نفس کے لئے تمدن سے کہیں زیادہ ضروری سمجھتا ہے کہ یہ انساں میں ارادہ مضبوط عزم کامل ہمدردی اور دل سوزی پیدا کرتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ایسی ہی ناگوار باتوں کو معلوم کرکے ہم اپنی فطرت کی اندرونی کیفیات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اور کریکٹر اخلاق اور اعمال کے پیچیدہ معمے بہت آسانی سے حل کر سکتے ہیں۔ پریم چند کے تجربات نہایت تلخ ہیں۔ اس کا فلسفہ زندگی اور فلسفۂ کائنات نہ صرف بہت معین اور بہت باثر ہے بلکہ بہت نرالا بھی مثلاً اس کا تجربہ ہے کہ اس کارزار ہستی میں مذہب اور اخلاق ہی پر ہر چیز کا انحصار نہیں یہاں مکروفریب اور دغا بہت جائز ہیں بشرطیکہ ان سے مطلب پورا ہوتا ہے۔ یہاں کام کے جا و بے جا ہونے کا فیصلہ کامیابی کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ اگر جیت گئے تو سارے دھوکے اور مغالطے مساعدت کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ہمارے کام کی تعریف ہوتی ہے۔ اگر ہار گئے تو انہیں گناہ کہا جاتا ہے غرضیکہ انہیں تجربات کی روشنی میں وہ اپنے افسانے کے کردار آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور آپ ان میں زندگی کے متحرک آثار کا جلوہ دیکھتے ہیں۔

دراصل پریم چند نے یہ تمام کتابیں ہندوستانی کسانوں کے دکھ درد سے بیقرار ہو کر ان کے غموں ان کی تمناؤں اور ان کی امیدوں کی داستان کے طور پر لکھی ہیں۔ گوشہ عافیت میں حسن و عشق کی ایک نہایت دلپذیر داستان ہے۔ جو گاؤں کے رئیس اور اس کی اسامی سے تعلق رکھتی ہے اس میں افعال و واقعات کو سمجھانے کے لئے ان کے اسباب و علل سے جس طرح بحث کی ہے وہ پریم چند کے علم النفس کے ماہر ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن پریم چند کا کمال یہاں نہیں۔ اس کے فن کی تکمیل وہاں ہوتی ہے۔ جہاں وہ ان کسانی میں سکھو۔ بلراج۔ مکھرن۔ بھگتا۔ منوہر۔ قادر میاں غوث خاں۔ ربیع کی فصل بیگار کے جھگڑوں اور عدالتی کارروائیوں کا دلسوز قصہ بیان کرتا ہے۔ دراصل پریم چند کی طبیعت کا جوہر دیہات کے تذکرے ہی میں کھلتا ہے۔ گوشۂ عافیت کے حاجی پور میں چلے جائیے یا چوگان ہستی کے پانڈے پور میں آپ کو وہاں کی سادہ اور پاکیزہ جھونپڑیوں کی بے سروسامانی میں ایک روحانی اطمینان اور ایک سرمدی سکون میسر آجائیگا۔ یہاں کے مظلوم اور بےکس رہنے والوں کے معصوم چہروں پر ان کے مصائب کے مقابل میں مسرت کا ایک روح پرور تبسم کھیلتا ہوا دکھائی دیگا۔ یہی پریم چند کے ارمانوں کی دنیا ہے جسے وہ کارخانوں اور ملوں کے مہلک دھوئیں میں مستور ہونے نہیں دے سکتا۔ جس کا تحفظ وہ انسانیت اور انسانی اخوت کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

پریم چند کی نظروں میں کسان اور مزدور بہت بڑی عزت کے مالک ہیں چنانچہ اس کے نزدیک ہمیں غریبوں کے اس طبقہ کو قابل نفرت سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہم جو شب و روز رشوتیں لیتے ہیں سود کھاتے ہیں۔ غریبوں کا خون چوستے ہیں بیکسوں کا گلا کاٹتے ہیں ہرگز اس قابل نہیں کہ جمہور کے کسی حصے کو حقیر سمجھیں۔ سب سے ذلیل تو ہم ہیں۔ سب سے بڑے گنہگار اور بدکار تو ہم ہیں جو اپنے تئیں مہذب ممتاز منور اور مرفع سمجھتے ہیں مگر کسی کے کام نہیں آسکتے۔ اسی طرح ہم میں سے کسی کو دوسرے کو غلام کہنے کا بھی حق نہیں۔ اندھوں کی بستی میں کون کسی کو اندھا کہیگا۔ ہم سب کے سب امیر ہوں یا غریب اچھے ہوں یا حقیر غلام ہیں ہم اگر جاہل مفلس گنوار ہیں۔ تو کم درجے کے غلام ہیں ہم اپنے رام کا نام لیتے ہیں۔ اپنی گائے پوجتے ہیں اپنی گنگا میں اشنان کرتے ہیں۔ اپنی بولی بولتے ہیں اپنی دھوتی باندھتے ہیں اور اگر ہم تعلیم یافتہ صاحب ثروت اور بیدار مغز ہیں۔ تو بہت بڑے غلام ہیں۔ ملوں کے پہنے ہیں۔ بدیسی زبان بولتے ہیں کتے پالتے ہیں ٹب میں نہاتے ہیں اور اپنے بھائیوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ غلامی صرف روح سے تعلق رکھتی ہے موٹر بنگلے پولو اور پیانو یہ سب لوہے کی بیڑیاں ہیں جس نے ان کو نہیں پہنا وہی سچی آزادی کا لطف حاصل کر رہے ہیں۔ اپنی قومی لباس اور قومی معاشرت کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہم جو مہذب اور روشن خیال بنتے ہیں۔ لوہے کی بیڑیاں پہن کر اپنی روحانی آزادی کو ہاتھ سے کھو کر کسانوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ انہیں قابل رحم خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم خود قابل رحم

ایک ایکٹ کا ڈراما

از جناب صاحبزادہ محمد عمر صاحب بی۔ اے۔ جموں

ارکان

۱۔ راجہ وودر دیو .... ریاست درگانہ کا راجہ

۲۔ یجر دیو .... سیناپتی

۳۔ سکیت سنگھ .... ریاست شتاس کا راجکمار درگانہ کا اسیر جنگ

۴۔ سرماں ... ایک سپاہی

ریاست درگانہ کی راجدھانی میں ایک عالیشان محل جو تمام ساز و سامانِ آسائش سے مزین ہے اس میں شتاس کا راجکمار قید ہے۔ اور اس وقت درگانہ کے سیناپتی سے سرگرم تکلم ہے۔

راجکمار سکیت سنگھ۔ یہ مکان ہے یا رنگ محل؟ اس قدر ساز و سامان! ناداں یہ بھی نہیں جانتے کہ قیدی کو مہمان خانہ میں نہیں رکھا کرتے (دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز) کون ہے۔ آجاؤ قیدی کے پاس آنے میں تکلیف کیا؟ (دروازہ کھلنے کی آواز) آپ کس طرح

یجر دیو۔ آپ کا دل بہلانے راجکمار!

سکیت۔ قیدی کا دل اکیلے ہی خوب بہلتا ہے۔

یجر دیو۔ مجھے مہاراج نے بھیجا ہے۔

سکیت۔ سمجھا! مہاراج جسے چاہیں جب چاہیں اپنے قیدی کے پاس بھیج سکتے ہیں۔ مگر یہ کیا دل لگی ہے کہ آپ سپاہی کو سپاہی نہیں سمجھتے۔

یجر۔ کوئی دکھ پہنچا سرکار۔

سکیت۔ نہیں پہنچا۔ اس کا دکھ ہے۔ سپاہی اور قیدی کو دکھ ہی میں سکھ ملتا ہے۔ اس مکان کو دیکھئے۔ ساز و سامان کی بہار سے کسی کی دُلہن بن رہا ہے۔ آپ ہی کہئے یہ سپاہی یا قیدی کے رہنے کی جگہ ہے!

یجر - آپ یہ چاہتے ہیں راجکمار کہ درگاہ کا سیناپتی پاگل ہو جائے اور لڑائی کے قابل نہ رہے - جاؤ جی میں کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں -

سکیت - مگر اب تو بڑی سیدھی سادھی باتیں ہوں گی -

یجر - ہاں یہ بات ہے - تو کہو میں سنوں گا - یہ جو پھر وہی الٹی سیدھی باتیں شروع کیں تو اٹھ کر چلا جاؤں گا - بس لڑے لڑائی کے ذکر ہیں - ہم ایسی باتیں سننے کے ذکر میں راجکمار دو

سکیت - میں صرف یہ بتاؤں گا - رن میں کس طرح پکڑا گیا

یجر - یہ ہوئی نا بھلے آدمیوں کی باتیں سناؤ - صبح تک سنتے چلا جاؤں گا -

سکیت - بات یوں ہوئی سیناپتی جی! سات سورج چڑھے اور اترے سات چاند نکلے اور ڈوبے

یجر - پھر آ گئے نا انہیں باتوں پر - کہو ہیں کہ سات دن ہوئے -

سکیت - ہاں تو سات دن تیرے بابو جی سے کہا کیا کہ مجھے رن دیکھنے کی آگیا دیں -

یجر - اور انہوں نے نہ دی - نہ دیتے تو اچھا تھا بھائی - ہم یہاں آنے نہ پاسر کھاتے -

سکیت - بس ہوں ہاں کرتے رہے -

یجر - ٹالتے رہے بچارے مگر کب تک -

سکیت - آخر بالک ہٹ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے -

یجر - اس طرح کی باتیں کی ہوں گی - بیچارہ گھبرا گیا میں تو گھڑی بھر میں حق بول گیا -

سکیت - اور کیسے لگے اچھا جو تمہاری اچھیا -

یجر - مجبور ہو گئے جی مجبور -

سکیت - ان کے زخمی ہاتھوں نے میری بلائیں لیں - گلے لگانے کے لئے اٹھنا چاہتے تھے - مگر وید راج نے نہ مانا -

یجر - اچھا تو بیمار ہیں - اسی لئے رن بھومی میں درشن نہ ہوئے ن سمجھا اس کارن نہ آئے کہ ہمارے لئے بیٹا ہی کافی ہے - جب جاؤ تو میری طرف سے بہت بہت پوچھنا - بھولنا نہیں -

سکیت - میں نے رات آنکھوں میں کاٹی اور تاروں کی چھاؤں میں آپ کے سامنے آ گیا -

یجر دیو - اتنا شوق تھا لڑائی کا -

سکیت - مگر آپ نے یہ شوق پورا ہونے دیا - اور پکڑ کر یہاں لے آئے -

یجر دیو - نہیں اور رام جانے ماری کیا گت ہو -

سکیت - موت مانگتا تھا - دیوتاؤں سے [illegible] مانگا - انہوں نے [illegible] دیا

یجر دیو - ان دیوتاؤں [illegible] تو [illegible] نہیں [illegible] آیا - [illegible] راجکمار!

سکیت - رو لے دیجئے جی بھر کر رو لے دیجئے نفرت کے قابل ہوں مگر لیجئے آپ کے اختیاری بات مگر نہ کیجئے -

یجر دیو - بس بیٹا - بس بیٹا - بس بیٹا -

سکیت - آپ نے منہ پھیر لیا - منہ لگانے کے قابل نہ رہا بے نام -

یجر دیو - اس سے زیادہ سہار نہیں راجکمار! سر کاٹ سکتا ہوں کٹا سکتا ہوں - لیکن دکھی کی پکار نہیں سہار سکتا -

سکیت - [illegible] دیتے ہیں - آپ کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں - آپ کی آنکھیں آپ سے زیادہ تابع ہیں [illegible] لیا ہوتا - روتا کیوں ہوں

یجر دیو - ہاں بیٹا بتاؤ -

سکیت - جو [illegible] نہ رونا - آزادی کو نہیں روتا - سکھ کو نہیں روتا -

یجر دیو - پھر روتے کیوں ہو؟

سکیت۔ پتاجی کو نہیں روتا پتاجی کے لئے روتا ہوں۔ وہ کیا کریں گے۔

بجر دیو۔ بس اتنی بات ہو تی میری آنکھوں کو بہکا دیا گیا۔

سکیت۔ تو یہ کچھ بات ہی نہیں؟

بجر دیو۔ کچھ بھی نہیں۔ سنو کیا ہوگا۔ دو چار دن میں ہم تمہیں پتاجی کے پاس لے جائیں گے۔ وہ پیار کر کے گلے لگائیں گے۔ دان دیں گے۔ ہم بھوجن کریں گے اور اپنے گھر جائیں گے۔

سکیت۔ آپ مجھے لے جائیں گے اور دنڈ کے نام پر میری قیمت مانگیں گے۔ پتاجی منہ مانگا مول دینے کو تیار ہو جائیں گے آپ اس مانگیں گے۔ کہ ہمارا راج کنگال ہو جائے تاکہ اس طرح میں وہ کام کروں گا جو آپ سے کبھی نہ ہو سکے پر جا ایسے راجکمار کو کیا کرے گی۔ جو اس کا زخم یا یہ گھاؤ ہے سینا پتی جی جو آپ کے دید کو نظر نہ آیا اور اب علاج کے لئے آپ کے سامنے ہے۔

بجر دیو۔ پھر پھرا کر آخر مجھے اُسی گورکھ دھندے پر لے آئے نا راجکمار! بات ایسی نہیں بگڑی جو جوانی تمہیں ابھار ابھار کر دکھاتی ہے۔ وہ دیکھو مہاراج آرہے ہیں۔ ایسے گھاؤ کا مرہم ان کے پاس ہے۔

راجہ دوردیو آتا ہے آمد کا نشان شہنائی وغیرہ کا بجنا،

راجہ۔ راجکمار۔ راجوں کی لڑائیاں۔ راج نیتی کے چمتکار ہوتی ہیں تیرے میرے کا جھگڑا نہیں ہوتا۔ تمہیں دیکھ کر تمہارے باپ کی یاد آتی ہے۔

سکیت۔ سچ ہے مہاراج! راج نیتی کی بجلی کے آڑے جو آیا جل کر راکھ ہو گیا۔ اس کے سامنے بچاری دوستی کی کیا بساط ہے۔ یہ دوستی کی باتیں جوانی کے خواب ہیں مہاراج! انہیں اب بھول جائیے۔ مجھے بہلانے کی کوشش نہ کیجئے اور صاف بتائیے میری تقدیر میں کیا ہے۔ راجپوت نڈر ہو کر سکتا ہے تو بغیر کانپنے کے سُن بھی سکتا ہے مہاراج

بجر دیو۔ مہاراج تباڑ الیئے۔

سکیت۔ جوانی انتظار نہیں کر سکتی مہاراج ترت دان مہا کلیان کے گیت گاتی ہے میرا ڈنڈ کس قدر ذلت اُٹھانے سے ادا ہو سکتا ہے۔ بتا دیجئے اور کس قدر زمین آپ کے راج کا پیٹ بھر سکتی ہے۔ بڈھے باپ کو اکلوتے بیٹے کے لئے کس قدر شرمندہ ہونا پڑے گا۔ صرف لفظوں میں کہہ ڈالئے مہاراج۔

راجہ۔ ہو سکتا ہے۔ کہ میرے بیٹے نے بھی راجہ شتاش سے ایسی ہی باتیں کی ہوں!

بجر دیو۔ ہو سکتا ہے۔ ضرور ہو سکتا ہے۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔

سکیت۔ کیا ہو سکتا ہے۔ میں نہیں سمجھا مہاراج۔

بجر دیو۔ میرا ہی سر پھرا تا تھا۔ دیکھا مہاراج نے تمہیں بھی چکرا دیا۔ راجکمار۔

راجہ۔ زندگی اور لاج کی رسی دیوتاؤں کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جانتے ہیں۔ یہ دیوتاؤں کا بھید ہے۔ جسے کوئی نہیں پا سکتا دیوتا کیوں اور کیا کے معنے نہیں سمجھتے۔ جب وہ نہیں سمجھتے تو اُن کی لیلا کو کون سمجھ سکتا ہے۔

راجہ۔ راجکمار دیکھو دیوتاؤں نے کیا کیا۔ ایک طرف تو انہوں نے تمہیں ہمارے ہاتھ میں دیدیا ہم پھولے نہ سمائے اور تمہیں فتح کی چابی سمجھے۔

بجر دیو۔ ان کا کھیل ہے۔ اور سنسار پس جاتا ہے مہاراج۔

راجہ۔ جب ہم سنتے تھے۔ دیوتا مسکراتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں ہم کو کیا سمجھ رہے ہیں۔

بجر دیو۔ کسی کا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے اور انہیں ہنسی سوجھتی ہے۔ مہاراج۔

راجہ۔ اب ستائش اور درگانہ ایک سطح پر کھڑے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔

سکیت۔ آپ کیا بتانا چاہتے ہیں مہاراج

راجہ۔ کیا بتانا چاہتا ہوں۔ یہی کہ تمہاری طرح میرا بیٹا بھی تمہارے باپ کے پاس ہے۔

سکیت۔ آپ کا بیٹا میرے باپ کی قید میں؟ کب؟ کیوں؟ کس طرح؟ کہاں پکڑا گیا بلراج بیر!

راجہ۔ دیوتاؤں کی اچھیا اور کیا کہوں۔ جنہوں نے ہم دونوں فریقوں میں لڑائی ایک جیسی بانٹ دی۔

بجر دیو۔ یوں ہوا سنئے۔ میں بتاتا ہوں راجکمار! بلراج اس دستے کی کمان کر رہے تھے۔ آپ نے حملہ کر دیا۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا ادھر آپ اُدھر بلراج دونوں پکڑے گئے اب دونوں راج ایک دوسرے کا مُنہ دیکھ رہے ہیں۔ کہ کیا کہیں اور کون ہے۔

سکیت۔ اب تو کسی کو شکایت نہ ہونا چاہئے۔ سمجھے سیناپتی جی۔ پردہ ہی پردہ میں دیوتا کیا کر گئے۔

بجر دیو۔ یہی کہ اب صلح کر لو۔ اور پھر لڑلو۔

سکیت۔ نہیں دیوتا یہ کہتے ہیں۔ کہ لڑائی ایک جوا ہے۔ اس میں جیتا بھی ہارا اور ہارا بھی ہارا۔ جیت ان کی ہے۔ جو اس آگ میں نہیں کودتے۔ بچ کر نکل جاتے ہیں۔

راجہ۔ دیوتا یہ چاہتے ہیں۔ تو ایسا ہی ہوگا۔ ہم بیٹے تبدیل کر کے لڑائی ختم کر دیں گے۔ نہ کچھ لینا نہ کچھ دینا۔ جوانی کی بچھڑی ہوئی دوستی بڑھاپے میں گلے مل جائے تو بھی سمجھئے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آ گیا۔ کیوں بجر دیو!

بجر دیو۔ جی ہاں اور کیا۔

. . . . . .

راجہ۔ راجکمار میرا ایلچی تمہارے باپ کے پاس صلح کا پیغام لیکر جا رہا ہے۔ چاہتا ہوں تم بھی اپنے بھروسہ کا کوئی آدمی اس کے ساتھ کر دو۔ اس طرح شک کی گنجائش نہ رہے گی۔

سکیت۔ تو آپ کے قیدیوں میں ایک سپاہی سرمان نام ہے اسے میرے پاس بھیج دیجئے۔

راجہ۔ ٹھیک ہے۔ چلو بجر چلیں۔ اور اس سپاہی کو بھیجدیں۔

(بجر دیو اور دوردیو جاتے ہیں)

سین دوم

وہی سابقہ سین کا محل سکیت عالم تنہائی میں اپنے دل سے کہہ رہا ہے۔

سکیت۔ کوئی نہیں جانتا۔ کوئی نہیں بتا سکتا۔ صرف میں جانتا ہوں۔ صرف میں بتا سکتا ہوں۔ کہ میرے درد کی دوا کیا ہے بیشک بیشک کڑوی ہے۔ مگر مجھے اسے پینا ہوگا۔ راج تب ہی بچ سکتا ہے۔ جب کہ میری جوانی یہ کڑوا گھونٹ گوارا کرے بلراج کی گرفتاری ہمارے راج کی فتح کا نشان تھا مگر میری گرفتاری نے میرے دیش کے پاؤں میں پھر سے زنجیریں ڈال دیں۔ بلراج کے ڈنڈ میں راجہ درگا نہ اپنی جان تک دے دیتا۔ مگر اب مجھے واپس دے کر وہ بلراج کو لے لیگا کتنا مہنگا سودا ہے۔ مگر پتا جی نہ مان جائیں گے۔ اگر میں قید سے نکل جاؤں۔ تو بتا دے کا قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ماتر بھومی کی سیوا میں جان دینا دھرم ہے۔ پتا جی کی پت کے لئے پران دے دینا ہی دائمی زندگی ہے۔

سرمان آتا ہے۔

کون سرمان، تم آ جاؤ۔

سرمان۔ داس حاضر ہے سرکار۔

سکیت۔ شرمار ہے ہو۔ مجھے دیکھ کر یا اپنے آپ پر۔

سرمان۔ دونوں پر راجکمار!

سکیت۔ سچ ہے۔ ہم دونوں قیدی ہیں۔ اور دیش کے ماتھے کا کلنک تم نے میرا قصہ سُنا

سرمان۔ بڑے دکھ کے ساتھ۔ سُن کر رویا۔ ہنسا بگڑا نہیں یاد کیا کیا کیا نہ کیا۔

سکیت۔ مہاراج میرے ساتھ ہی۔

سرمان۔ یہ سُن کر میں ہنسا نا چار کہ دادا دیوتاؤں کو دوسے ڈنڈوت کی۔

سکیت۔ سرمان تم راجہ کے ایلچی کے ساتھ ستاش جا رہے ہو۔

سرمان۔ آپ یہاں رہیں۔ اور میں ستاش اکیلا جاؤں! نہیں سرکار مجھ میں اتنا بل نہیں۔ جدھر سے نکل جاؤں گا۔ انگلیاں اُٹھیں گی اور لوگ کہیں گے۔ وُہ سرمان مہا بیر جا رہے ہیں۔ جو راج کمار کی قید کے صدمہ میں آزاد ہوئے سرکار! دال روٹی مل رہی ہے۔ کہیں پڑا رہنے دیجئے۔ اس طرح جانے سے نہ جانا اچھا ہے۔

سکیت۔ تم بھاگ نہیں رہے۔ سرمان! کام جا رہے ہو۔ یاد رکھو۔ ابھی دیوتاؤں نے راجپوتوں کو بھاگنا نہیں سکھایا۔ ہاں کہو تپامی سے کیا کہو گے۔

سرمان۔ یہی جو دیکھا ہے۔ راجکمار اچھے ہیں گھاؤ۔ اور۔ ۔ ۔ ۔

سکیت۔ گھاؤ بھر گیا اور۔

سرمان۔ جو آپ کہیں کہہ دوں گا۔

سکیت۔ وہی کچھ کہا جو قیدی بیٹے سے باپ سُننا چاہتا ہے۔ سماپ کر دینے کی معافی مانگنا اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سرمان۔ یہ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ چھتری کی زبان برہمن سے بہتر بھی بات کہہ سکتی ہے۔ اب آگیا دیجئے۔

سکیت۔ ٹھہرو۔ دھمکانہ انداز سے۔

سرمان۔ تو سپاہی کی زبان بند ہو گئی اور اب راجکمار بولنے لگا۔

سکیت۔ صرف بیٹے کا سندیسہ لے کر بھاگ پڑے۔ یہ بھی سن لو۔ راجکمار کیا کہتا ہے۔ بیٹے نے وہ کہا جو اُس کے دل میں تڑپ رہا ہے۔ راجکمار کو وہ کہنا ہے۔ جو اُس کے دماغ میں گھوم رہا ہے۔ بیٹا ہوا میں اُڑ کر باپ کے چرنوں میں جانا چاہتا ہے راجکمار بھاری بھرکم پتھر کی طرح اس جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لینا چاہتا۔

سرمان۔ راجکمار نہیں جاتا۔

سکیت۔ اور نہیں جائے گا۔

سرمان۔ نہیں جائے گا۔

سکیت۔ حیران ہوئے جاتے ہو۔ سنتے نہیں۔

سرمان۔ راجکمار! سن رہا ہوں۔ اور حیران ہو رہا ہوں۔ حیران ہو رہا ہوں اور سُن رہا ہوں۔

سکیت۔ سن لو گے تو حیراں ہونے کی ضرورت نہ رہے گی۔

سرمان۔ سننے ہی سے تو اوساں جا رہے ہیں۔ کہئے جو کہنا چاہتے ہیں۔ پر یہ نہ کہئے نہیں جا سکتا۔ نہیں جاؤں گا۔ اور اسی قسم کی باتیں نہ کہئے۔

سکیت۔ اچھا تو۔ لو سنو۔ میں نہیں چاہتا میرا ڈنڈ کل صبح سے پہلے ادا ہو سنا کل صبح سے پہلے۔ کل صبح سے پہلے اس لئے ایلچی کو کل صبح سے پہلے رخصت نہ کیا جائے۔ کل صبح سے پہلے۔ مت بھولو۔ کل صبح سے پہلے۔ سمجھے؟

سرمان۔ نہیں راجکمار! کون سمجھ سکتا ہے اسے

سکیت۔ بہرے ہو گیا۔ اتنی بار کہا اور نہ سمجھا۔

سرمان۔ راجکمار! یہ کب کہا سنا نہیں ہاں سمجھا نہیں۔ سننا اور بات ہے سمجھنا اور۔ کتھا سننے جاتے ہیں۔ تو سنے چلے جاتے ہیں کوئی نہیں پوچھتا کیا سمجھے۔ وہ جانتے ہیں۔ کوئی نہیں سمجھتا۔ طوطا سمجھتا نہیں۔ پر خوب سنتا ہے۔ اور سُن سُن کر یاد کر لیتا ہے۔ جو سُنتا ہے اُس کی طرف سے نچنت رہو۔ سب یاد ہے۔ کل صبح سے پہلے۔ کل صبح سے پہلے۔

سکیت۔ تم کل صبح سے پہلے روک لوگے نا۔

سرمان۔ کیوں نہیں خاطر نشاں کر دوں کا بڑی سرکار کے۔ کل صبح سے پہلے ہمارا راجکماروں کا تبادلہ نہ کیا جائے۔ اور جو کسی نے کہا کیوں۔ تو اُس کا جواب نہ آپنے بتایا نہ میں بتا سکتا ہوں

PG9
KARNAL SHOP

Bride's Shoe
An Ideal Gift for Marriage occasions
ONE BAR BROCADE SHOE - LEATHER LINING
UPPER BENARSI BROCADE - CUBAN HEEL

نہ بتاؤں گا۔ حکم کا بندہ ہوں مجھے کیوں کیا سے کیا۔

سکیت۔ شاباش جاؤ۔ راستہ میں کیوں اور کیا کا جواب بھی کچھ بنا لینا۔

سرمان۔ بنالوں گا سرکار! جھوٹ ہی بولنا ہے۔ تو سورج بچارا کیا۔ بڈھے کا پاپ جوانی کی انگڑائی ہوتا ہے۔ اچھا ہے آ گیا۔ جاؤں۔

سکیت۔ ہاں جاؤ۔

سرمان جاتا ہے

سکیت۔ دھوکا دینا بھی ایک کام ہے۔ کیا کیا جتن کئے تب سپاہی ڈھب پر آیا۔ ہاں وقت قریب آ رہا ہے۔ راجپوت کا جگر کام نہ آیا۔ تو قاتل کا دل مانگ لوں گا۔ جوانی خوں اور مٹی میں ہولی کھیلیگی۔ تو چندھیا جائے گی سورج کی آنکھیں۔ مگر میرے پاس نہ تلوار ہے نہ کٹار جس نے پکڑا تلوار لے گیا۔ چھوڑ جاتا۔ مگر سونے کے قبضہ نے چھوڑنے نہ دیا۔ سونا! جس کی چمک دمک میں پاپ بہتا ہے۔ دھرم اس پر نچھاور۔ ایمان اس پر نثار۔ اس پر ایشور کی بہار جو تجھ پر ہوتا ہے۔ خیر۔

مہاراج آ رہے ہیں اب اُن سے تلوار لوں تو بات ہے

دورد یو۔ راجکمار! ایلچی اور سرمان کے گھوڑے نکل گئے۔ فاصلہ ہی کتنا ہے تین چار کوس بس آیا ہی سمجھو انہیں۔ سجوگ کی گھڑیاں گئیں۔ تھوڑی دیر میں بلراج ہمارے پاس آیا ہی ہوگا۔ نہیں نہیں سب کچھ ہمارے پاس ہوگا۔

سکیت۔ بہت بے چین ہیں مہاراج بیٹے سے ملنے کے لئے باپ کتنا بے قرار ہے۔

دورد یو۔ اپنے باپ سے پوچھنا وہ بتائیں گے۔ یہ کسک کیسی ہوتی ہے۔ برچھی کی انی سمجھ لو کہ کلیجہ میں اترتی چلی جاتی ہے۔

میرے خیمہ میں چلو راجکمار! بڑے بڑے سپاہی تمہارے درشن کے ابھلاشی ہیں۔

سکیت۔ دیکھتے ہوں گے سپاہی قید میں کیا بن جاتا ہے۔ خوب خیال ہے۔ اچھا تماشہ ہے۔ مگر مہاراج میں تماشہ نہیں چاہتا۔ ہاں قیدی ہوں۔ جو گت نچاؤ ناچوں گا۔ سپہ قیدی سے پوچھا نہیں کرتے۔

دورد یو۔ ہم تمہیں قیدی نہیں سمجھتے امانت جانتے ہیں۔

سکیت۔ امانت سے ضمانت اچھا لفظ ہے۔ اور گروی اس سے بھی اچھا۔

دورد یو۔ کیا سمجھ رہے ہو راجکمار!

سکیت۔ یہی مہاراج! کہ پتاجی اور آپ کی جنگ ہو رہی ہے۔ اور پتاجی سچے لڑ رہے ہیں۔ غلط ہو سکتا ہے مگر میں پتاجی کا بیٹا ہوں۔ ان کا ہر حکم میرا دھرم ہے۔ آپ اسے نہیں بدل سکتے دنیا اسے نہیں بدل سکتی۔

دورد یو۔ پہلے تمہارے باپ نے لڑائی کی کرنا پھونکی۔ سینا کے کڑے منڈ پر آ کھڑے ہوئے۔

سکیت۔ ٹھیک ہے۔ مگر آپ نے ان کی تلوار کا وہ ناک میں دم کیا کہ گھبرا کر میان سے باہر نکل آئی۔ یاد ہے اپنا پیام۔ کسی راجپوت کا بیٹا اسے سہار نہیں سکتا۔ خیر صبر کرنے والا مجبور کے خون کا ذمہ وار ہوتا ہے۔ خیر اب سچ اور جھوٹ کی پہچان دیوتاؤں کے ہاتھ ہے۔ ہم کو اُن کے خونی فیصلہ کا انتظار کرنا چاہئے۔

دورد یو۔ انوکھی باتیں کرتے ہو راجکمار۔

سکیت۔ عورت کی ہر ادا انوکھی ہوتی ہے۔ اور آج کل میں بھی عورت بن رہا ہوں۔

دورد یو۔ آج کل کو نہیں رو رہا راجکمار! مجھے تو اس وقت کھٹکا ہے جب تم سنگاسن پر بیٹھو گے۔ پھر تو بلراج کو ذرہ اتار نا مشکل ہو جائے گا۔

سکیت۔ باپ اطمینان رکھے اس کا بیٹا کبھی دکھی نہ ہوگا۔

وددیو - کس طرح

سکیت - پہیلی نہیں۔ گورکھ دھندا نہیں۔ جوانی بول رہی ہے -
بڑھاپے کا رکھ رکھاؤ اسے نہیں آتا۔ جو دل میں ہوتا ہے -
کہہ دیتی ہے سنگاسن ایک بزدل کو بیر بنا سکتا ہے۔ تو وہ
ایک بیر کو بزدل بنانے کی بھی طاقت رکھتا ہے۔ اس لئے
ہو سکتا ہے۔ سنگاسن کا نشہ میری بھجا کا بل نکال دے اور
مجھے تلوار سے زیادہ نرم کھلونوں کی تلاش ہو۔ مجھے پرجا کا خون
راج کی شان سے زیادہ پیارا لگے۔

وددیو - خوب سمجھتا ہوں۔ راج نیتی کو راجکمار ابیر جا کو جاں سے
پیارا رکھنا ہی راج ہے باتیں تو من موہنی ہیں۔ چلو ذرا دربار
کی رنگ رلیاں دیکھو

سکیت - معاف ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ مرجھایا ہوا دل سارے باغ
کو مرجھا دے گا۔ مہاراج

وددیو - بجر دیو جاگو۔ انہیں سمجھاؤ۔

بجر دیو - سمجھ جاؤ۔ بھیا سمجھ جاؤ۔

سکیت - کیا سمجھ جاؤں۔

بجر دیو - جو مہاراج کہتے ہیں۔

سکیت - کیا کہتے ہیں۔

بجر دیو - کچھ تو کہتے ہوں گے۔ جو سمجھنے کو کہتے ہیں۔

سکیت - او۔ آپ کو پتہ نہیں۔

بجر دیو - ہاں جھوٹ کیوں بولوں۔ مجھے پتہ نہیں میں سو گیا تھا آپکی باتیں
نہ سمجھنے سے بچنے کے لئے۔

سکیت - پھر سو جائیے۔ مہاراج سبھائیں کیا منہ لے کر جاؤں۔

وددیو - پر ہوا کیا؟

سکیت - آپ سنیں گے تو ہنس دیں گے۔

وددیو - ہنسی کوئی بری چیز نہیں۔ کب سے منہ لٹکائے رہے ہیں۔
گھڑی پل کے لئے ہنسنا بھی چاہئے۔

سکیت - تو سن لیجئے مہاراج میرے پاس تلوار نہیں۔ بغیر تلوار کے
دیکھیں گے۔ تو سبھا والے یہی سمجھیں گے۔ کہ کوئی عورت مردانہ
بانے میں آئی ہے۔ ہے بھی سچ۔ جس مرد کے پاس تلوار نہ ہو۔
وہ مردانہ لباس میں عورت نہیں تو کیا ہے۔

وددیو - مجھے پہلے ہی دھیان تھا۔ تم نے وقت پر یاد دلائی۔ بجر جاگو
اور لپک کر راجکمار کی تلوار لے آؤ۔

بجر دیو - ہاں سمجھ جاؤ۔ راجکمار۔ جو سرکار کہتے ہیں۔ سمجھ جاؤ۔

(سب ہنستے ہیں)

وددیو - کمبھ کرن کے بھائی راجکمار کی تلوار لاؤ۔

بجر دیو - ابھی لایا سرکار

(بجر دیو جاتا ہے)

سکیت - تو ہمیں بجر دیو کا انتظار کرنا ہوگا۔

وددیو - اور پھر تم سبھا میں چلو گے۔

سکیت - خوشی سے

وددیو - مزا ہو جو ہمارے جانے سے پہلے بلراج آجائے۔ اور اسی
دم تم سوار ہو جاؤ۔

(بجر دیو آتا ہے اور تلوار پیش کرتا ہے)

بجر دیو - میں ساتھ جاؤں گا اس کے۔ یہ لیجئے تلوار۔ سرکار اپنے ہاتھ
سے راجکمار کو دیں۔ سیناپتی تلوار لے سکتا ہے۔ دوسرے نہیں
سکتا۔

سکیت - یہ تو میری نہیں۔

بجر دیو - ہاں یہ آپ کی نہیں۔

وددیو - تلوار راجکمار کی کیا ہوئی وہ کیوں نہیں لائے۔ سو گئے
تھے چلتے چلتے۔

بجر دیو - میں اس سپاہی کے پاس گیا جس کے پاس راجکمار کی تلوار
تھی۔ اسے سرکار کا حکم سنایا۔ تلوار مانگی اس نے کہا سنئے۔
سپاہی نے کہا مجھے کہا۔ میں کون سیناپتی اور سرکار
کے حکم کے جواب میں کہا۔

وددیو - کیا کہا۔

یجر دیو۔ یہ کہا تلوار نہ دوں گا۔ سر حاضر ہے لے جاؤ۔ جیتے جی تلوار نہیں دیئے گا۔ اور بولا مہاراج کو یہ تلوار مجھ سے نہ لینا چاہئے۔ اسی کی سیوا میں استعمال کروں گا۔ گھانس نہیں چھیلوں گا۔ سر مکھ لڑ کر کھڑے کھڑے تلوار چھین لینا ہر کسی کا کام نہیں۔ سو کی ایک سن لو۔ تلوار نہیں دوں گا۔ تمہیں اس کے سونے کی تو نہیں پڑی یہ کہا اور سپاہی نے قبضہ اُتار کر مجھے دے دیا۔ اور بولا "یہ رہا سونا لے جاؤ۔ سپاہی تلوار کا بھوکا ہے سونے کا نہیں۔

دور دیو۔ پھر تم نے کیا کیا۔

یجر دیو۔ کرنا کیا تھا۔ اور لے آیا۔

دور دیو۔ اور سپاہی کا کیا کیا۔

یجر دیو۔ بڑا سچا کہا اور چلا آیا۔

دور دیو۔ سزا نہ دی۔

یجر دیو۔ سزا کس بات کی۔ سچ کہتا تھا۔ سیدھے ہاتھوں سپاہی۔ کب تلوار دیتا ہے۔ جان دیتا ہے۔ تلوار نہیں دیتا سپاہی۔

سکیت۔ تلوار جائے تو سر کا رہنا وبال ہے۔

یجر دیو۔ اور کیا۔ اس سے مر جانا اچھا۔

سکیت۔ ہاں سچ کہتے ہو۔ سینا پتی جی! سپاہی جان پر کھیل گیا پر تلوار نہ دینا تھی نہ دی۔

دور دیو۔ راجکمار! تم کو تلوار پسند ہے۔ نا

سکیت۔ مہاراج! مجھے تو تلوار چاہئے کوئی ہو کیسی ہو۔

دور دیو۔ ہیں راجکمار! تم تو کانپ رہے ہو۔

سکیت۔ تلوار سونت کر بڑے بچوں کے بعد ملی ہے۔ کامنی! میں کانپ نہیں رہا۔ خوشی میرے لہو میں اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔ بچپن کا کھلونا۔ جوانی میں ساتھ دے رہا ہے۔

دور دیو۔ یجر! سپاہی اور بچہ کا کیسا پیارا مجموعہ!

یجر دیو۔ سپاہی بچے اور دلیلوں کا مجموعہ کہئے مہاراج!

سکیت۔ گھونگٹ کھول دیوی۔ بھگت مانگنی اور منہ چھپانا کہاں کی ریت ہے۔ ذرا میان سے باہر آؤ۔ اپنا مکھڑا دکھاؤ۔ ہمارا مُنہ دیکھو۔

یجر دیو۔ راجکمار بڑے کاٹ کی ہے سرکار نے لوہا کاٹا ہے۔ اس سے۔

سکیت۔ لوہا کاٹا ہے۔ دل تو نہیں کاٹا۔ کوئی دل پتھر سے بھی سخت نکل آتا ہے۔ یہ تلوار خوب ہے۔ اور ہلکی کتنی۔ دیکھو۔ میں اسے ہوا میں چکر دے رہا ہوں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہاتھ ہوا میں پھر رہا ہے۔

دور دیو۔ بس کرو راجکمار۔ گھاؤ کھل جائے گا۔

سکیت۔ پھر وہی گھاؤ یاد دلایا۔ میری ندامت کے زخم پر نیا چرکا لگایا۔ ہاں میں گھائل ہوا پکڑا گیا۔ لیکن ایسا پھر نہ ہوگا۔ اب مجھے کوئی زخم نہ لگا سکیگا۔ یہ کوئی نہ پکڑ سکیگا۔ اب تلوار جسکے پاس ہے تو پتا جی! کوئی چنتا نہیں۔ ایک جھنکار آپ کو گھناؤنا ڈھنڈھورا دینے سے بچالے گا۔ نچنت رہیں پتا جی۔ جب میں نہ ہوں گا۔ تو ایسا پھر کیونکر ہو سکتا ہے۔ ایک وار میں قصہ پاک ہوتا ہے۔ میری یقینی موت آپ کی یقینی فتح ہے۔ روکو۔ روکو۔ تمہارا قیدی ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے فضا میں تلوار چلاتا ہے۔

یجر دیو۔ اپنے جوش میں نہ آؤ۔ راجکمار! ذرا دھیمے دھیمے۔

سکیت۔ سینا پتی جی۔ آپ بھی سپاہی ہو۔ آپ بھی دشمن ہو سکتے بھی ہو سکتے ہو۔ موت کا بھکاری ہوں۔ تمہارے پاس ہے۔ میری جھولی میں ڈال دو۔ کٹار میرے سینے میں گھونپ دو۔ قیدی ہوں آزاد کر دو سپاہی جان دے سکتا ہے۔ تلوار نہیں دے سکتا۔ کیوں سینا پتی جی یہی کہا تھا۔ تو گھیر لو۔ چاروں طرف سے گھیر لو۔ مقابلہ کروں گا سنسار بھر کا مقابلہ کروں گا۔ آہ۔ تم مجھے مارنا نہیں چاہتے پکڑنا چاہتے ہو۔ آزاد کرنا نہیں چاہتے۔ قیدی بنانا چاہتے ہو۔ دیکھو دیکھو یہ تلوار سینہ کو یوں چاک کرتی

قیدی کو یوں آزاد کرتی ہے۔ تلوار سے سینہ چاک کر دتیا
ہے۔ ہے رام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہے رام۔
درو دیو۔ بھجر۔ یہ کیا اندھیر۔ مورکھ نے آپ گھات کر لی۔
سکیت۔ دیوتا کی اچھیا۔
درو دیو۔ پھر اسے سہارا دو۔ راج وید کو بلاؤ۔ راجکمار اس کایہ
پرنیام۔
سکیت۔ قید کا پری نام ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرے خون سے میری
جنم بھومی سرخرو ہو گئی۔ قید کی روسیاہی کافور ہو گئی
مہاراج! دیکھئے درگا نہ راجکمار قید ہے۔ اور ستاس
کا آزاد۔ امانت ضمانت گروی اور تبادلہ کا جھگڑا میرے
ساتھ نپٹ گیا۔
درو دیو۔ میں یہ کیا سن رہا ہوں۔
بھجر دیو۔ تمہارے قیدی تھے راجکمار تمہیں اپنی جان پر کوئی اختیار
نہ تھا۔
سکیت۔ جان دینا اجازت نہیں چاہتا بیٹا کاٹنے کا یہ آخری
ہتھیار دیوتا بھی نہیں چھین سکتے۔
بھجر دیو۔ جا گئے مہاراج جا گئے۔ خون کی گود میں سو جائیے۔
مہاراج مہاراج۔
درو دیو۔ کون بلاتا ہے۔
بھجر دیو۔ مہاراج۔

درو دیو۔ چپ رہو۔
بھجر دیو۔ ساکھا ختم ہو گیا مہاراج۔
درو دیو۔ کون کہتا ہے۔ بیٹیا گئے ہو بھجر دیو! راجکمار۔ تم مرتے ہو مگر
لڑائی زندہ ہے۔ سب تمہارے باپ جیسے نہیں۔ میں
تو نہیں۔ راج کے لئے پرجا سر کٹاتی ہے۔ اگر پیا مارا گیا
تو کیا ہوا۔ میرا بیٹا بھی باپ کے لئے مرنا جانتا ہے۔ مرنے
دو۔ وہ بھی اپنا بھرنا آپ بھرے۔ بھجر دیو۔
میری گود کنگال ہو گئی۔ اس میں اپنا بیٹا ڈال دو۔ پرائی آگ
سہی۔ جاڑا تو کٹ جائے گا۔
سکیت۔ سن رہا ہوں۔ آپ کا بیٹا زندہ ہے۔ اور زندہ رہے گا۔
درو دیو۔ میرا بیٹا زندہ ہے۔ بلراج زندہ ہے۔ درگا نہ کا راج کمار
زندہ ہے۔ تو جاؤ مجھے لادو۔ مگر تم تو مر رہے ہو۔ کون جائیگا
کون لائیگا۔ میں بس لاؤں گا۔ راج نیتی لائے گی۔ تمہاری
آتما نہیں لاش لادے گی تمہاری ارتھی تب اٹھیگی جب
بلراج کی سواری آئے گی۔
سکیت۔ لاش کو دھمکاتے ہو مہاراج۔
درو دیو۔ نہیں جانتا کیا کر رہا ہوں۔ کیا کہنا چاہئے۔
سکیت۔ سیناپتی جی رخصت۔ اب سورگ میں ملیں گے مہاراج
آپ کے درشن بھی وہیں ہوں گے (جان دیتا ہے)
بھجر دیو۔ تیاگ دیئے پران! جو کچھ جی آئے کہیں پر ایسے حسین
دشمن کی موت پر آنسو بہانے سے نہیں رک سکتا۔
درو دیو۔ اپنے آنسوؤں کے ساتھ میرے بھی ملاؤ۔ اور یہ شردھا کے
پھول اس جوان لاش پر نچھاور کرو۔
جاؤ اور میرا بیٹا لاؤ۔ منگا دو سارا راج پاٹ
حوالے کر دو۔ مجھے ضرورت نہیں۔ نہ سنگھاسن چاہئے
نہ مکٹ۔ میرا بچہ۔ بس

(محمد عمر)

پرائیویٹ سکرٹری

(از حضرت شوکت تھانوی)

نواب صاحب کو پرائیویٹ سکرٹری کی ضرورت تھی۔ اور ہم اس جگہ کے لئے بیقرار۔ خوبیٔ قسمت سے کمشنر صاحب کا سفارشی خط بھی ہم کو مل گیا۔ بس پھر کیا تھا ہم نے فوراً نواب صاحب کو اپنی آمد کا تار دیا۔ اور دولت آباد روانہ ہو گئے۔ یہ ریاست ریلوے اسٹیشن سے بیس میل کے فاصلے پر تھی۔ اور چوبیس گھنٹہ میں ایک مرتبہ لاری جایا کرتی تھی لہذا ہم اسٹیشن پر اتر کر اسی ارادہ سے باہر نکلے تھے کہ لاری کے اوقات وغیرہ معلوم کریں کہ عین اسٹیشن کے پھاٹک پر ایک چوبدار نے ہم کو فرشی سلام کیا۔ ہم نے بجائے اس کو جواب دینے کے گھوم کر پیچھے دیکھا کہ شاید یہ سلام کسی اور کو ہوا ہو۔ مگر دراصل اس سلام اور اس تعظیم کے مخاطب ہم ہی تھے۔ لہذا ہم نے گردن کی ایک باوقار جنبش سے سلام کا جواب دیا۔ اور پھر فوراً ہی قلی کو اسباب لانے کا اشارہ کیا۔ چوبدار نے دست بستہ عرض کیا۔ کیا حضور دولت آباد تشریف لے جائیں گے۔

ہم نے کہا۔ ہاں تمہاری لاری کیا تیار ہے۔

چوبدار نے کہا۔ جی نہیں میں تو نواب صاحب کا موٹر لے کر حاضر ہوا ہوں۔ لاری ایسے صبح نہیں چھوٹتی۔

ہم نے کہا:۔ نواب صاحب دولت آباد کا موٹر؟ کیا میرا تار پہنچ گیا تھا۔

چوبدار نے ادب سے کہا۔ جی ہاں سرکار جب ہی تو نواب صاحب نے کار بھیجی ہے۔ آپ تشریف لے چلیں۔

ہم کو اور کیا چاہئے تھا۔ فوراً موٹر کے پیچھے اسباب بندھوایا اور نواب صاحب کی قیمتی کار میں نہایت شان کے ساتھ بیٹھ کر دولت آباد روانہ ہو گئے۔ ایسی ملازمت دراصل قسمت والوں کو ملتی ہے۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ اسٹیشن پر اتر کر لاری کا انتظار کریں گے۔ اور اگر لاری دوسرے دن ملے گی۔ تو دن بھر اور پھر رات بھر مسافر خانہ میں غریب الوطنی کے فلسفہ پر غور کر کے کہیں۔ دوسرے دن روانہ ہو سکیں گے۔ پھر بھی کوئی طے شدہ بات نہ تھی۔ کہ نواب صاحب ہم کو ملازم رکھ ہی لیں گے۔ اور بہت ممکن تھا کہ ہم کو فوراً ہی واپس بھی ہونا پڑتا۔ مگر یہاں تو نقشہ ہی کچھ اور تھا اس وقت ہم پرائیویٹ سیکرٹری کی جگہ کے امیدوار تو نہیں البتہ ریاست عالیہ دولت آباد کے ولیعہد معلوم ہو رہے تھے۔ اور اسی شان ریاست کے ساتھ ایک قیمتی کار میں اکڑے ہوئے اس طرح بیٹھے تھے گویا رئیس ابن رئیس ہیں۔ باوردی شوفر اصفہانی پگڑی باندھے ہوئے چوبدار نہایت ادب کے ساتھ اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ اور ہم پھیلے ہوئے سا اکڑے ہوئے آدھے لیٹے ہوئے اور آدھے بیٹھے ہوئے پچھلی نشست پر فروکش تھے۔ اور کار فراٹے بھر رہی تھی راستہ کے لوگ جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ اور چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے مرد عورت بوڑھے بچے دور ہی سے موٹر کی آواز سن کر قطار در قطار کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ ریاست دولت آباد کے جدید پرائیویٹ

سیکرٹری کو خوش آمدید کہیں۔ چنانچہ جب ان کی گردنیں تعظیم کیساتھ خم ہوتی تھیں۔ تو ہم بھی مسکرا مسکرا کر اپنے سر کو ہلاتے تھے۔ اور ان کے اس جذبۂ عقیدت کی ذرا وقار کے ساتھ پذیرائی کرتے تھے یہاں تک کہ چند چھوٹے چھوٹے مواضعات کے بعد ہماری کار ایک آبادی سے گزرتی ہوئی ایک وسیع پھاٹک میں داخل ہوئی۔ پہرہ دار نے فوجی قاعدہ کے ساتھ سلامی دی اور فوراً ہی کار ایک خوبصورت کوٹھی کے صحن میں جا کر ٹھہر گئی۔ چوبدار نے فوراً اُتر کر کار کا دروازہ کھولا اور عین اسی وقت کوٹھی کے برآمدہ میں ایک معمر بزرگ ریشمی گون پہنے ہوئے تشریف لائے اور بڑھ کر ہم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

میاں صرف ہاتھ ملانے سے کام نہیں چلے گا۔ تم کو تو گلے سے بھی لگانا ہے۔ یہ کہتے ہی کہتے ان بزرگ محترم نے ہم کو گلے سے لگا کر ہماری پیٹھ پر دست شفقت پھیرتے ہوئے کہا۔ میری مسرت کی اس وقت کوئی انتہا نہیں ہے۔

غالباً بلکہ یقیناً یہی نواب صاحب بہادر تھے۔ مگر ملاحظہ تو فرمائیے کہ کس قدر عالی ظرف اور شریف النفس انسان یہ بھی تھا۔ اتنا بڑا رئیس اور یہ اخلاق کیا یہ سلوک کوئی بھی رئیس اپنے امیدوار پرائیویٹ سیکرٹری کے ساتھ کر سکتا ہے کم از کم ہم تو اس اخلاق اور اس آؤ بھگت کے خواب میں بھی متوقع نہ تھے۔ یا یہ سب جو کچھ ہو رہا تھا واقعی خواب تھا۔ نواب صاحب نے ہم کو اپنے گول کمرہ میں لے جاتے ہوئے کہا۔ اس قصبہ میں تمہارا دل کیا لگے گا۔

ہم نے نہایت ادب سے کہا:۔ حضور والا کا اخلاق بجائے خود ایک وسیع اور بارونق دنیا ہے۔ جس سے کسی کا دل اُچاٹ نہیں ہو سکتا۔

نواب صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے اور ہم کو ایک صوفہ پر بٹھا کر خود بھی مقابل کے صوفہ پر بیٹھ گئے۔ اس گول کمرہ میں اتنا قیمتی سامان ترتیب سے سجا ہوا تھا۔ کہ اس میں سے بہت سی چیزیں تو ہم نے سنی یا دیکھی بھی نہ تھیں۔ مگر ہم احتیاط کے ساتھ ہر چیز کو دیکھ رہے تھے۔ تاکہ نواب صاحب ہم کو کم ظرف نہ سمجھیں بلکہ زیادہ تر تو ہم نواب صاحب ہی کی طرف نظر رکھتے تھے۔ نواب صاحب اس وقت کچھ سیاسیات پر بحث کر رہے تھے۔ اور ہم بھی جا بجا ہی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے جاتے تھے۔ حالانکہ ان کے سیاسی عقاید سے ہم کو اختلاف تھا مگر ہم یہ جانتے تھے کہ اگر اس اختلاف کو نمایاں کیا تو ہم پرائیویٹ سیکرٹری نہیں رہ سکتے لہٰذا عافیت اسی میں تھی کہ اُسی رنگ میں رنگ جائیں تاکہ نواب صاحب کو ہم سے اختلاف کا کوئی موقعہ نہ ملے۔ اور وہ کمشنر صاحب کی سفارش کو ٹال نہ سکیں۔ آخر کار آدھ گھنٹہ تک ادھر اُدھر کی گفتگو کرنے کے بعد نواب صاحب نے خود ہی کہا۔

اچھا میاں اب تم غسل وغیرہ کر لو تاکہ چائے منگائی جائے۔ اور یہ کہتے ہی آپ نے گھنٹی بجائی اور چوب دار کو بلایا اور ہم کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

انکے غسل وغیرہ کا انتظام کرو۔ میں جب تک محل میں ہو آؤں۔ نواب صاحب محل کی طرف اور ہم چوبدار کے ساتھ غسل خانہ کی طرف روانہ ہوئے گول کمرہ سے نکلتے ہی چوبدار نے ایک بغل کے کمرہ کی چق اٹھا کر کہا۔ یہ ہے سرکار کا کمرہ۔

اب جو ہم نے دیکھا تو ہمارا اسباب ترتیب کے ساتھ ایک سجے ہوئے کمرہ میں رکھا تھا جس میں لکھنے کی میز علیحدہ تھی۔ سنگار کی میز علیحدہ رکھی تھی الگ مسہری نہایت شاندار جس پر ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے اور ردمی قالین تمام کمرہ میں بچھا ہوا تھا۔ ہمارا بستر بدستور بندھا ہوا تھا۔ اور دوسرا بستر مسہری پر لگا ہوا تھا۔ ہم نے ایک کرسی پر بیٹھ کر جوتا کھولنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ چوبدار نے جھک کر ڈوریاں کھولنا شروع کر دیا ہم نے بے ساختگی کے ساتھ کہا۔ ارے ارے یہ کیا؟

چوبدار نے کھیسیں نکال کر کہا۔ آپ ہمارے سرکار ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے سرکار خود اپنا جوتا کھولیں؟ ہم خاموش ہو گئے۔ مگر اب فکر یہ تھی کہ اس چوبدار کے سامنے جوتے سے پیر کیونکر نکالیں۔ اس لئے کہ شان تو یہ تھی اور موزے تھے ذرا پھٹے ہوئے۔ سفر میں نئے موزے پہن کر خراب کرنا حماقت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر اس وقت نئے موزے پہن کر خراب نہ کرنا حماقت ثابت ہو رہا تھا۔ آخر ہم نے جوتے کی ڈوری کھلتے ہی چوب دار سے کہا۔ دیکھو ذرا گرم پانی داڑھی بنانے کے لئے منگاؤ۔

چوب دار نے ادب سے کہا۔ سرکار حجام باہر منتظر کھڑا ہے حکم ہو۔ تو بلاؤں۔

ہم نے کہا۔ اچھا اچھا۔ تو بلاؤ اُس کو۔

چوب دار جیسے ہی باہر گیا۔ ہم نے فوراً جوتے پیر سے نکال کر موزے اُتار ڈالے اور اُن کو اٹھا کر جیب میں چھپا لیا۔ پھر شیو ... اور سلیپر پہن کر بیٹھے ہی تھے کہ حجام فرشی سلام کرتا ہوا داخل ہوا۔ اور نہایت سلیقہ کے ساتھ شیو بنا کر چلا گیا۔ اب ہم اپنے کمرہ سے ملحق غسل خانہ میں گئے جہاں غسل کا سامان اس قدر نفاست کے ساتھ مہیا تھا۔ کہ خدا اگر کسی کو فرصت دے تو وہ عمر بھر اسی غسل خانہ میں نہاتا رہے۔ بہرحال ہم نے غسل کیا۔ اور لباس تبدیل کر کے غسل خانہ سے برآمد ہوئے ہمارے باہر آتے ہی چوبدار نے کہا۔ سرکار کا انتظار چائے پر نواب صاحب کر رہے ہیں۔

ہم نے جلدی جلدی شیروانی پہنی اور نئے موزے بھی پہنے چوبدار کی مدد سے جوتا پہنکر چائے کے کمرہ میں پہنچ گئے۔ جہاں میز پر چائے کے برتنوں میں گھرے ہوئے نواب صاحب تشریف فرما تھے ہم کو دیکھتے ہی نہایت گرم جوشی سے کہا۔ آؤ میاں آؤ۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔

چائے کا سامان دیکھ کر ہمارے ہوش اڑے جاتے تھے۔ ایک پورے ایٹ ہوم کا سامان اس دریا دل رئیس نے اپنے ہونے والے پرائیویٹ سکرٹری کے لئے مہیا کر دیا تھا۔ اور اب سوال یہ تھا۔ کہ کیا کھائیں اور کیا چھوڑیں۔ آخر نواب صاحب نے خود ہی پلیٹوں پر پلیٹیں اُٹھا اُٹھا کر پیش کرنا شروع کر دیں۔ اور ہم نے ہر پلیٹ میں سے تھوڑی تھوڑی ہر چیز کر اپنے سامنے والی پلیٹ میں رکھ لی۔ یقین مانئے کہ ہم باوجود اپنی عزت کے ان کھانے پینے کی چیزوں سے کبھی مرعوب نہ ہوئے تھے مگر یہاں تو یہ چیزیں بھی تھیں۔ اور نواب صاحب کی ذرہ نوازیاں بھی تھیں باقاعدہ نمک خوار بنانے سے پہلے ہی وہ اس خلوص کے ساتھ نمکخواری سکھا رہے تھے کہ دراصل ان کے اس خلوص کا جواب بھی ہماری طرف سے ناممکن تھا۔ ذرا غور تو کیجئے کہ کہاں بڑا رئیس اور ہم ایک دو ٹکے کے انسان مگر اس عالی ظرف رئیس نے ہم کو اپنے برابر کا درجہ دے رکھا تھا۔ چائے کی میز کے چاروں طرف وردی پہنے ہوئے بہرے اور خانساماں قسم کے لوگ بھی کھڑے تھے۔ مگر نواب صاحب ہم کو ہر چیز دیتے تھے اپنے ہاتھ ہی سے دیتے تھے۔ اس شان و شوکت کے ساتھ ہم نے چائے پی اور چائے ختم کر کے نہایت اطمینان سے جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکالا۔ اور منہ پونچھتے ہوئے میز سے ہٹ گئے۔ مگر عین اُسی وقت رومال پر جو نظر پڑی تو دم نکل گیا۔ وہی پھٹا ہوا موزہ جس کو ہم نے جلدی میں چوبدار سے الگ جیب میں رکھ لیا تھا۔ ہم نے پہلے تو گڑبڑا کر اس کمبخت موزے کو اپنی مٹھی میں چھپا لیا۔ پھر ہر طرف دیکھا کہ کسی نے دیکھا تو نہیں ہے۔ مگر اب جو جیب کی طرف دیکھتے ہیں۔ تو دوسرا موزہ بھی آدھے سے زیادہ باہر نکلا ہوا لٹک رہا تھا۔ ہم نے خدا جانے کس عالم میں ان دونوں موزوں کو جیب میں رکھا اور پھر نہایت احتیاط کے ساتھ رومال نکال کر منہ صاف کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی نے یہ منظر نہ دیکھا تھا۔ ورنہ پھٹے ہوئے موزے پہننے سے زیادہ موزے سے منہ پونچھنا ڈوب مرنے کی بات ہوتی۔

چائے سے فارغ ہو کر نواب صاحب پھر گول کمرہ میں پہنچے۔ اور اُن کے ہمراہ ہم بھی۔ نواب صاحب نے بیٹھتے ہی کہا۔

یہ بتاؤ میاں۔ کہ تم فطرتاً کم سخن ہو یا میری وجہ سے اس قدر خاموش نظر آتے ہو۔

ہم نے سعادت مندی کے ساتھ مسکرا کر کہا۔ "جی نہیں خاموش تو نہیں ہوں۔

اب ہم نے ارادہ کیا کہ کمشنر صاحب کا خط اسی وقت نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اور ملازمت کے سلسلہ میں تفصیل سے بات چیت ہو جائے۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ نواب صاحب کے اس خلق اخلاق کے بعد نہ کمشنر صاحب کے سفارشی خط کی ضرورت تھی۔ اور نہ ہم کو ملازمت کے سلسلہ میں بہت زیادہ کہنا سننا تھا۔ اس لئے کہ جو شخص ملازمت سے قبل ہی ایک ادنیٰ امیدوار کے ساتھ یہ سلوک کر سکتا ہے وہ اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو کبھی شکایت کا موقع کیوں دے سکتا ہے۔ ہم کو تو وہ خط دینا ہی تھا لہٰذا ہم خط پیش کرنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ نواب صاحب کی ڈاک لے کر چپڑاسی آگیا۔ اور ان کے سامنے ایک چھوٹی سی میز لگا دی گئی۔ ڈاک کے آتے ہی نواب صاحب کا

گیا تھا چنانچہ نواب صاحب نے چشمہ لگا کر ڈاک دیکھنا شروع کر دی۔ اور سب سے پہلے نہایت بے تکلفی کے ساتھ دو تین اخبارات اور دو رسالے ہماری طرف اچھال کر کہا۔ لو بیٹے پڑھو جب تک۔

ہم نے ان اخباروں کو اٹھا کر نہایت احتیاط کے ساتھ کھولا اور نواب صاحب اپنی ڈاک کے خطوط ملاحظہ فرمانے لگے۔ نواب صاحب کو ڈاک دیکھنے میں مشکل سے آدھ گھنٹہ صرف کرنا پڑا اس کے بعد آپ نے چپراسی سے کہا کہ منشی صاحب کو بلاؤ۔

اس حکم کی فوری تعمیل ہوئی اور منشی صاحب ہاتھ میں قلم اور ایک نوٹ بک لئے ہوئے فوراً حاضر خدمت ہو گئے۔ تو نواب صاحب نے ان کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"

یہ تار نواب صاحب مبارک پور کا ہے خیریت دریافت کی ہے۔ جواب دیدیجئے کہ خدا کا شکر ہے اب اچھا ہوں۔ یہ دوسرا تار ندا جانے کن صاحب کا ہے۔ آج کسی وقت آرہے ہیں۔ بہرحال ان کو مہمان خانہ میں ٹھہرا دیجئے گا۔ اس خط کے جواب میں لکھ دیجئے کہ فہرست عطایا میں اب کوئی گنجائش سال رواں کے لئے نہیں ہے۔ اس بدتمیز نے پوسٹ کارڈ بھیجا ہے خیر اس کو پچیس روپیہ کا منی آرڈر کر دیجئے۔ باقی ڈاک میز پہ رکھ دیجئے۔

یہ ہدایتیں دینے کے بعد نواب صاحب بکمال شفقت پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ اور صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

آؤ بیٹے تم کو کوٹھی دکھا دی جائے اور ذرا ہمارے باغ کو چل کر تو دیکھو۔"

ہم ادب کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ اور اس وقت کشنر صاحب کا ہمراہ چلنا کچھ مناسب نہ معلوم ہوا۔ بلکہ نہایت سعادت مندی کے ساتھ نواب صاحب کی رشک فردوس کوٹھی میں گھومنے لگے۔ دفتر کا کمرہ سونے کا کمرہ۔ ریڈیو کا کمرہ۔ نماز کا کمرہ۔ کتب خانہ۔ اسلحہ خانہ۔ توشہ خانہ۔ غرض اسی قسم کے سینکڑوں خانے نواب صاحب نے دکھائے۔ ہم ہر چیز کو اس طرح دیکھتے رہے گویا زندگی میں پہلی مرتبہ ان چیزوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور واقعی بہت سی چیزیں ایسی تھیں بھی مثلاً

دفتر کے کمرہ میں چاندی کی میز اور سونے کی کرسی پر بنا ہوا کام اس قدر لاجواب تھا کہ نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ سونے کے کمرہ میں جو مسہری تھی وہ ایک پورے محل کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کے قرب و جوار کے سامان کا کیا کہنا پیس پاٹ سے لے کر ٹیلیفون تک تمام ضروری سامان وہیں پر موجود اور پھر نہایت اعلیٰ قسم کا۔ مسہری کے پاس ہی تجوری بھی تھی نواب صاحب نے تجوری کی کنجی دے کر ہم سے کہا۔

ذرا اس کو کھولو تو۔ اب جو ہم تجوری کھولتے ہیں۔ تو اس کا ہینڈل ہتھکڑی کی صورت میں منتقل ہو کر ہمارے ہاتھوں میں پڑ گیا۔ اور ہم گویا تجوری کے ساتھ خود بھی مقفل ہو گئے۔ نواب صاحب نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ دیکھا تم نے اس تجوری سے کوئی چیز چرانا آسان کام نہیں ہے۔ اور پھر دوسری کنجی سے ہم کو رہا کیا۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی بہت سی حیرت انگیز چیزیں دکھاتے ہوئے نواب صاحب کوٹھی کے باہر اپنے پائیں باغ کی طرف چلے۔ مگر راستہ ہی میں اپنا چڑیا گھر بھی دکھایا۔ جس میں سینکڑوں قسم کے چرند پرند اور ایک شیر کا بچہ بھی تھا۔ اس زندہ عجائب خانہ کی سیر کے بعد ہم پائیں باغ میں پہنچے۔ واقعی اس باغ کو نہایت سلیقہ کے ساتھ ترتیب دیا گیا تھا۔ اور اس باغ کو دیکھ کر نواب صاحب یا ان کے مالی کی خوش سلیقگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ نواب صاحب کو اور ہم کو دیکھتے ہی مالی نے دو چھوٹے چھوٹے گلدستے بنا کر فوراً پیش کئے۔ اور نواب صاحب نے بھی اپنے گلدستہ میں سے ایک نہایت شاداب پھول علیحدہ کر کے ہماری شیروانی میں لگا دیا۔ ہم نے ادب سے سلام کیا۔ اور نواب صاحب نے پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

دیکھو یہ پھول بالکل معلوم ہوتا ہے کہ چڑیا بیٹھی ہوئی ہے۔ ہم نے حیرت سے اس پھول کو دیکھا واقعی وہ چڑیا کی شکل کا تھا۔ ابھی ہم اس کو دیکھ ہی رہے تھے۔ کہ نواب صاحب نے ایک بہت چھوٹا سا گلاب پیش کرتے ہوئے کہا:۔

دیکھو کتنا چھوٹا گلاب ہے۔ اس سے چھوٹا گلاب کا پھول ہوتا ہی نہیں۔ مختصر یہ کہ اسی طرح نواب صاحب دیر تک اپنے پائیں باغ کے عجائبات دکھاتے رہے۔ آخرکار پائیں باغ سے واپس آکر آپ

پھر گول کمرہ میں بیٹھ گئے۔ اب ہمارے لئے موقع بہت اچھا تھا۔ کہ کمشنر صاحب کا خط پیش کرکے اس سلسلہ میں گفتگو کریں۔ لہذا ہم نے پہلو بدلتے ہوئے خط دینے سے پہلے ہی کہا۔ میں چاہتا تھا کہ حضور والا اس سلسلہ میں بھی تبادلہ خیال فرما کر کوئی آخری حکم مرحمت فرماویں۔

نواب صاحب نے لاپرواہی کے ساتھ کہا۔ اوہو۔ ایسی جلدی ہی کیا ہے۔

ہم نے نہایت ادب سے کہا۔ یہ تو صحیح ہے مگر۔

نواب صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ بھائی بات یہ ہے۔ کہ اس سلسلہ میں گفت و شنید ہی آخر کیا ہوگی۔ جب دو طبائع میں یکسانیت موجود ہو تو پھر بحث و مباحثہ اور قیود و شرائط کی گنجائش نہیں رہتی۔ میں تم کو پہلے ہی بہت بہتر سمجھتا تھا۔ مگر اب دیکھ کر تو جتنا سنا تھا اس سے بہت زیادہ پایا۔

شنیدہ کے مانند دیدہ۔ سمجھے نا

ہم نے کسر نفسی کے ساتھ سر جھکا لیا۔ اور اب اس سلسلہ میں کوئی گفتگو کرنا خلاف مصلحت سمجھ کر خاموش ہو رہے۔ مگر اب نواب صاحب نے دریافت کیا۔ کیوں ہے نا۔

آخر گفتگو ہوگی کیا میرے خیال میں تو کچھ بھی نہ ہونا چاہئے۔

ہم نے گردن جھکا کر کہا:۔

جو رائے عالی ہو۔ دراصل یہ حقیر اس لائق تو نہ تھا۔ مگر آپ کی ذرہ نوازی۔

نواب صاحب نے کہا۔ نہیں تم تو اس لائق ہو کہ تم کو کلیجہ کا ٹکڑا بنایا جائے اور آنکھوں میں نور بنا کر رکھا جائے۔ سمجھے نا۔

غالباً ابھی اور بھی کچھ گفتگو ہوتی مگر منشی جی نے آکر اس بحث کو یہیں پر ختم کر دیا۔ اور نواب صاحب کے قریب جا کر کہا۔

جن صاحب کا تار تھا وہ تشریف لے آئے ہیں۔

نواب صاحب نے لاپروائی سے کہا۔

اچھا تو ان کو مہمان خانہ میں ٹھہرائیے ہم اس وقت تو اب کھانے پر جاتا ہوں پھر ذرا آرام کروں گا سہ پہر کو شاید مل سکوں۔

منشی جی کے جاتے ہی محل کی آیا نے حاضر ہو کر کہا "

سرکار۔ بیگم صاحبہ نے آپ سے کہلایا ہے کہ اس وقت آپ دونوں خاصہ محل ہی میں نوش فرمائیں۔

نواب صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا "۔

اچھا اچھا۔ میں سمجھا۔ وہ بھی تم کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ سمجھے میاں تم یعنی وہ بھی تم کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ اچھا بھائی وہیں سہی۔ بیگم صاحبہ سے کہدینا کہ بہتر ہے "

آیا کے جاتے ہی نواب صاحب نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔

دیکھا تم نے دراصل جو گفتگو تم مجھ سے کرنا چاہتے تھے۔ وہ اُن سے کرنا چاہئے بات یہ ہے۔ کہ یہ عورتیں نکالتی ہیں بال کی کھال اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ان معاملات میں ان ہی کی رائے صائب بھی ہوتی ہے۔ مگر مجھ کو امید ہے کہ وہاں بھی تم کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ ہوگی میں تمہاری وکالت کافی کر چکا ہوں۔

نواب صاحب اس موضوع پر گفتگو کر ہی رہے تھے کہ آیا نے پھر آکر کہا۔ سرکار خاصہ لگا دیا گیا۔

یہ سنتے ہی نواب صاحب نے صوفہ سے اُٹھ کر ہم سے کہا! "آؤ میاں"

اب نواب صاحب آگے تھے اور ہم ان کے تابع مہمل بنے ہوئے پیچھے پیچھے اسی طرح محل میں داخل ہوئے۔ تو آنکھیں کھل گئیں۔ مگر آنکھوں سے زیادہ کانوں کو کھولنا پڑا اس لئے کہ چلمنوں کے پیچھے سے کھُس پھُس سنائی دی۔ بلکہ ہم نے نہایت واضح طور پر سنا "

ایسے کالے تو نہیں۔ جیسا آیا کہتی تھی "

دوسری آواز سنائی دی "

چشمہ کیسا موٹا سا ہے۔ اس جوانی میں یہ حال "

تیسرا تبصرہ ہوا۔ کچھ مرجھلے سے ہیں۔ ایک اور آواز آئی "

نیک معلوم ہوتا ہے۔ امیروں کا سا تو دماغ نہیں ہے "

اب ہم نے غور کرنا شروع کیا کہ واقعی ایک پرائیویٹ سیکرٹری کو کیا ہونا چاہئے علمی استعداد وغیرہ کو جانے دیجئے۔ اس کی شکل و صورت کم سے کم ایسی ہو کہ عورتوں کے تبصرے اس کے خلاف نہ ہوں۔

ایسی ہو کہ کوئی عورت مرجھلا کر ہنسنے کا موقع نہ پائے بینائی بھی اچھی ہوتا کہ چشمہ کی ضرورت نہ ہو مختصر یہ کہ صورتاً بھی اس کو ٹوک پلک سے درست ہونا چاہئیے۔ ورنہ عورتوں کے انغماٹ کر دینے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور اسی خطرہ میں اس وقت ہم مبتلا تھے۔ آخر ہم یہ تبصرہ سنتے موٹے کھانے کے کمرہ میں پہنچ گئے جہاں بیٹھنے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ یہاں بھی پرائیویٹ سیکرٹری پرلیس پردہ نقاد نہایت سیر حاصل تبصرے کرتے ہیں۔ چنانچہ عین اس وقت جبکہ ورقی پراٹھے کے پارے میں ہم بٹیر کی ٹانگ بھانس کر منہ میں رکھ رہے تھے کسی نے ہنسی کے مارے لوٹ کر کہا۔

اے لو بٹیر نے بٹیر کھائی۔

ادھر ہمارا یہ حال کہ وہ نوالہ صاحب کے منہ کی بجھوندر بن گیا۔ مگر اب یہ سننے کو ملا۔

آخر یہ کھا رہے ہیں یا گھور رہے ہیں۔

لہذا ہم نے یہ بادام کے قورمہ میں شیرمال کا نوالہ ڈبوتے ہوئے جو کھایا تو کسی نے کہا۔

اے تمہیں اللہ کی قسم معلوم ہوتا ہے جیسے چوتھی کی دلہن جبر کر کے چارہ کھا رہی ہے۔ واقعی یہ نوالہ ذرا چھوٹا بن گیا تھا۔ لہذا اب کی ہم نے ذرا بڑا نوالہ بنا کر ایک نئی چیز میں ڈبو دیا اور اوپر چلمن کے پیچھے یہ معلوم ہوا کہ جیسے دیوار قہقہہ اُبل پڑی ہے۔ مگر واقعی ہنسی کی بات بھی تھی۔ اس لئے کہ اب جو ہم منہ چلاتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ تو محض آلو بخارے کا عرق تھا۔ جو کھانے کے بعد منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ذرا سا چکھ لیا جاتا ہے۔ اور یہاں یہ عالم کہ گویا تیزاب کا نوالہ کھا گئے بمشکل تمام اس نوالہ کو حلق سے اتار کر ہم نے روکھا کباب کھایا۔ تو کسی نے کہا۔

نواب کی روٹی کھانا بھول گئے ہیں۔ اس جملہ پر ہم کو خود بھی ہنسی آ گئی۔ مگر یہاں ہنسنا بدتمیزی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ لہذا ضبط کر گئے اور جس طرح بھی ہو سکا ان پھبتیوں کی بوچھار میں پیٹ بھرتے رہے آخر خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا اور الحمد للہ ہم نواب صاحب کے ہمراہ محل سے باہر آ گئے

نواب صاحب نے ہم کو ہمارے کمرے تک پہنچا کر کہا اچھا اب میں تھوڑی دیر لیٹ رہوں۔ پھر سہ پہر کو ملاقات ہوگی۔ ہم نے ادب سے جھک کر نواب صاحب کو سلام کیا اور اُن کے تشریف لے جانے کے بعد اپنے کمرے میں آ گئے۔ ہمارا دیرینہ کرم فرما چوبدار سگار اور سگریٹ لے کر آیا۔ اور اُس نے ادب سے سگار کیس پیش کرتے ہوئے کہا۔ نواب صاحب کے سامنے تو آپ پیتے نہ ہوں گے۔ اب ملاحظہ فرمائیے۔ ہم نے کہا نہیں جی تو سگریٹ پیتا ہوں۔ ہاں کمرے تو سگریٹ بھی ہے۔"

چوبدار نے کہا معلوم نہیں سرکار مگر یہ سگریٹ بھی پیتے ہیں دیکھ لیجئے ان کو۔ ہم نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور چوبدار نے موٹا کھولنے کیلئے پیروں کو سنبھالا۔ تو ہم نے چوبدار سے رازدارانہ طریقہ پر پوچھا "اماں کیوں چوبدار صاحب اس سے پہلے یہاں پرائیویٹ سیکرٹری کون تھا؟"

چوبدار نے کہا سرکار ایک تھا لونڈا مگر نگوڑا صورت حرام یا [illegible] نواب صاحب نے بہت منہ لگا رکھا تھا مگر میں نے اس کو کھڑے کھڑے نکلوا دیا۔ ہم نے کہا کیا تنخواہ پاتا تھا۔

چوبدار نے کہا چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ اور کھانا۔ اب آج ایک نیا آیا ہے۔ مگر وہ اس سے بھی زیادہ خود دماغ ہے۔ ہم نے کہا ہاں بھائی چوبدار صاحب اب [illegible]

چوبدار نے کہا ارے حضور بھلا یہ بھی کوئی بات ہے آپ ہمارے سرکار ہیں اللہ [illegible] لائے کہ ہم دولہا میاں کہیں سرکار کو نواب صاحب [illegible] کون بیٹھے ہیں [illegible] اللہ داماد ہوں گے تو آپ" ہم نے سہری رستے کٹتے ہوئے کہا۔ "کیا کہا تم نے؟"

چوبدار نے کہا۔ اللہ مبارک کرے سرکار۔ اب طے سمجھئے بیگم صاحبہ بھی اُن کو یہ رشتہ پسند بہت ہے ہم نے ٹکھوال کر کہا آخر ہم یہ کہہ کیا رہے ہو کیا رشتہ [illegible] تو سکریٹری بننے کے لئے آیا ہوں۔ چوبدار نے ہمارا منہ دیکھ کر کہا۔ اے سرکار بھلا ہم بڈھوں سے مذاق کیوں کرتے ہیں؟ ہم نے گڑبڑا کر کہا بھائی چوبدار صاحب تمہارے سر کی بلکہ اپنے سر کی قسم میں تو پرائیویٹ سیکرٹری کی جگہ کا امیدوار ہوں کمشنر صاحب کا خط لایا ہوں

چوبدار نے کہا کیا جانے سرکار اللہ جو آج آیا ہے وہ کہتا ہے کہ نواب صاحب نے میری لڑکی دس کی ہے ایک منٹ ٹھیر ونگا۔ ہم نے بدحواس ہو کر کہا۔ اچھا ذرا مجھکو ان صاحب سے ملا دو۔ چوبدار نے فوراً ہی ان صاحب سے ہم کو ملا یا اب جو گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہم کو اسی وقت اپنا بوریا بدھنا لے کر بھاگ جانا چاہئیے۔ ورنہ نواب صاحب کچھ ٹھیک نہیں کہ آفت آ جائے گی۔ دوسرے دن کمشنر صاحب کا [illegible] بھیجے موزے کی جوڑی جیب میں لئے ہوئے ہم لکھنؤ کے اسٹیشن پر ٹہل رہے تھے۔

شوکت تھانوی

قطب جنوبی کی مہم

تسخیر قدرت کے لئے انسان کی دیوانہ وار جدوجہد کی داستان

(از جناب ریاض حسین صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر [illegible])

یہ سرگذشت ہے ایک زندہ قوم کے چند افراد کی۔ تیغِ علم کے چند ٹیالوں کی۔ قومی ناموری کے جانباز تیدائیوں کی۔ جنہوں نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی اپنے عزم و استقلال اور سرفروشی و ایثار سے کام لیکر قطب جنوبی کے ہیبتناک برستانوں کے ہار لئے سربستہ کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔ انسانی علم و دانش میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اور اپنی کوششوں میں انجام کار اپنی متاعِ حیات کو قربان کر دیا ایسی ہستیاں ہر ملک اور قوم کے لئے باعث فخر و نازش ہوتی ہیں۔ چنانچہ امریکہ کے شہرہ آفاق فلسفی شاعر ایمرسن نے کیا خوب کہا ہے۔

کسی قوم کی طاقت اور ناموری سونے چاندی کے ڈھیروں پر منحصر نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس قوم کے افراد پر منحصر ہوتی ہے۔ جو حق پر ثابت قدم اور محنت کش ہوتے ہیں۔ جو اس وقت بھی مصروفِ کار رہتے ہیں۔ جب دوسرے لوگ محوِ خوابِ استراحت ہوں۔ اور جب بزدل انسان میدان چھوڑ جاتے ہیں۔ تو یہی لوگ مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ یہی وہ ہستیاں ہیں۔ جو اپنی قوم کی عظمت و شہرت کے میناروں کو ثریٰ کی گہرائیوں سے اٹھا کر ثریا کی بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں۔

قطبین کی مہمات

تقریباً چار صدیوں سے دنیا کا ہر بحری ملک مثلاً برطانیہ۔ ناروے۔ امریکہ۔ جرمنی۔ جاپان۔ فرانس۔ اٹلی اور آسٹریلیا نے اپنے آزمودہ کار

شمالی اور قطب جنوبی پر پہنچنے کا امتیاز امریکہ اور ناروے کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے ان ہی دو ممالک کے سیاح یعنی رابرٹ پیری اور امنڈسن نے قطب شمالی اور قطب جنوبی پر اپنے اپنے ملک کا جھنڈا نصب کیا۔ مگر اس مضمون میں ہم صرف ایک برطانوی مہم کا حال بیان کریں گے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں کپتان رابرٹ سکاٹ کی زیر سرکردگی قطب جنوبی کو روانہ ہوئی تھی۔ اس سے ناظرین کرام کو بخوبی اندازہ ہو سکیگا۔ کہ سیاحوں کو ان ہولناک برستانوں میں کس کس طرح کے خطرات و مہالک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور ایسی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کتنے دل گردے کی ضرورت ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ کپتان سکاٹ کی مہم کے حالات بیان [illegible] ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ قطب جنوبی کے محل وقوع اور اس کے [illegible] سے ناظرین کرام کو روشناس کیا جائے۔

قطب جنوبی کے دلچسپ کوائف

کرۂ ارض کے انتہائی جنوبی نقطہ کو قطب جنوبی کہا جاتا ہے۔ [illegible] کے اردگرد ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ جس کا رقبہ آسٹریلیا کے [illegible] اور اس میں بڑے بڑے پہاڑ واقع ہیں۔ جن میں سے بعض آتش فشاں [illegible] یہ ملک قطب جنوبی کا براعظم کہلاتا ہے۔ اور سال بھر یخ بستہ [illegible] جنوبی امریکہ کے انتہائی جنوب میں راس ہارن ہے۔ اور [illegible] اس براعظم سے قریب ترین ہے۔ قطب جنوبی [illegible]

[illegible] عالم میں انسان کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ مگر ان برف سے ڈھکے ہوئے ویرانوں میں چند اور پرند بکثرت ملتے ہیں۔ اکثر جانور بکری قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ویل مچھلی۔ سیل یا دریائی بچھڑے۔ قطبی ریچھ وغیرہ۔ ان علاقوں میں [illegible] کے موسم میں کئی کئی ہفتے تک متواتر ۲۴ گھنٹے دن رہتا ہے۔ اور سردیوں میں راتیں اسی قدر طویل ہوتی ہیں۔ خاص قطب جنوبی پر چھ ماہ دن رہتا ہے۔ اور چھ ماہ رات۔ مگر وہاں راتیں بالکل تاریک نہیں ہوتیں۔ کبھی چاند کی چاندنی ان کو منور کرتی ہے۔ اور جب چاند نہیں ہوتا۔ تو تاروں کی روشنی برف سے منعکس ہو کر تاریکی کو کم کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ان سب سے زیادہ حیرت انگیز ایک عجیب و غریب شاندار روشنی آسمان پر ظاہر ہوتی ہے جسکو (AURORA) [illegible] کہتے ہیں۔ یہ زرد۔ سبز اور نیلے رنگ کے پردوں کی صورت میں اُفق پر نظر آتی ہے۔ قطب جنوبی کے مقام سے جدھر بھی نظر ڈالیں۔ شمال ہوگا۔ وہاں مشرق و مغرب کی سمتیں مفقود ہوتی ہیں۔

ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص ایک مرتبہ ان برفستانوں کی سیر کر آتے۔ تو پھر وہ ان کی ہیبتناک عظمت اور ویران وسعتوں اور دلکش نظاروں سے کچھ اس طرح مسحور ہو جاتا ہے۔ کہ ان جزیروں کی پُر اسرار کشش اسے اشاں کشاں پھر وہاں لے جاتی ہے۔ اور ان کے تصور سے کل نہیں پڑتی۔ چنانچہ کپتان [illegible] سن جس نے ۱۹۱۱ء میں قطب جنوبی دریافت کیا۔ اپنی تمام زندگی قطبین کے برفانی علاقوں میں بسر کر دی۔ اور جب ۱۹۲۸ء میں ایک اطالوی مہم جو ہوائی جہاز میں [illegible] برفستانوں کی تحقیقات کرنے گئی۔ اور اس مہم کے ارکان مشکلات میں پھنسکر آخر کار رستہ بھول گئے۔ تو بہادر امنڈسن ہی تھا۔ جو ہوائی جہاز میں ان گمشدہ [illegible] کی تلاش کرنے گیا۔ اور آخر اسی تلاش میں اپنی جان عزیز قربان کر دی۔ [illegible] امریکہ کی ریاستہائے متحدہ کے بحری کپتان رابرٹ پیری نے اپنی زندگی [illegible] قطب شمالی کی تحقیقات میں صرف کر دیئے۔ اور انجام کار ۱۹۰۹ء [illegible] شمالی میں پہنچ گیا۔ ایسے ہی سر ارنسٹ شیکلٹن ایک اور جانباز [illegible] جس نے قطب جنوبی کے برفانی سمندروں کی سیاحت میں [illegible] اور جب آخری مہم لیکر قطب جنوبی کو جا رہا تھا [illegible]

رابرٹ سکاٹ نے دو مرتبہ قطب جنوبی کا سفر کیا۔

رابرٹ سکاٹ کا پہلا سفر

۱۸۹۹ء میں سر کلیمنٹس مارکھیم جو اس وقت رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے صدر تھے۔ قطب جنوبی کے مستور راعظم کی تحقیقات کے لئے ایک مہم بھیجنا چاہتے تھے۔ اس مہم کی قیادت کے لئے ان کی نظر انتخاب شاہی بحری محکمہ کے کپتان رابرٹ سکاٹ پر پڑی۔ انہوں نے لکھا۔ کہ "سکاٹ ایک ہونہار بحری افسر ہے۔ قابل۔ ہر لحاظ سے ماہر۔ ہر دلعزیز۔ ایسے افسروں کی قدر دانی سے سرشار۔ اور اپنے شاندار پیشہ میں ہمہ تن محو۔ اگرچہ ذمہ داری بہت بھاری ہے۔ مگر اس کے لئے سکاٹ سے موزوں تر آدمی کا ملنا محال ہے"۔

چنانچہ سکاٹ کی سرکردگی میں مہم روانہ ہو گئی۔ سفر کامیاب رہا۔ اور اس مہم سے جو جو انکشافات کئے۔ وہ نہایت اہم سمجھے گئے۔ کئی نئے جزیرے دریافت ہوئے۔ جن میں سے بعض میں آتش فشاں پہاڑ تھے۔ سب سے دلچسپ اور اہم دریافت کوہستان وکٹوریہ کی تھی۔ جو ایک بہت بلند سلسلۂ کوہ ہے اور سینکڑوں میل تک چلا گیا ہے۔ اسی سفر میں کپتان سکاٹ نے معلوم کیا۔ کہ قطب جنوبی ایک بہت بڑی برفانی چوٹی پر واقع ہے۔ مگر وہ وہاں تک پہنچنے سے قاصر تھا۔ کیونکہ اس کے پاس لوازمات سفر ناکافی تھے۔ جب وہ واپس آیا۔ تو پھر اسے بحری محکمہ کی خدمات تفویض ہوئیں۔

رابرٹ سکاٹ کا دوسرا سفر

۱۹۱۰ء میں دوبارہ اسے قطب جنوبی کی ایک مہم کی قیادت سپرد کی گئی۔ اس دفعہ مہم کے بھیجنے سے غرض یہ تھی۔ کہ وہ اپنی علمی تحقیقات کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے اس کا جہاز ٹیرا نووا پورے طور پر ساز و سامان سے بھر دیا گیا۔ ضروری آدمی ہمراہ کئے گئے۔ اور کپتان سکاٹ کا جہاز نیوزیلینڈ کو روانہ ہو گیا۔

اس مرتبہ سکاٹ نے تہیہ کر لیا۔ کہ وہ قطب جنوبی پر ضرور پہنچیگا۔ نہ صرف اپنے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے خیال سے کہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو انسان کی دسترس سے باہر ہو۔ بلکہ اس غرض سے بھی کہ ان مستور برفستانوں کے [illegible]

الغرض جب وہ اس مہم پر روانہ ہوا۔ تو ملکی خدمت کے شوق اور ذاتی امتیاز کی خواہش کے دوگونہ جذبات اس کے دل میں موجزن تھے۔ چنانچہ اپنے روزنامچے کے پہلے صفحے پر اس نے سر ہمفرے گلبرٹ کا مندرجہ ذیل مقولہ درج کر رکھا تھا۔

"وہ انسان زندہ رہنے کا ہرگز حق نہیں رکھتا۔ جو موت کے خوف یا خطرہ کے سبب اپنے ملک کی خدمت کرنے یا ذاتی ناموری حاصل کرنے سے کتراتا ہو۔ کیونکہ موت کا آنا ناگزیر ہے۔ اور نیکی کی شہرت لازوال ہے"۔

سکاٹ کا جہاز اوائل نومبر ۱۹۱۰ء میں نیوزی لینڈ پہنچا۔ اس کے ہمراہ جہاز کے بارہ افسروں اور میس ملاحوں کے علاوہ سات افسروں اور بارہ علمی ماہرین کی ایک منتخب جماعت تھی۔ جو علم الحیوانات۔ نباتات۔ علم الارض۔ طبعیات۔ آب و ہوا۔ اور تصویر کشی کے ماہرین پر مشتمل تھی۔

۲۹ دسمبر کو یہ مہم نیوزی لینڈ سے روانہ ہوئی۔ اور ۱۹۱۰ء کے آخری دن ان کو ایک سو دس میل کے فاصلہ پر براعظم قطب جنوبی کے سر فلک پہاڑوں کا سلسلہ دکھائی دیا۔ دسمبر کی شام تھی۔ دس بجے کا وقت تھا۔ مگر ان پہاڑوں کی خوشنما چوٹیاں اس وقت بھی سورج کی روشنی سے منور تھیں۔ اس کے تین روز بعد وہ اس برفانی دیوار پر پہنچے۔ جو چار سو میل طویل اور کہیں اس سے زیادہ عریض ہے یہ قطب جنوبی کے سمندری راستہ میں سد سکندری کی طرح حائل ہے یہاں اس دیوار کی بلندی ساٹھ فٹ تھی۔ اس جگہ جہاز سے اترنا محال تھا۔ اس لئے سکاٹ دیوار کے ساتھ ساتھ جہاز کو لے گیا۔ حتے کہ وہ اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں اپنے پہلے سفر میں اس نے ایک جھونپڑا بنایا تھا۔ اس جگہ کا نام بدل کر اس نے اپنے نائب ہم ایونز کے نام پر راس ایونز رکھا۔ یہاں پر یہ لوگ جہاز سے اُترے موٹر گاڑیاں۔ گھوڑے کتے وغیرہ بھی اتار لئے گئے۔ اس کام میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ ایک یا جھونپڑا جلدی جلدی بنایا گیا۔ اور قطب جنوبی کی طرف جانے کے واسطے جابجا خوراک و ضروریات کے ذخیروں کا ایک سلسلہ قائم کرنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ اس طرح راس ایونز سے قطب جنوبی تک بارہ ڈپو بنانے تجویز ہوئے۔ اس داستان کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ مختلف ذخیروں کے نام اور ترتیب واضح کردی جائے۔

(۱) کارنر کیمپ جہاں سے روانہ ہونا تھا۔

(۲) بلف ڈپو۔　(۳) ایک ٹن ڈپو۔　(۴) ہوپ ڈپو

(۵) برفانی دیوار کا وسطی ڈپو　(۶) برفانی دیوار کا جنوبی ڈپو

یہ سب ڈپو برفستان کی نسبتاً ہموار میدان پر واقع تھے۔ اس کے بعد پہاڑوں کے درمیان دس ہزار فٹ کی بلندی پر ایک گلیشیر یعنی برف کا دریا تھا۔ (۷) گلیشیر کے دامن کا ڈپو۔　(۸) گلیشیر کے وسط کا ڈپو　(۹) گلیشیر کی چوٹی کا ڈپو۔ اس کے بعد آخری سطح مرتفع تھی۔ جو قطب جنوبی تک جاتی تھی۔ اس سطح مرتفع کی بلندی سطح سمندر سے ساڑھے نو ہزار فٹ تھی۔

(۱۰) تین درجہ کا ڈپو　(۱۱) ۱½ درجہ کا ڈپو　(۱۲) آخری ڈپو

ان میں سے شروع میں صرف چند ایک ڈپو بنا لئے گئے تھے۔

ایک تشویشناک انکشاف

اس اثنا میں تعمیری کام مکمل ہو گیا۔ تو سائینسدان اور علمی ماہرین اپنے اپنے مشاہدات میں مصروف ہو گئے۔ اور رس ماہ تک تمام جماعت آرام سے مصروف کار رہی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اس دوران میں انکو بعض مشکلات اور حوادث سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر وہ معمولی تھے۔ لیکن ایک ایسا انکشاف بھی ہوا۔ جس سے ان کی حقیقی صدمہ ہوا۔ یعنی ۲۲ فروری کو لفٹننٹ کیمبل کی طرف سے جو خلیج دیوار میں مشرقی جانب مشاہدات میں مصروف تھا۔ سکاٹ کو خط ملا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ مجھے کپتان ایمنڈسن کی زیر سرکردگی ایک ناروے کی مہم ملی ہے۔ جو ہم سے پہلے قطب جنوبی پہنچنے کا تہیہ کئے بیٹھی ہے۔ سکاٹ معاملہ کی اہمیت کو فوراً تاڑ گیا۔ ناروے کی مہم فی الحقیقت ان سے آگے تھی۔ ایمنڈسن نے ٹھہرنے کی کے لئے ایک ایسا مقام انتخاب کیا تھا۔ جو سکاٹ والے مقام کی نسبت منزل مقصود سے ساٹھ میل قریب تھا۔ اور وہ اپنی برفانی گاڑیوں اور کتوں کو بحفاظت تمام وہاں پر اتارنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ نیز ایمنڈسن کو یہ فائدہ بھی حاصل تھا کہ وہ سکاٹ سے بہت پہلے منزل مقصود کو روانہ ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ جہاں گھوڑے کام کے ناقابل ہو نے سکتے کام ہو سکتے تھے۔ اور سکاٹ نے بھی کتوں کی بجائے گھوڑوں سے کام لینا مناسب سمجھا۔

ایسی صورت میں بعض لوگ گھبرا جاتے ہیں۔ اور [illegible] کام لیتے ہیں۔ مگر سکاٹ نے بحال دانشمندی فیصلہ کیا۔ کہ [illegible] کے مطابق کام کیا جائے گا۔ اور ایمنڈسن کے [illegible]

پہنچ جائیں۔ اور اپنے ملک کی عزت کے لئے جو کچھ بھی ہو سکے۔ بغیر خوف یا گھبراہٹ کے کئے جائیں۔ اس کے چھ ماہ بعد بھی اس کی یہی رائے تھی۔ کہ اس کے ساتھ دوڑ لگانے کی کوشش سے میری تدابیر خاک میں مل جاتیں۔ ہم ہرگز اس مقصد کو لیکر روانہ ہی نہیں ہوئے تھے۔ اصل چیز کام ہے۔ جس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ نہ کہ تحسین و آفرین جو بعد میں حاصل ہوتی ہے۔" لیکن بایں ہمہ اس کی دلی آرزو تھی۔ کہ وہ قطب جنوبی پر پہلے پہنچے۔ دس ماہ کی مدت میں وہ اسی مقصد کے حصول کی تجاویز سوچتا رہا۔ اور تجربے کرتا رہا۔ چنانچہ اسی کو ان سے کچھ زیادہ توقع نہ تھی۔ پھر گھوڑوں سے کام لیا جائے۔ اور جب وہ بھی ہار جاویں۔ تو ان کو چھوڑ دیا جائے۔ اور آدمیوں میں سے سب سے زیادہ قوی۔ اور حوصلہ مند چن لئے جائیں۔ جو آخری گاڑی کو خود کھینچ کر لے جائیں۔ خواہ (SKi) سکی پر یا پیدل۔ حتیٰ کہ قطب جنوبی پر پہنچ جائیں۔ پھر واپس لوٹیں۔ اور منزل بمنزل ٹھہرتے اس مقام پر پہنچ جائیں۔ جہاں کتے ان کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہر ڈپو پر وہ ایندھن اور خوراک کا ذخیرہ چھوڑتے جائیں گے۔ تاکہ واپسی پر اسے استعمال کر سکیں۔

اب تمام جماعت میں سے آدمیوں کا انتخاب کرنا باقی تھا۔ سکاٹ شروع سے ہی اپنے رفیقوں کی قابلیت اور غیر معمولی قوت برداشت۔ خوش طبعی اور ولولہ کا معترف تھا۔ اس کے خیال میں سب کے سب بہترین آدمی تھے۔ اور اگر ان میں سے کسی میں کوئی خامی تھی بھی۔ تو وہ خود سکاٹ کی سیرت کے اثر اور اس کی فیاضانہ تعریف کی بدولت رفع ہو گئی تھی۔ وہ سب کی تعریفیں کر کے ان کا دل بڑھاتا۔ اور ہر ایک کی خوبیاں ایک ایک کر کے گنتا۔ سکاٹ میں ایک اور خوبی تھی۔ جو کسی لیڈر کے اوصاف میں سب سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ وہ [illegible] امید ضرور تھا۔ مگر ضرورت سے زیادہ خوش آئند خیالات کو دل میں جگہ نہ دیتا تھا۔ وہ مصیبت کے اثرات کو دوسروں کی نسبت جلدی سمجھ لیتا۔ مگر اسے خاموشی [illegible] مستقل مزاجی سے برداشت کرتا۔ اس کا دل خوف و خطر سے خالی تھا۔ [illegible] والی مشکلات کا اسے پورا پورا احساس تھا۔ اور ان کے تدارک کا بھی اس نے مکمل انتظام کر رکھا تھا۔ چنانچہ قطب جنوبی کو روانہ ہونے سے پہلے اس کے [illegible] الفاظ انجیل میں ہیں۔

[illegible] مستقبل خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں

نے حصول کامیابی کے لئے انتظامات مکمل کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

دس گھوڑوں کی داستان

سکاٹ یکم نومبر کو راس آئی لینڈ سے روانہ ہوا۔ اور ۱۰ دسمبر ۱۹۱۱ء کو ۲۷۹ میل کا فاصلہ طے کر کے بیرڈ مور گلیشیر پر پہنچا۔ اس حصہ سفر کی داستان دراصل ان دس گھوڑوں کی سرگذشت ہے۔ جن کی تندرستی و توانائی پر ہی ابتدائی کامیابی کا دار و مدار تھا۔ ہر مقررہ منزل پر خوراک و ایندھن کے ذخیرے چھوڑنا۔ اور ان پر برف اور پتھروں کے ٹیلے بطور نشانی بنانا ضروری تھا۔ تاکہ قطب جنوبی سے واپسی پر ان کو خوراک اور ایندھن آسانی سے مل سکے۔ خیال تھا۔ کہ جس قدر زیادہ فاصلہ یہ گھوڑے طے کر سکیں گے۔ اسی قدر تھوڑے فاصلے کے لئے آدمیوں کو خود گاڑیاں کھینچنی پڑیں گی۔ مگر قسمت ایسی ہوئی۔ جب دیکھا۔ کہ تمام سردیوں میں اوٹس کی طرف سے ان کو سدھانے کی انتھک کوششوں کے باوجود یہ گھوڑے صرف ۹ دسمبر تک سفر کو جاری رکھ سکے۔

سفر کا آغاز تو اچھا تھا۔ دوسری منزل پر پہنچے۔ تو گھوڑے سخت تھکے ماندے تھے۔ لیکن آرام کر لینے کے بعد پھر تازہ دم ہو گئے۔ یہاں بونز نامی گھوڑے نے شرارت کی۔ یعنی کرسٹوفر نامی گھوڑے کی لگام کا چمڑا اور اس کی عینک کھا گیا۔ اور وہ بیچارہ دھوپ میں آنکھیں جھپکتا رہ گیا۔

دونوں موٹریں آگے بھیج دی گئی تھیں۔ جو برف پر پھسلنے والی گاڑیوں کو کھینچ رہی تھیں۔ راہ میں ایک رقعہ ملا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ ہم بخوبی جا رہے ہیں۔ مگر ساڑھے چار میل آگے گئے۔ تو سکاٹ نے دیکھا۔ کہ ایک موٹر اور برفانی گاڑیاں راہ میں پڑی ہیں۔ ایک رقعہ بھی ملا۔ جس سے معلوم ہوا۔ کہ موٹر کا سلنڈر ٹوٹ گیا تھا۔ فالتو سلنڈر پہلے ہی استعمال ہو چکا تھا۔ اس لئے دونوں ڈرائیور دوسری موٹر میں آگے چلے گئے تھے۔ سکاٹ لکھتا ہے۔ "اس طرح ان انجنوں سے زیادہ امداد کی امید خاک میں مل گئی ہے۔ دوسری موٹر کے نشانات آگے آگے جا رہے ہیں۔ مگر مجھے اب ہر گھڑی اس موٹر کو بھی اسی طرح دیکھنے کا اندیشہ ہے۔" چنانچہ سکاٹ کا خیال درست نکلا۔ ۵ نومبر کو وہ موٹر اور برفانی گاڑیاں بھی راہ میں پڑی ملیں۔ اس کا بھی سلنڈر ٹوٹ گیا تھا۔ اور ڈرائیور ان کو چھوڑ کر پیدل روانہ ہو گئے تھے۔

گھوڑے چند روز کے بعد قطبی موسم کی شدتوں کے خوگر ہو گئے۔

اور اپنا کام خوب کرتے رہے۔ البتہ جب برف کا طوفان آتا۔ تو ان کی ہمتیں پست ہو جاتیں۔ برف کے طوفانوں اور تند مخالف ہوا کا مقابلہ کرتے ہوئے پارٹی ۱۰ نومبر کو ایک ٹن ڈپو پر پہنچ گئی۔ ۲۲ نومبر کو کتوں کو گوشت دینے کے لئے سب سے کمزور گھوڑے کو گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔ اگلے پانچ دنوں میں دو اور گھوڑے ہلاک کر دیئے گئے۔ اب گلیشیر ستر میل کے فاصلہ پر تھا۔ ۲۹ نومبر کو اگرچہ طوفان تھم گیا۔ سورج نکل آیا۔ مگر زمین کی سطح اس قدر نرم تھی۔ کہ چلتے چلتے گھوڑے گھٹنوں تک اس میں دھنس جاتے۔ ایک اور گھوڑے کو ہلاک کر دیا گیا۔ ابھی گلیشیر تک پہنچنے میں تین منزلیں باقی تھیں۔ گھوڑوں کی حالت اب مایوس کن تھی۔ اس لئے ۸ دسمبر کو باقی تمام گھوڑوں کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ اور اس پڑاؤ کا نام اس افسوسناک واقعہ کی یاد میں مذبحہ رکھا گیا۔ اب تمام کام کتوں اور آدمیوں کے کندھوں پر آ پڑا۔

امدادی پارٹیوں کی واپسی

موٹر کار والی پارٹی تو ۲۴ نومبر سے ہی واپس ہو چکی تھی۔ اب ۱۰ دسمبر کو تین برفانی گاڑیوں کو سکاٹ سمیت بارہ آدمی کھینچتے ہوئے آگے روانہ ہوئے ۲۱ دسمبر کو یہ لوگ گلیشیر کی چوٹی پر جو آٹھ ہزار فٹ بلند تھی۔ پہنچ گئے۔ اب گاڑیاں کھینچنے کا کام بے انتہا مشکل تھا۔ مہم کے ایک دو ارکان تو بہت تھک گئے۔ بعض کو ضعفِ بصارت کی شکائیت لاحق ہو گئی۔ ۲۳ دسمبر کو ایک امدادی پارٹی کو سکاٹ نے واپسی کا حکم فرمایا۔ چنانچہ نہائیت افسوس اور مایوسی کی حالت میں چار آدمی واپس لوٹے۔ اب صرف آٹھ آدمیوں پر مشتمل دو پارٹیاں آگے روانہ ہوئیں۔ سطح میں خوفناک گڈھے اب بھی کثرت سے تھے۔ چنانچہ پہلے شام کے وقت ایک ایسے ہی تنگ گڈھے میں گر پڑا۔ مگر اسے نکال لیا گیا۔ کرسمس کی شام کو اس پارٹی کے افسران نے شاندار کھانا کھایا۔ یعنی قیمہ کی ٹکیاں اور گھوڑے کے گوشت کے بھنے ہوئے پارچے۔ شوربا۔ بسکٹ وغیرہ۔ پھر ارا روٹ کوکو اور بسکٹوں کا مرکب۔ علاوہ ازیں پلم کا حلوہ۔ کوکو۔ کشمش۔ مٹھائی وغیرہ۔ اس پُرتکلف ضیافت کے بعد ان کے لئے نقل و حرکت دشوار تھی۔ اس لئے سب سونے کے تھیلوں میں گھس گئے۔ اور خواب استراحت کے مزے لینے لگے۔

اس طرح سفر کرتے ہوئے ۳ جنوری کو یہ لوگ قطب جنوبی سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر پہنچ گئے۔ اب دوسری امدادی پارٹی کے ارکان بھی بدستور تھک چکے تھے۔ کہ سکاٹ نے ان کو بھی واپسی کا حکم دیا۔ البتہ ان میں سے ایک باورز نامی رفیق کو اپنی پارٹی میں شامل کر لیا۔ واپس ہوتے وقت ان تین رفیقوں کو نہائیت رنج ہوا۔ بلکہ ان میں سے ایک تو رونے لگ گیا۔

قطب جنوبی کے سفر کیلئے آخری انتخاب

اب جماعت میں صرف مندرجہ ذیل پانچ افسر رہ گئے:۔

(۱) ایونز جو برف پر چلنے کے جوتوں کا ماہر، برفستانی گاڑیاں۔ خیموں۔ سونے کے تھیلوں اور دیگر سامان کا ذمہ دار تھا۔

(۲) باورز ذخائر کا انچارج۔ آب و ہوا کے مشاہدات اور تصویر کشی کا ذمہ دار تھا۔ وہ اس قدر محنتی اور جفاکش تھا۔ کہ جب دوسرے ساتھی سونے کے اپنے تھیلوں میں گھس جاتے تھے۔ وہ رات کے وقت خیمہ سے باہر آسمان کے نیچے تصویر کشی اور مشاہدات میں مشغول رہتا۔

(۳) اوٹس۔ گھوڑوں کے سدھانے میں قیمتی خدمات انجام دے چکا تھا۔ اب وہ گاڑی کھینچنے اور خیمہ لگانے میں مدد دیتا تھا۔ جفاکشی میں یہ بھی کسی سے کم نہ تھا۔

(۴) ولسن ڈاکٹر تھا۔ اور اپنے ہمراہیوں کے علاج معالجہ میں اس قدر بیباک و سرگرمی سے کام کرتا۔ کہ اپنے آرام کی اسے مطلق پرواہ نہ ہوتی۔ اگرچہ برف کے سبب وہ بھی ضعفِ بصارت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ پھر بھی ہشاش بشاش رہتا۔

(۵) سکاٹ۔ چونکہ یہ مہم کا سردار تھا۔ اس لئے مہم کی ذمہ داری اور اپنے ہمراہیوں کی حفاظت کا تمام بار اسی کے کندھوں پر تھا۔ پھر ہر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ کا اسے فیصلہ کرنا پڑتا۔ خواہ وہ کسی قدر تھکا ہوا ہوتا۔ یا بعض وقت مایوس بھی ہو جاتا۔ لیکن وہ اپنا فرض سمجھتا۔ کہ خوش و خرم اور پُر امید نظر آئے۔ سب سے پہلے صبح کو اٹھتا سب سے بیدار کرتا۔ اپنے رفیقوں سے پورا پورا کام لینے کا اسے خوب ملکہ تھا۔ اور اس کے رفیق بھی اس پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔

الغرض یہ منتخب پارٹی آگے روانہ ہوئی۔ اور ۹ جنوری کو اس مقام پر پہنچ گئی۔ جہاں تک شیکلٹن پہنچا تھا۔ اس سے آگے بالکل نیا علاقہ تھا۔ سفر گیا نیت یکرنگی کے سبب غیر دلچسپ تھا۔

ان کے بدترین اندیشے درست نکلے

۱۰ جنوری کے بعد سطح خراب ہو گئی۔ زمین ریت کی مانند برف سے یکسر ڈھپی ہوئی تھی۔ سکاٹ لکھتا ہے:۔

"اب قطب جنوبی ہم سے صرف پچاسی میل کے فاصلہ پر ہے۔ مگر یہاں گاڑیوں کا کھینچنا کار دارد۔ تاہم کچھ نہ کچھ بڑھتے جا رہے ہیں"۔

۱۵ جنوری کے بعد قطب جنوبی صرف دو منزل پر تھا۔ چونکہ ان کے پاس دن کی خوراک تھی۔ اس لئے ان کو یقین تھا۔ کہ وہ ضرور منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ مگر جوں جوں منزل قریب آ رہی ہے۔ یہ خدشہ ہر ایک کے دل میں اضطراب پیدا کر رہا تھا۔ کہ کہیں منزل مقصود پر پہنچیں۔ تو وہاں ناروے کا جھنڈا لہرا رہا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۱۶ جنوری کو جب وہ منزل مقصود سے ۱ میلے پر تھے۔ باورز کو دور سے ایک سیاہ دھبہ دکھائی دیا۔ برف سے ڈھپے ہوئے سفید میدان میں سیاہی کہاں سے آ سکتی تھی۔ دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ یہ لوگ بڑھتے گئے اور جب قریب پہنچے۔ تو انہوں نے دیکھا۔ کہ ایک سیاہ جھنڈا ایک ڈنڈے کے ساتھ بندھا ہوا برف کے وسیع میدانوں میں فخر و غرور کے ساتھ سر اٹھائے لہرا رہا تھا۔ سکاٹ لکھتا ہے۔

"ہمارے بدترین اندیشے درست نکلے"۔

"بڑی دلچسپی اور مایوسی کے ساتھ ان اولوالعزم انسانوں کی مختصر جماعت نے اس نظارہ کو دیکھا۔ اس کو بیان کرنے کے الفاظ نہیں ملتے۔ قریب ہی ایک کیمپ کے آثار تھے۔ برفانی گاڑیوں کی آمد و رفت اور بہت سے کتوں کے پنجوں کے نشانات نے حقیقت حال واضح کر دی۔ یعنی "امنڈسن کی مہم ہم سے بازی لے گئی۔ اور ہم سے قبل قطب جنوبی پر پہنچ کر اپنے ملک کا جھنڈا نصب کر گئی۔ یہ ہولناک مایوسی کی بات تھی۔ اور میں اپنے جان نثار رفیقوں کے لئے بے انتہا متاسف ہوں"۔

اس حوصلہ شکن انکشاف کے سبب کسی کو رات بھر نیند نہ آئی۔ تاہم انہوں نے اپنا سفر پورا کیا۔ اب چونکہ ان کے دل ٹوٹ چکے تھے۔ اور اولیت کا فخر حاصل کرنے کی امید جاتی رہی تھی۔ وہ برفستان ان کو ہولناک اور ہیبتناک معلوم ہوتے تھے۔ سکاٹ اب واپسی کے مسئلے پر غور کرتا ہوا لکھتا ہے۔

"خدا معلوم اب ہم واپس پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں"۔

۱۸ جنوری کو قطب جنوبی سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ان کو ایک چھوٹا سا خیمہ ملا۔ جس میں رولڈ امنڈسن کی یادداشت ملی۔ کہ میں نے اپنے چار رفیقوں کے ہمراہ ۱۶ دسمبر کو یہاں قیام کیا تھا۔ نیز سکاٹ کے نام ایک رقعہ بھی پڑا ملا۔ سکاٹ نے بھی وہاں ایک تحریر چھوڑی۔ اس دوران میں باورز تصویریں لینے اور ولسن نقشے بنانے میں مصروف رہا۔ پھر سب نے مل کر ایک برف کا ٹیلہ کھڑا کیا۔ اور اس پر برطانوی جھنڈا یونین جیک نصب کیا گیا۔ پارٹی نے اپنا فوٹو لیا۔ جس میں سب کے سب سنجیدہ اور متفکر نظر آتے تھے۔ وہاں سے روانگی کے وقت سکاٹ لکھتا ہے:۔

"اب ہم اپنی منزل مقصود کو خیرباد کہہ رہے ہیں۔ ہمیں آٹھ سو میل تک برفستانوں پر گاڑیوں کو کھینچ کر لے جانا ہے۔ اور اب خواب و خیال کی دنیا کو خدا حافظ کہتے ہیں"۔

زندگی کے لئے دوڑ

بعض اوقات کہا جاتا ہے۔ کہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے انسان انتہائی کوشش سے کام لیتا ہے۔ کوئی شخص بھاگا جا رہا ہو۔ تو کہتے ہیں۔ وہ اس طرح بھاگا جا رہا ہے۔ گویا اس کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن بڑے آدمیوں کے حالات کا مطالعہ کریں۔ تو ہم دیکھیں گے۔ کہ وہ انتہائی ہمت اور کوشش سے اس وقت کام نہیں لیتے۔ جب انہیں اپنی جان کو بچانے کی فکر ہو۔ بلکہ وہ ایسا اس وقت کرتے ہیں۔ جب وہ اپنا تمام اثاثہ حیات اپنے ملک یا قوم یا رفیقوں کی خاطر قربان کر رہے ہوں۔ سکاٹ اور اس کے رفیق اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ بڑے حوصلہ سے اپنے وطن کی طرف لوٹے۔ مگر اب ان کے دلوں میں نہ وہ قوت تھی۔ نہ ولولہ۔ جو آتے ہوئے ان کے اندر موجزن تھے۔ اس وقت ان کے دلوں میں ایک اُمنگ تھی۔ کہ ہم اپنے ملک اور قوم کے واسطے ایک عزت و افتخار حاصل کریں گے۔

وہ ۱۹ جنوری کو واپس روانہ ہوئے۔ اور شروع سے ہی انکو محسوس ہوا۔ کہ سفر خوفناک طور پر تھکا دینے والا اور غیر دلکش ہے۔ ۲۳ جنوری تک ایونز کی ناک برف سے ماؤف ہو گئی۔ اسکی انگلیوں پر آبلے نکل آئے۔ اور اسکی طبیعت بہت چڑچڑی ہو گئی۔ یہ اچھی علامت نہ تھی۔ طوفان بھی چلنے لگا۔ سکاٹ لکھتا ہے:۔

"مجھے آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ خدا ہم پر رحم کرے۔ مجھے اس بات سے تشویش ہو رہی ہے۔ کہ اوٹس اور ایونز کے اعضا برف سے جلدی

لمو ک

شب عروسی سہاگ رات یا ہنی مون منانے والوں کے لیے
سچی حقیقی یقینی رہنمائے ہدایت کتاب
جدید
لذت النساء
پنجاب لٹریچر کمپنی
لوہاری گیٹ لاہور

ماؤف ہو جاتے ہیں "۔

ڈاکٹر ولسن کو آنکھوں کی تکلیف تھی۔ ۳ فروری کو ایک اور مصیبت کا سامنا ہوا۔ یعنی ولسن کی ٹانگ میں شدید درد ہونے لگا۔ جسے وہ غیر معمولی صبر سے برداشت کرتا رہا۔ مگر سکاٹ کو بہت فکر لاحق ہوا۔ کیونکہ اب تمام کی زندگی کا دارومدار ایک دوسرے کی صحت اور تندرستی پر تھا۔ وہ اپنے کسی ساتھی کو بیمار یا زخمی حالت میں پیچھے چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ سکاٹ لکھتا ہے:۔

" علاوہ ازیں آج رات ایونز کی دو انگلیوں کے ناخن جھڑ گئے۔ اس کے ہاتھوں کی حالت پہلے ہی خراب تھی۔ اور مجھے افسوس ہے۔ کہ وہ اپنی اس حالت کو دیکھ کر جی چھوڑ رہا ہے "۔

اب وہ تین درجہ کے ڈپو پر پہنچ گئے۔ اور تازہ ذخیرہ خوراک لے سکے۔ ۴ فروری کو سکاٹ ایک ڈھلوان سے بری طرح گرا جس سے اس کا کندھا زخمی ہو گیا۔ اب پارٹی میں سے تین آدمی زخمی یا بیمار تھے۔ اور ابھی سفر کا صعب ترین حصہ باقی تھا۔ ۴ فروری کو ایونز دو مرتبہ گرا۔ دوسری مرتبہ سکاٹ بھی اس کے ساتھ برف کے ایک گڑھے میں جا گرا۔ بقول سکاٹ " اس کے بعد ایونز قدرے مخبوط الحواس اور چلنے سے ناقابل ہو گیا۔ اس کے دماغ کو چوٹ آئی تھی۔ اب تمام تر تشویش اسی کی وجہ سے تھی "۔

۷ فروری کو وہ گلیشیر کے بالائی ڈپو پر پہنچے۔ اور چوٹی کا سفر ختم ہوا۔ اس کے بعد پارٹی سے ایک مہلک غلطی ہوئی۔ کہ انہوں نے اپنے سفر کا رخ بدل لیا جس سے رستہ کھو گئے۔ بہزار دقت گلیشیر کے وسطی ڈپو پر ۱۳ فروری کو پہنچے۔ اور خوراک کا تازہ ذخیرہ حاصل کیا۔

ایک رفیق کی دائمی جدائی

پارٹی کے افراد کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ ولسن کو ٹانگ کی تکلیف تھی۔ ایونز کے پاؤں میں آبلے پیدا ہو گئے تھے۔ اور اس کی حالت بدتر ہوتی جاتی تھی۔ وہ دن بدن بالکل لاچار ہو گیا۔ معمولی معمولی عذر پر بار بار ٹھہر جاتا۔ راہ میں اس نے برفستانی جوتا گنوا دیا۔ اور سب سے پیچھے ایک گھنٹہ بعد آہستہ آہستہ خیمہ میں آیا۔ آدھ گھنٹہ کے بعد وہ پھر باہر کو چل دیا۔ سکاٹ نے اسے روکا۔ مگر اس نے خندہ پیشانی سے کہا۔ ابھی آتا ہوں۔ مگر کھانے کا وقت ہو گیا اور وہ نہ لوٹا۔ سب اس کی تلاش کو نکلے۔ سکاٹ سب سے پہلے اس کے پاس پہنچا۔ اور یہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ کہ وہ برف پر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہے۔ اس کے دستانے اتارے ہوئے ہیں۔ اس کی انگلیاں ماؤف ہو چکی ہیں اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی ہے۔ وہ صرف یہی کہہ سکا۔ کہ شاید مجھے غش ہو گیا تھا۔ قبل اس کے کہ اس کو خیمہ میں پہنچائیں۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اور آدھی رات کے قریب اس کا انتقال ہو گیا۔ ایک مختصر سی جماعت کے لئے جو گوناگوں خطروں سے گھری ہوئی ہو۔ ایک دوست اور رفیق کا بچھڑ جانا ایک ہولناک صدمہ تھا۔ مگر گذشتہ ہفتہ کے پیش نظر بھلا اس کے سوا اور امید ہی کیا ہو سکتی تھی۔

اس کے بعد وہ مذبحہ کیمپ پر پہنچے۔ جہاں گھوڑوں کے گوشت کا کافی ذخیرہ تھا۔ اب سکاٹ نے حالات کا جائزہ لیا۔ دیگر حالات امید افزا تھے۔ مگر موسم غیر یقینی تھا۔ اب ان کے پیش نظر ایک ٹن ڈپو کی منزل تھی۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ وہاں پہنچ گئے۔ تو محفوظ ہو جائیں گے۔ کیونکہ وہاں چیری گیرارڈ کتوں کو لئے انتظار کر رہا ہوگا۔ مگر وہاں پہنچنے میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا۔

۲۴ فروری کو مقررہ پروگرام کے مطابق وہ دیوار کے جنوبی ڈپو پر پہنچے۔ مگر یہاں ان کو ایک اور مصیبت کا سامنا ہوا۔ ایندھن کی یکایک قلت ہو گئی۔ جو تیل کی صورت میں محفوظ تھا۔ وہ سردی کی شدت کے سبب کنستروں میں سے ٹپک ٹپک کر ضائع ہو چکا تھا۔ سکاٹ لکھتا ہے:۔

" اب موسم اور مشکلات اور ہماری صحت اور اچھی خوراک کے مابین رسہ کشی ہو رہی ہے "۔

۲ مارچ کو وہ برفانی دیوار کے وسطی ڈپو پر پہنچ گئے۔ یہاں سے حالات ان کے مخالف ہو گئے۔ بچاؤ کی کوئی امید نہ رہی۔ سکاٹ لکھتا ہے:۔

" اول تیل کی سخت قلت ہے۔ دوسرے اوٹس کی حالت بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ تیسرے موسم بے حد خراب ہے۔ رات کو درجہ حرارت منفی چالیس تھا۔ آج صبح صرف موزے پہننے میں ہمیں ڈیڑھ گھنٹہ لگا "۔

اگرچہ حالت بالکل مایوس کن تھی۔ لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ ۳ مارچ کو وہ سوا چار گھنٹے تک گاڑی کھینچتے رہے۔ مگر [illegible] میل کا فاصلہ طے کر سکے۔ سکاٹ رقمطراز ہے:۔

" خدا ہم پر رحم کرے۔ اب ہم گاڑی زیادہ مدت تک نہیں کھینچ سکتے۔ بظاہر ہم خوش و خرم ہیں۔ تاہم جو کچھ ہم میں سے ہر ایک کے دل پر گذر رہی ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں "۔

۵ مارچ کا اندراج اس سے زیادہ مایوسی خیز ہے۔ " ہمارا ایندھن [illegible]

اور چاہیے اوٹس کی حالت نازک ہو گئی ہے۔ ہم راستہ تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ اوٹس گاڑی میں پڑا ہوا ہے۔ مگر اس کا حوصلہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ پاؤں کے درد سے اُسے سخت تکلیف ہے۔ مگر وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ جب ہم خیمے میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ تو تمام وقت ہنسی خوشی میں گزارتے ہیں۔ اور اس مایوس کن حالت میں بھی باتیں کرتے ہیں۔ کہ وطن پہنچ کر کیا کیا کریں گے۔"

۹ مارچ کو وہ ماونٹ ہوپر ڈپو پہنچے۔ اور دیکھا۔ کہ خوراک وغیرہ کا ذخیرہ ہر لحاظ سے کم ہے۔ سکاٹ لکھتا ہے:۔

"میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس مصیبت کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ کتے جو اس وقت مصیبت سے نجات دے سکتے۔ معلوم ہوتا ہے۔ نہیں پہنچ سکے۔"

اس کا خیال درست تھا۔ کتے چیری گیرارڈ کے ماتحت چار دن سے ایک ٹن ڈپو پر طوفان کے باعث رکے پڑے تھے۔ اور جب ان کی خوراک کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ تو وہ لوٹنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ فی الواقعی قصور کسی کا نہ تھا۔ اور سکاٹ کی یہ خوبی کہ وہ الزام کسی کو نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُسے ایک جلیل القدر قائد ثابت کرتی ہے۔

۱۱ مارچ کو روزنامچہ میں یہ اندراج ہے:۔

"معلوم ہوتا ہے۔ کہ اوٹس اب قریب المرگ ہے۔ وہ یا ہم اب کیا کریں گے۔ خدا ہی جانتا ہے۔ آج ناشتہ کے بعد ہم نے اس مسئلہ پر گفتگو کی۔ وہ ایک حوصلہ مند انسان ہے۔ اور صورت حال کو بخوبی سمجھتا ہے پھر بھی اس نے ہم سے مشورہ طلب کیا۔ ہم کیا کہہ سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ اس کو تسلی دیں۔ اور ہمت دلائیں۔ کہ جہاں تک ہو سکے۔ وہ آگے چلے۔ اس گفتگو کے بعد یہ ہوا۔ کہ میں نے ولسن کو ہدایت کی۔ کہ وہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی زندگی ختم کرنے کی دوائی دے۔ تاکہ بوقت ضرورت ہم اس سے کام لے سکیں۔

چنانچہ ہم میں سے ہر ایک کو افیون کی تیس تیس گولیاں مل گئیں۔ اور ولسن کے پاس مارفیا کی صرف ایک ٹیوب رہ گئی۔ یہ ہے ہماری سرگذشت کا تاریک پہلو۔"

اس کے بعد جو حالات تک سکاٹ سے ہو سکا۔ وہ بقیہ حالات کے متعلق مختصر نوٹ لکھتا رہا۔ جن میں سے چند ایک اقتباسات دیئے جاتے ہیں۔

"۱۴ مارچ۔ بدھ۔ ہم سفر کرتے جا رہے ہیں۔ مگر اب ہر کیمپ کا بنانا ہمارے لئے دشوار اور خطرناک ہے۔ اب ہمارا انجام قریب ہے۔ مگر یہ انجام بخیر ہو گا۔ غریب اوٹس کی حالت بہت نازک ہو گئی ہے۔ میں آنے والے کل کا تصور کرتا ہوں۔ تو میرے جسم میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ خیمے کے باہر حالت خوفناک ہے۔ تاہم جب تک ایک بسکٹ بھی ہمارے پاس ہے۔ ہم بڑھے جائیں گے۔"

اوٹس کے آخری لمحات

تین دن بعد کا اندراج ہے:۔ "جمعہ ۱۶ مارچ یا ہفتہ ۱۷ مارچ۔ تاریخوں کا حساب بھول گیا ہوں۔ غالباً آخری تاریخ درست ہے۔ تمام رستہ مصائب کا سامنا رہا۔ پرسوں بیچارہ اوٹس کہنے لگا۔

"اب میں آگے جانے سے معذور ہوں۔ آپ لوگ مجھے یہیں تھیلے میں پڑا چھوڑ جائیں"۔

یہ ہمارے لئے ناممکن تھا۔ چنانچہ چند میل اسے اور ہمراہ لائے۔ مگر یہ سفر نہایت کٹھن تھا۔ اس کی حالت ابتر ہو گئی۔ اور ہم سمجھ گئے۔ کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا۔ یہاں میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ مرتے وقت اوٹس اپنی والدہ کو یاد کرتا تھا۔ اور اس سے کچھ پہلے وہ فخریہ کہتا رہا۔ کہ میری رجمنٹ یہ سنکر خوش ہو گی۔ کہ میں نے کس بہادری سے جان دی ہے ہم گواہی دیتے ہیں۔ کہ وہ بہادر انسان تھا۔ اس نے آخری دم تک حوصلہ نہیں ہارا۔ بہت تکلیف اٹھائی۔ مگر اُف نہ کی۔

کل صبح طوفان بپا تھا۔ وہ اٹھا۔ اور کہنے لگا۔ میں ذرا باہر جاتا ہوں۔ اور شاید مجھے کچھ دیر لگ جائے۔ چنانچہ وہ طوفان میں نکل گیا۔ اور پھر ہم نے اس کو نہیں دیکھا۔ ہم جانتے تھے۔ کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ لیکن اگرچہ ہم نے اس کو روکنے کی کوشش کی۔ ہمیں معلوم تھا۔ کہ یہ ایک بہادر انسان اور شریف انگریز کا طرز عمل ہے۔ ہم سب بھی امید کرتے ہیں۔ کہ اسی طرح دلیری کے ساتھ موت سے دوچار ہوں گے۔ اور یقین ہے۔ کہ وہ اب ہم سے زیادہ دور نہیں۔"

موت واقعی ان سے دور نہ تھی۔ ابھی اگلا ڈپو گیارہ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اور وہ تقریباً بے دم ہو چکے تھے۔ سکاٹ کا دایاں پاؤں ماؤف

ہو چکا تھا۔ دو دن پہلے وہ باقی دونوں رفیقوں سے بہتر حالت میں تھا۔ مگر اب اس کی حالت بھی یکایک خراب ہو گئی۔ ۱۹ مارچ کو یہ لوگ قطب جنوبی سے نسا نویں منزل پر پہنچے۔ اور اب ان کے لئے جائے پناہ صرف گیارہ میل دور تھی۔ مگر یہاں خوفناک طوفان نے ان کو روکے رکھا۔ اس مصیبت میں ولسن اور باورز نے ارادہ کیا۔ کہ آگے جاکر سکاٹ کے واسطے ایندھن لے آئیں۔ مگر طوفان نے ان کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔

موت کے آغوش میں!

۲۲ مارچ کی رات کو موت سامنے کھڑی انکو گھور رہی تھی۔ ان کے پاس ایندھن بالکل نہ تھا۔ اور خوراک صرف دو دن کی تھی۔ سکاٹ لکھتا ہے۔

اب ہمارا انجام بھی قریب ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ ہم طبعی موت مرینگے۔ جہاں تک بن پڑا۔ اگلے ڈپو کی طرف بڑھے جائیں گے۔ اور راہ میں جان دینگے۔

یہ ممکن نہ تھا۔ ۲۹ مارچ تک بھی وہ وہیں پڑے رہے۔ کیونکہ طوفان تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بس جی رہے تھے۔ مگر حوصلہ نہیں ہارتے تھے۔

سکاٹ کا آخری اندراج حسب ذیل تھا۔

روزانہ ہم تیار رہتے ہیں۔ کہ اگلے ڈپو کی طرف روانہ ہوں۔ جو صرف گیارہ میل پر ہے۔ لیکن خیمہ سے باہر نکلتے ہیں۔ تو طوفان کا وہ عالم ہے۔ کہ الاماں۔ اب ہم کسی بہتری کی توقع نہیں کر سکتے۔ تاہم آخر دم تک مقابلہ کئے جائینگے۔ مگر ہم روز بروز کمزور ہو رہے ہیں۔ اور خاتمہ اب دور نہیں۔ نہایت افسوس ہے۔ کہ میں اس سے زیادہ لکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

آر۔ سکاٹ

"خدا کے لئے ہمارے بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔"

جب امدادی پارٹی اس کے آٹھ مہینے بعد انکی تلاش میں وہاں پہنچی۔ تو انہوں نے دیکھا۔ کہ باورز اور ولسن بالکل قدرتی حالت میں پڑے ہیں۔ اپنے اپنے تھیلوں میں بند۔ سکاٹ ان کے بعد فوت ہوا ہوگا۔ اس نے اپنے تھیلے کے بند اور کوٹ کے بٹن کھول رکھے تھے۔ اس کا ایک بازو شفقت کے ساتھ ولسن کے گرد حائل تھا۔ خیمہ کے اندر علاوہ روزنامچے کے سکاٹ نے اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے نام خطوط بھی لکھ رکھے تھے۔ اور پبلک کے نام ایک پیغام تھا۔ جس میں اس تباہی اور اس کے اسباب کا ذکر تھا۔ یہ سب کے سب اسی قابل تعریف جذبہ سے پُر تھے۔ اور اسی غیر متزلزل آواز کے مختلف لہجے۔ پیغام کے آخری الفاظ یہ تھے:۔

"ہم اپنی جانیں اپنے ملک کی خاطر قربان کر رہے ہیں۔ ہم نے فی الحقیقت دنیا کا سب سے طویل سفر کیا ہے۔ اور ہم سب سے پہلے انگریز ہیں۔ جو قطب جنوبی پر پہنچے ہیں۔ آپ لگ بھگ لیں۔ کہ یہاں سردی اس قدر شدید ہے۔ کہ لکھنا محال ہو رہا ہے۔
. . . . . . مجھے مرتے ہوئے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ بلکہ تازہ دم اور تندرست اس دنیا کو خیرباد کہونگا۔ ؎
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم"

(ریاض بی۔ اے)

افسانہ:

شب کو — آپ بیتی

(از قلم گوہر رقم بار محترمہ راحت النساء بیگم صاحبہ۔ چٹا گانگ)

ڈاکٹر جی! ڈاکٹر جی!

میں ایک خاموش رات کو اس پکار کی آواز کو سنکر نیند سے چونک پڑا۔ جب میری آنکھ کھلی۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ وہ ہمارے مالک مکان دکھن بابو تھے نہائیت محبت کے ساتھ میں نے انہیں اندر بلا لیا۔ ایک کرسی ان کے آگے بڑھا دی۔ اور انکو بٹھا کر انکی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ ٹھیک ڈھائی بجے کا وقت تھا۔

دکھن بابو کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اور آنکھیں زیادہ کھلی ہوئی تھیں۔

"آج رات کو بیماری کی علامتیں پھر ظاہر ہونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب! تمہاری دی ہوئی دوائیں کچھ زیادہ نفع بخش ثابت نہ ہوئیں" انہوں نے کہا۔

"مجھے خوف ہے۔ کہ کہیں تم نے پھر شراب پینا تو شروع نہیں کر دیا؟" میں نے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

دکھن بابو کچھ خفا سے نظر آنے لگے۔ میرے اس بیباکانہ سوال پر وہ چند سیکنڈ خاموش رہے پھر کہا۔

"یوں تو تم اچھے عقلمند ہو۔ لیکن خدا جانے اس معاملے میں کیوں بے سمجھ بنتے ہو۔ میری ایسی حالت کی وجہ شراب نہیں ہے۔ تمہیں لازم ہے۔ کہ میری اس کہانی کو شروع سے آخر تک سن لو۔ اور غور سے اچھی طرح سن لو۔ اس کے بعد پھر تم میرے خیال میں تمام معاملات سہولت سے سمجھنے کے قابل ہو جاؤ گے۔"

[illegible] ایک چراغ دھیما جل رہا تھا۔ اسے میں نے درا روشن کر دیا۔ جس سے روشنی کچھ زیادہ ہو گئی۔ لیکن ساتھ ہی دھواں نکلنے لگا۔ اپنی چادر کو کاندھے پر کھینچکر ایک بڑے ٹرنک پر اخبار کا پرانا کاغذ بچھا کر میں ہمہ تن گوش ہو بیٹھا۔

دکھن بابو نے یوں اپنی کہانی شروع کی۔

"کوئی چار سال کا عرصہ ہوا ہوگا۔ جب کہ خود مجھ پر ایک خطرناک مرض کا حملہ ہوا تھا۔ جس سے میری حالت اتنی خراب ہو گئی تھی۔ کہ موت کے بالکل قریب پہنچکر میری بیماری نے پلٹا کھایا تھا۔ اور مرض میں کمی محسوس ہونے لگی۔ اسکے بعد صحت حاصل کرنے میں پورا ایک مہینہ لگ گیا تھا۔

میری بیماری کے ایام میں میری بیوی نے ایک لمحہ کے لئے بھی چین نہ لیا۔ وہ دن رات میری خدمت میں رہنے لگی۔ اس کمزور عورت نے اپنی پوری طاقت سے موت کے قاصد کو بھگانے کی کوشش کی۔ جو کہ میرے قریب آگیا تھا۔ اس کے اوقات بغیر کھائے پیئے گذرنے لگے۔ اسے نہ تو دن کو چین تھا۔ نہ رات کو اطمینان۔ اسے اگر کچھ فکر تھی۔ تو میری تیمارداری کی۔ اور میری صحت کی۔ اور بس! اس نے دنیا کی کسی دوسری چیز کے بارے میں خیال تک نہ کیا۔ وہ ہر وقت میرے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔ ایک زبردست شیر کی طرح اپنے شکار سے دھوکا کھا کر موت مجھے اپنا نوالہ نہ بنا سکی۔ لیکن جاتے ہوئے اس کی ایک تیز جھپٹ سے میری بیوی محفوظ نہ رہ سکی۔

اس کے کچھ روز بعد میری بیوی کے ایک مرا ہوا بچہ پیدا ہوا۔ اب خدمت

کرنے کی میری باری تھی۔

لیکن میری موجودگی میں میری ہی تکلیف کا خیال کر کے وہ بے چینی محسوس کرتی تھی۔ کیونکہ اکثر وہ مجھ سے کہا کرتی "خدا کے لئے تم اس بیمار کے کمرے میں آنے جانے کی تکلیف گوارا نہ کیا کرو"۔

اس کے بخار کے وقت جب میں اس کے کمرے میں جاتا۔ اور اس کے سرہانے بیٹھ کر گرمی کے بہانے سے خود کو پنکھا جھلتے ہوئے اسے بھی پنکھا کرتا۔ تو وہ پریشان ہو جاتی تھی۔ اس کی خدمت کرنے کی وجہ سے میرے کھانے میں اگر دس منٹ کی بھی دیر ہو جاتی۔ تو وہ میرے لئے نوکروں کو پریشان کر دیتی۔ اگر میں اس کا کوئی ادنیٰ سا کام بجا لانے کی کوشش کرتا۔ تو اس کی تاثیر بالکل الٹی ہوا کرتی۔ اور وہ کہہ اٹھتی۔

"ایک مرد کے لئے یہ ڈھنگ اختیار کرنا ٹھیک نہیں"۔

میرے خیال میں میرا باغ والا مکان تم نے دیکھا ہوگا۔ ٹھیک اس کے سامنے ایک باغ ہے۔ جس کے کنارے گنگا بہہ رہی ہے۔ ہمارے آرام کمرے کے بغل میں میری بیوی نے ایک خوبصورت باغ اپنے دل بہلانے کے لئے بنایا تھا۔ اور اسے اس نے حنا کی نازک جھاڑیوں سے گھیر دیا تھا۔ باغ کا وہ حصہ انتہائی خوبصورتی اور سادگی لئے ہوئے تھا۔ بناوٹی خوبصورتی کو اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے بوٹوں میں یاسمین۔ گلاب۔ لیموں اور دوسرے اقسام کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ ایک طرف بوکل کا شاندار درخت تھا۔ جس کے نیچے میری بیوی نے ایک سفید پتھر کا چھوٹا سا چبوترہ شوق سے بنوایا تھا۔ جسے وہ خود دن میں دو مرتبہ دھویا کرتی تھی۔ لیکن یہ اس وقت کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ جب کہ اس کی صحت بالکل اچھی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی۔ جہاں گرمیوں کے موسم میں روزمرہ کے کام ختم کرنے کے بعد شام کے وقت وہ بیٹھنے کی عادی تھی۔ وہاں سے دریا اور اس کے کنارے سے بل کھاتی ہوئی سرخ سڑک اور دریا پر سے گذرنے والے چھوٹے بادبانی جہاز اور کشتیاں بخوبی نظر آتے تھے۔ لیکن وہ خود راہگیروں اور مسافروں کی نگاہ سے پوشیدہ رہتی تھی۔

گرمیوں کے دنوں میں ایک رات کو جب کہ چاند اپنی نفیس روشنی سے دنیا کو منور کر رہا تھا۔ اپنی طویل بیماری سے نیم صحتیاب ہونے پر اس نے اپنے کمرے سے نکل کر اپنے خوبصورت باغ میں بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے نہایت احتیاط سے اسے اٹھایا۔ اور اس پتھریلے سفید چبوترے پر لا کر آہستگی سے لٹا دیا۔ جو کہ بوکل کے سائے میں تھا۔

پھول بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکوں سے گرنے لگے۔ اور سر پر پھیلے ہوئے ڈالیوں کے اندر سے چاند کی روشنی چھن چھن کر میری بیوی کے زرد اور مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ہر طرف ایک سکون اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس سایہ دار دھندلی رات کو میں اس کے قریب بیٹھا ہوا اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف سے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔

میرے اوپر اس خوبصورت منظر کا از حد اثر ہوا۔ میں آہستگی سے اپنی بیوی کے اور بھی قریب آ گیا۔ اس کا ایک کمزور ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش نہ کی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میرا دل بھر آیا۔ اور میں نے کہا۔

"میں کبھی تم کو بھول نہ سکوں گا"

میری بیوی زیر لب مسکرائی۔ یہ ہنسی غیر ارادی بھی تھی۔ اور طعنہ زنی کا رنگ بھی لئے ہوئے۔ اس نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ بلکہ مسکراہٹ کے ذریعے مجھے یہ سمجھانا چاہا۔ کہ اس کے خیال میں یہ بات ناممکن ہے۔ اور خود اس کی بھی یہ خواہش نہیں۔

اس کی غیر حاضری میں اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے اور اس سے محبت جتانے کا جس قدر تصور کرتا۔ اس کے سامنے آتے ہی وہ تمام باتیں کہنے کی قوت سلب ہو جاتی۔ اور میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکتا۔ اگر تم پر کوئی کسی قسم کا اعتراض کرے۔ تو بحث کر سکتے ہو لیکن اگر کوئی تمہارا مذاق اڑا دے۔ تو شاید تم ایک لفظ بھی نہ کہہ سکو گے۔

ہر قسم کا مسلسل علاج کرنے سے بھی میری بیوی کی صحت میں کوئی [illegible] ترقی ظہور پذیر نہ ہوئی۔ ڈاکٹر نے تبدیل آب و ہوا کی صلاح دی۔ اس لئے میں اسے یہاں الٰہ آباد میں لے آیا۔

یہاں تک بیان کر کے دکھن بابو اچانک رک گئے۔ اور کچھ [illegible] لئے خاموش ہو گئے۔ ایک تجسس نگاہ انہوں نے مجھ پر ڈالی۔ پھر کچھ تھکاوٹ اور افسردگی سے انہوں نے اپنے سر کو [illegible] پر ٹیک لیا۔ طاق پر رکھا ہوا چراغ پھڑپھڑا رہا تھا۔

[...] سناٹے میں مجھے اس کی ہانپنے کی آہٹ زیادہ سنائی دینے لگی تھی۔
یکایک دکھی ہو کے خاموشی توڑی۔ اور کہانی کا سلسلہ شروع کیا۔
ڈاکٹر ہرن میری بیوی کے معالج تھے۔ کچھ دنوں بعد ہی انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اس بیماری نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے۔ جس میں شفا کی امید بالکل نہیں۔ اور شاید اس کی تکالیف کا خاتمہ اس کی زندگی کے خاتمے کے ساتھ ہو۔

آخرکار ایک روز میری بیوی نے مجھ سے کہا۔
"جب کہ میری بیماری میرا پیچھا چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اور میری صحت کی بھی چنداں امید نہیں۔ موت بھی مجھ سے بھاگنا چاہتی ہے۔ تو پھر ایسی حالت میں تم کیوں اپنے اوقات ایک مردہ کے ساتھ بسر کر رہے ہو۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔ کہ مجھے میری حالت پر چھوڑ کر اپنے دوسرے مشاغل کی طرف متوجہ ہو جاؤ؟"

اب میرے بولنے کا وقت تھا۔ لیکن اس کی میری بیوی میں طاقت نہ تھی۔ جیساکہ رومانس کے ایک ہیرو کو لازم ہوتا ہے۔ وہ تمام باتیں پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اس طرح سے کہا:۔
"جتنے دنوں میرے جسم میں روح ہے . . . .
اس نے فوراً روک دیا۔ اور کہا ۔
"خیر ٹھہرو۔ اب تمہیں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آخر کیوں؟ یہ بھی کوئی بات ہے"۔

مجھے خبر نہیں۔ کہ اس وقت میری فطرت نے یہ بات مانی یا نہیں لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں۔ کہ واقعی میں اس کی خدمت سے عاجز آ گیا تھا۔ اور خواہشمند کہ اس مریضہ کی خدمت سے جیسے شفا کی کوئی بھی امید نہ ہو۔

یہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کہ اب اس نے میری دلی تھکاوٹ کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس وقت اگرچہ میں سمجھ نہ سکا۔ لیکن اب مجھ کو ذرا بھی شک نہیں۔ کہ اس نے میری کیفیت کو ان آسان جملوں کی طرح پڑھ لیا جو بچوں کی پہلی کتاب میں ہوا کرتے ہیں۔ اور جو کہ مشکل الفاظ سے [...] ہیں۔

ڈاکٹر ہرن [...] جانتے تھے۔ میں ان کے گھر کا ایک قدیمی تعلق دار تھا۔ میری آمدورفت شروع ہونے کے کچھ روز بعد انہوں نے اپنی لڑکی سے میری ملاقات کرادی۔ اگرچہ اس کی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی۔ لیکن وہ نہایت ہی ہوشیار اور سمجھدار معلوم ہوتی تھی۔ ابھی وہ ناکتخدا تھی۔ اس کے والد کہتے تھے۔ کہ انہیں کوئی لائق لڑکا نہ ملا۔ اس لئے اس کی شادی میں دیر ہو رہی ہے۔ لیکن باہر یہ افواہ تھی۔ کہ اس کی پیدائش میں کچھ نحوست پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کی شادی اب تک نہ ہو سکی۔

لیکن اور کوئی عیب اس میں دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ جسقدر تعلیم یافتہ اور عقلمند تھی۔ اسی قدر خوبصورت بھی تھی۔ اکثر میں اس سے ہر قسم کے معاملات پر بحث کیا کرتا تھا۔ اور دیر تک اس سے تعلیم وغیرہ کے بارے میں گفتگو کرتا۔ اس وجہ سے کبھی کبھی میری واپسی میں بہت دیر ہو جایا کرتی۔ اور اکثر اوقات اس قدر دیر ہوتی۔ کہ مریضہ کو دوا پلانے کا وقت بھی گذر جاتا۔ اسے خوب معلوم تھا۔ کہ میں ڈاکٹر ہرن کے یہاں جاتا ہوں۔ لیکن پھر بھی اس نے کبھی میرے دیر سے آنے کی وجہ دریافت نہ کی۔

مریض کا کمرہ اب میرے لئے ایک ناقابل برداشت جگہ تھی۔ جہاں میرے لئے ذرہ بھر دلچسپی نہ تھی۔ اور اب میں اسے ٹھیک وقت پر دوا دینے میں بھی غفلت کرنے لگا تھا۔ اور اکثر تو میں بالکل بھول جاتا۔
کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب مجھ سے کہا کرتے۔
"وہ بیمار جو کہ ایک نہ ختم ہونے والے دکھ کی ناقابل برداشت تکلیف اٹھا رہے ہوں۔ ان کے آرام کا ذریعہ صرف موت ہے اور بس۔ کیونکہ جب تک ان کی زندگی ہے، انہیں کسی قسم کی مسرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ہمدردوں کے لئے ایک بار گراں ہو جاتی ہے"۔
کسی دوسرے مریض کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے۔ تو وہ ایک حد تک سننے کے قابل ہو سکتے تھے۔ لیکن میری بیوی کی مثال میرے پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں ایسا کہنا لازم نہ تھا۔
ایک روز میں نے اپنی بیوی کو ڈاکٹر سے یہ کہتے ہوئے سنا:۔
"ڈاکٹر! تم کیوں آخر مجھے اتنی بے فائدہ دوائیں دیئے جا رہے ہو جب کہ میری زندگی ایک مرض بن گئی ہے۔ تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔ کہ بجائے صحتیابی کی کوشش کے میری دکھ سے بھری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

اور "تمہیں ایسا کہنا نہیں چاہیئے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

ڈاکٹر کے جاتے ہی میں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے سرہانے بیٹھ کر میں اس کی پیشانی کو آہستہ آہستہ سہلایا۔ اس نے کہا۔

"کمرہ بہت گرم ہے۔ تم تھوڑی دیر کے لئے شام کی ہواخوری کو باہر نکل جاؤ۔ اس کمرے میں بیٹھے رہے۔ تو رات کا کھانا تم سے کھایا نہ جائے گا۔"

شام کی ہواخوری کا مطلب ڈاکٹر مرن کے یہاں جانا تھا۔ میں نے کئی روز پہلے خود بھی اسے سمجھا دیا تھا۔ کہ صحت اور بھوک کے لئے تھوڑی سی ہواخوری کی کس قدر ضرورت ہے؟

اس میں شک نہیں کہ میرے بہانے کو وہ خوب سمجھ لیتی تھی۔ لیکن میں اب تک سمجھا ہوا تھا۔ کہ وہ میرے دھوکے میں ہے۔ اور یہ میری بیوقوفی تھی۔

یہاں تک بیان کرنے کے بعد وکسی بابو رک گئے۔ ایک سرد آہ کھینچی۔ جیسے ان کا دل صدمے سے بھرا ہوا ہے۔ ذرا دیر وہ چپ رہے پھر کہا "مہربانی کرکے مجھے ایک گلاس پانی دلوادو۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے"

پانی پینے کے بعد انہوں نے پھر اپنا قصہ شروع کیا۔

"ایک روز ڈاکٹر کی لڑکی منوریا نے میری بیوی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کیوں۔ کچھ بھی ہو۔ لیکن مجھے اس کی درخواست پسند نہ آئی۔ لیکن کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ میں اسے روکتا۔ آخرکار ایک روز وہ میرے گھر پہنچ ہی گئی۔

اتفاق کی بات ہے۔ کہ اس روز میری بیوی کی تکلیف میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ اور وہ معمول سے زیادہ بے چین نظر آرہی تھی۔ جب اس کی بیماری بڑھ جاتی۔ تو وہ بالکل خاموش لیٹ جایا کرتی تھی۔ اور اکثر تکلیف کی وجہ سے زور سے مٹھیاں بند کر لیتی۔ جو کوئی بھی اس وقت اسے دیکھتا۔ آسانی سے سمجھ سکتا۔ کہ وہ کیسے سخت کرب میں مبتلا ہے۔

کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ اور میں چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے ہواخوری کے لئے باہر جانے کو مجبور نہ کیا۔ غالباً اس کی کمزوری نے اسے کچھ کہنے کی اجازت نہ دی ہوگی۔ یا وہ اپنی انتہائی تکلیف میں مجھے قریب پاکر کچھ سکون محسوس کر رہی ہو۔ اس وقت لیمپ کمرے کے پاس رکھا ہوا تھا۔ جسے میں نے بالکل دھیما کر دیا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں مریضہ کو تکلیف محسوس نہ ہو۔ اس لئے کمرہ قدرے اندھیرا معلوم ہوتا تھا۔ صرف ایک ہی آواز رہ رہ کر سنائی دیتی تھی۔ اور وہ میری بیوی کے کراہنے اور آہ بھرنے کی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ انتہائی کرب میں مبتلا ہے۔

یہ وہی وقت تھا۔ جب کہ منوریا آئی تھی۔ اور دروازے پر کھڑی تھی۔ لیمپ ٹھیک اس کے مقابل رکھا تھا۔ جس کی روشنی اچھی طرح اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

میری بیوی نے انتہائی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اور میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر پوچھا۔

"وہ کون ہے؟"

اپنی کمزور و ناتوان حالت میں ایک اجنبی عورت کو یوں دروازے پر کھڑا دیکھ کر متعجب ہونے کے علاوہ وہ مبہوت سی ہو گئی۔ اس نے کئی بار پوچھا "وہ کون ہے۔ وہ کون ہے" آخر کچھ تو بتاؤ۔ کہ وہ کون ہے؟

پہلے میں نے ذرا سستی سے جواب دیا "مجھے خبر نہیں" لیکن دوسرے ہی لمحہ میں مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ کسی نے میرے دل و دماغ میں ایک زلزلہ سا ہچکولا دیا۔ میں نے فوراً اپنے کو مستعد کرکے کہا۔

"کیوں تمہیں خبر نہیں یہ ہمارے ڈاکٹر کی صاحبزادی ہیں"۔

میری بیوی نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ مجھے بہت نہ پڑتی تھی۔ کہ اس سے آنکھیں چار کرتا۔ وہ یکایک اجنبی کی طرف مڑی۔

"اندر آجاؤ"۔ اس نے نہایت خفیف آواز میں کہا۔ پھر اس نے مجھ سے روشنی قریب لانے کو کہا۔

منورما کمرے میں داخل ہوئی۔ اور مختصر دو چار باتیں میری بیوی سے کیں۔ ابھی وہ بات کا جواب دینے نہ پائی تھی کہ ڈاکٹر بھی اپنے مریض دیکھنے کو آپہنچے۔ وہ اپنے ساتھ دوائی کی دو بوتلیں لیتے ہوئے آئے تھے۔

انہوں نے میری بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔

دیکھو۔ یہ نیلی بوتل والی دوا باہر مالش کے لئے ہے۔ اور دوسری

دوا پھینک دے۔ ہوشیاری سے استعمال کرنا۔ ایسا نہ ہو۔ کہ غلطی ہو جائے۔ کیونکہ یہ پالش سم قاتل ہے۔"

مجھے بھی ساتھ ہی خبردار کرتے ہوئے انہوں نے دونوں شیشیاں قریب کے ایک میز پر رکھ دیں۔ اور چلتے ہوئے انہوں نے اپنی لڑکی کو آواز دی۔

"میں کیوں نہ یہاں ٹھہر جاؤں بابا جی؟" منیرہ نے پوچھا۔ "مریض کی خدمت کو کوئی خادمہ وغیرہ نہیں ہے۔"

میری بیوی یہ سنکر سخت متردد ہوگئی۔ اور ایک دم یہ کہتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

"نہیں نہیں۔ تمہیں تکلیف کرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ میرے پاس ایک پرانی بوڑھی خادمہ ہے۔ جو کہ میری ماں کی طرح ہمدردی سے میری خدمت کرتی ہے۔"

ڈاکٹر جیسے ہی لڑکی کے ساتھ جانے کو مستعد ہوا۔ میری بیوی یوں اس سے مخاطب ہوئی۔

"ڈاکٹر جی! یہ بہت دیر سے اس بند کمرے میں بیٹھے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔ کہ تم انہیں تھوڑی دیر کے لئے باہر کی تازہ ہوا میں لے جاؤ۔"

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا۔

"آجاؤ" اس نے کہا۔ "میں تمہیں دریا کے کنارے کنارے سیر کرالاؤں گا۔ ایک دو بار انکار کرکے آخر میں راضی ہوگیا۔

اس شب کا کھانا میں نے ڈاکٹر صاحب کے ہاں کھایا۔ اور بدستور میری واپسی میں کافی دیر ہوگئی۔ میں نے آکر دیکھا۔ کہ میری بیوی کسی غیر معمولی نئی تکلیف میں مبتلا ہے۔ سخت ندامت محسوس کرتے ہوئے میں نے دریافت کیا۔

"تمہاری طبیعت زیادہ خراب معلوم ہو رہی ہے۔ کیا درد میں اضافہ ہوگیا ہے؟"

لیکن اس میں اس قدر طاقت بھی نہ تھی۔ کہ وہ جواب دیتی۔ میں نے دیکھا کہ وہ میرے چہرے کو تک رہی ہے۔ سانس لینا اس کے لئے مشکل تھا۔

میں نے ڈاکٹر کے لئے آدمی دوڑایا۔

پہلے ڈاکٹر تصفیہ نہ کرسکا۔ کہ اس نئی تکلیف کا سبب کیا ہے؟ آخر اس نے پوچھا۔

"درد بڑھ گئی ہے۔ کیا تم نے وہ دوا استعمال نہیں کی؟"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے نیلے رنگ کی شیشی ہاتھ میں اٹھائی۔

آہ! وہ خالی تھی۔

انتہائی تردد کے ساتھ انہوں نے پوچھا۔

"کہیں غلطی سے تم نے یہ دوا تو نہیں پی لی؟"

خاموشی سے مریض نے سر کو ہلا کر اشارے سے اثبات میں جواب دیا کہ ہاں اس نے پیا ہے۔

ڈاکٹر تیزی سے کچھ لیمپ اور آلات لانے کو اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ اور میں بے حس ہو کر کھونے پر گر پڑا۔

ایک سچا دوست جس طرح اپنے مایوس ساتھی کو تسکین دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح میری بیوی نے اپنے سینے کے قریب میرا سر آہستگی سے کھینچکر نہایت نرمی سے اس پر ہاتھ پھیرا۔ اور نہایت محبت بھرے لہجے میں کہا۔

میرے مالک۔ افسردہ نہ ہو جیئے۔ ہر کام میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ بھلائی ہی دکھائی دیتی ہے۔ میرے بعد تم ضرور مسرور ہو گے۔ اور یہی خیال کرتے ہوئے میں مسرت و اطمینان سے دم توڑ رہی ہوں۔"

اسی وقت ڈاکٹر واپس آ گئے۔ لیکن میری بیوی کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ جانبر نہ ہو سکی۔ اور آخرکار چند منٹوں میں اس کی تمام تکالیف کا خاتمہ اس کی جان کے ساتھ ہو گیا۔

دکھن بابو نے پھر ایک بار پانی پیا۔

"آہ!" انہوں نے کہا "گرمی بے انتہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دفعہ برآمدے میں نکل گئے۔ اور تھوڑی دیر تک ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اندر آ گئے۔ اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر بقایا واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ اگرچہ یہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کہ جو کچھ انہوں نے اب تک کہہ ڈالا ہے۔ بلا ارادہ کہا ہے۔ اور اب کچھ زیادہ کہنا بھی مناسب نہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی جادو یا غیر معمولی

طاقت ان کی زبان سے یہ قصہ بیان کرا رہی تھی۔

وہ کہنے لگے:۔

"منورما کے ساتھ میری شادی ہونے کے بعد جب کبھی میں اس سے جوش وخروش اور بے تکلفی سے باتیں کرنے کی خواہش کرتا۔ تو وہ بہت ہی سنجیدہ نظر آتی۔ میں نے غور کیا۔ کہ اس کے دماغ میں کچھ ایسے پُراسرار شکوک میری طرف سے جگہ لئے ہوئے ہیں۔ جو کہ میں اب تک سمجھ نہ سکا تھا۔

ان دنوں مجھے آہستہ آہستہ شراب پینے کی لت پڑ گئی تھی۔

موسم خزاں کے آغاز کی ایک شام کو میں منورما کے ساتھ دریا کے کنارے باغ میں ٹہل رہا تھا۔ رات کی تاریکی بہیں رہا۔ دن طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ چاروں طرف سناٹا اور ہُو کا عالم تھا کہ کسی پرندے کے پر مارنے تک کی آواز صاف سنائی دے سکتی تھی۔ ہم درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تک محسوس کرتے تھے۔ جو ہوا کے اثر سے ہلنے لگتے تھے۔

منورما آخر تھک کر اس پتھر کے چبوترے پر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔ اور میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

وہاں خوفناک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور آسمان کا ٹکڑا جو ہمارے اوپر ایک سائبان کی طرح تھا۔ تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ جھینگروں کی آواز درختوں کے جھرمٹ کو چھیدتی ہوئی انتہائی دور سے سنائی دے رہی تھی۔

میں نے تھوڑی سی شراب پی تھی۔

کچھ دیر بعد جب میں اس گھٹاٹوپ اندھیرے سے ایک حد تک مانوس ہو چلا تھا۔ اس وقت بھورے رنگ کے ڈھیلے لباس میں ملبوس منورما کے خاموش مجسمے نے جو کہ درختوں کے سائے کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ میرے دماغ میں ایک کشش اور تمنا سی پیدا کردی۔ وہ میری نگاہوں میں ایک ایسے پرچھائیں کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ جسے میں اپنے بازوؤں سے پکڑنے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔

یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ تمام درختوں کے سرے میں کسی نے آگ لگا دی ہے۔ میں نے اوپر نظر اٹھائی۔

سنہری رنگ کا پرانا چاند درختوں کے پیچھے سے اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ چاند کی روشنی منورما کے چہرے پر پڑی۔ جو کہ بھورے رنگ کے لباس میں اس چبوترے پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں اضطراری طور پر اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے بالکل قریب جا کر میں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"منورما۔ شاید تم میری بات کا اعتبار نہ کرو۔ لیکن یاد رکھو۔ کہ میں کبھی تمہاری محبت کو بھول نہ سکوں گا۔ جیسے ہی میری زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ میں حیرت سے چونک پڑا۔ مجھے یاد آگیا کہ میں نے اس سے پہلے بھی کسی دوسری عورت کے روبرو یہی الفاظ استعمال کئے تھے۔ ساتھ میں یہ دیکھ کر کانپ اٹھا۔ کہ درختوں کی اونچی شاخوں پر سے۔ چاند کی سنہری روشنی کے درمیان سے۔ دوسری طرف کھلی فضا سے۔ ایک قہقہے کی آواز ہمارے سر پر سے ہوتی ہوئی گذر گئی۔ ہا! ہاہا! ہاہا!

جسکے بعد دل کو لرزا دینے والی ایک آواز تھی۔ یا آسمان کو ہلا دینے والی پکار۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ ضرور یاد ہے۔ کہ اس آواز کو سنتے ہی میں زمین پر گر پڑا۔ اور پھر مجھے کچھ خبر نہ رہی۔ جب میرے ہوش وحواس درست ہوئے۔ تو میں نے اپنے کو کمرے میں بچھونے پر لیٹا ہوا پایا۔ میری بیوی منورما نے مجھ سے دریافت کیا۔

"کیا ہوا تھا آخر تمہیں۔ کیا؟"

"کیا تم نے سنا نہیں تھا"؟ میں نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔ اس دل ہلا دینے والی قہقہے کی آواز کو ہا! ہاہا! جس سے تمام آسمان گونج اٹھا تھا؟"

میری بیوی ہنسنے لگی۔ "قہقہہ؟ تم بھی کس قدر ڈرپوک ہو۔ میں نے تو صرف چڑیوں کے ایک جھنڈ کو دیکھا۔ جو کہ ہمارے سر کے اوپر سے اُڑتی ہوئی جا رہی تھی۔"

دوسرے دن میں نے سُنا۔ کہ واقعی وہ کوئی آواز نہ تھی۔ جو کہ میں نے سُنی تھی۔ بلکہ راج ہنس کا ایک جھنڈ تھا۔ جو کہ موسم کی تبدیلی کی وجہ سے جگہ تبدیل کرنے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہا تھا۔

لیکن شام ہوتے ہی پھر شک وشبہ نے میرے دل میں جگہ لی۔ مجھے معلوم ہونے لگا۔ کہ سارا آسمان قہقہے کی آواز سے گونج رہا ہے جو کہ اندھیرے کو چھیدتی ہوئی آرہی ہیں۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ شام ہونے کے بعد مجھے منورما کے ساتھ ایک قدم چلنے کی بھی طاقت نہیں رہتی تھی۔

آخرکار میں نے اس باغ والے ریستان کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور منورما کو ساتھ لے کر صحرائی سفر کرنے کی غرض سے روانہ ہوا۔

نومبر کی تیز اور خنک ہوا نے اور موسم کی خوشگواری نے میرے دل سے ایک حد تک خوف و ہراس کو دور کر دیا تھا۔ اور کچھ روز کے لئے میں کافی مسرور تھا۔

مشہور ندی گنگا کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اور دریائے کھری پار ہو کر آخرکار ہم چولستان میں پہنچے۔ یہ بیابان اپنے بازوؤں کو ایک عالیشان سانپ کی طرح پھیلائے ہوئے جاڑے کی گہری نیند میں مصروف تھا۔ اس کی طرف کسی قسم کی فصل نہ ہونے والی زمین تھی۔ جسے سنسان ریگستان کہنا چاہیئے۔ جس کے چھوٹے چھوٹے ذرے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

اور پچھم کی طرف اونچے کناروں پر آم کے درختوں کے جھنڈ اس ویرانی ویرانے بالکل دائیں پڑتے تھے۔ اسی ویرانے سے ہیکل ندی کے کنارے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو کر کبھی کبھی اسی ایک ہیبت ناک کرشمے سے زمین کے ایک بڑے ٹکڑے کو توڑ کر اپنے میں ملا لیتی تھی۔

ہم نے ایک آرام دہ جگہ دیکھ کر کنارے کے قریب ہی لنگر ڈال دیا ایک دن کا واقعہ ہے۔ کہ ہم ٹہلتے ہوئے اپنی کشتی سے کافی دور نکل گئے تھے۔ غروب شدہ آفتاب کی سنہری روشنی دفعتہً مرجھا گئی۔ اور آسمان ماہتاب کی روپہلی چاندنی کے سیلاب سے منور ہو گیا۔ چاند کی روشنی اس لامحدود پھیلے ہوئے ریگستانوں پر چھا گئی تھی۔ اور نیلگوں آسمان بھی چاندنی کے سیلاب میں اور بھی زیادہ چمک اٹھا تھا۔

آہ! میرا دل اپنی زندگی میں ایک دفعہ پھر درد سے بھر گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہم دونوں گویا دنیا میں تنہا ہی پیدا کئے گئے ہیں ہم اس سنسان لامحدود خواب و خیال کی بستی میں بغیر کسی خاص خواہش کے آوارہ گردی میں مصروف ہیں۔

منورما نے ایک سرخ شال پہن رکھی تھی۔ جس کو اس نے آہستگی سے اپنے کندھوں کے گرد لپیٹ لیا۔ اب صرف اس کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

سناٹا اور خاموشی اور بھی بڑھتی گئی۔ ہمارے چاروں طرف سوائے ایک زبردست سناٹے کے اور کچھ نہ تھا۔ جس میں چاند کی ہلکی روشنی ملی ہوئی تھی۔ ٹھیک اس وقت منورما نے اپنا ایک ہاتھ آہستگی سے بڑھا کر میرے ہاتھ میں دیا۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی۔ کہ میں نے محسوس کیا۔ گویا اس نے اپنی جوانی۔ اپنا دل و دماغ اور اپنا جسم اور اپنی زندگی غرضیکہ سب کچھ میرے سپرد کر دیا ہے۔ میری تمناؤں سے بھرے ہوئے مسرور دل میں اس کی محبت از سر نو چٹکیاں لینے لگی۔

"کیا دو محبت بھرے دل دنیا میں، اس کھلے آسمان کے نیچے ایسا وسیع خطہ بھی پا سکتے ہیں۔ جہاں وہ آزادی اور مسرت سے گھوم پھر سکیں"۔

اس مسرت کی گھڑی میں میرا دل بار بار یہ چاہتا تھا۔ کہ ہم کبھی واپس نہ جائیں۔ بلکہ برابر اسی طرح صحرا نوردی کرتے ہوئے چلتے رہیں۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے محبت بھری باتیں کرتے ہوئے ہر قسم کے تکلفات و فکروں سے آزاد۔ اور نہ ختم ہونے والی دنیا میں چلتے رہیں۔

ہم چلتے چلتے آخرکار ایک جھرنے (آبشار) کے کنارے پہنچے۔ جو کہ بالو کے ٹیلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ماہتاب کی ایک تیز کرن ایک چمکیلی تلوار کی طرح یوں اس شفاف پانی پر تیر رہی تھی۔ گویا وہ اس کے دل کو چھیدتی ہوئی گذر رہی ہے۔

اسی جھرنے کے کنارے پہنچ کر ہم چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ اور منورما نے اپنی خاموش نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کا شال اس کے شانوں پر سے سرک گیا تھا۔ وہ حسن کی دیوی دکھائی دیتی تھی۔ مجھ میں اور برداشت کی تاب نہ رہی۔ اور میں نے جھک کر اس کے نرم رخسار پر بوسہ دیا۔ ٹھیک اسی وقت اس خاموش ریگستان کے کنارے سے ایک آواز دفعتہً تین دفعہ کہتی ہوئی سنائی دی۔

"وہ کون ہے۔ وہ کون ہے۔ وہ کون ہے"

میں چونک پڑا۔ اور میری بیوی بھی خوف سے کانپ اٹھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میں ہمیں یقین آ گیا۔ کہ یہ کوئی انسانی آواز نہ تھی۔ بلکہ کسی آبی پرندے کی آواز تھی۔ جو کہ غالباً دو اجنبی انسانی آوازوں کو سن کر اپنی نیند سے چونک پڑا تھا۔

ہوش و حواس کے بجا ہوتے ہی ہم فوراً واپس لوٹے۔ اور جس قدر جلد ممکن ہو سکتا تھا۔ اپنی کشتی پر جا پہنچے۔ چونکہ کافی رات گذر چکی تھی۔ اس لئے ہم اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ اور جلد ہی بے خبر سو گئے۔

دفعتہً گہری نیند میں میں نے دیکھا۔ کہ تاریکی میں کوئی میرے پلنگ کے قریب کھڑا اپنی ایک نحیف انگلی سے خواب راحت میں مصروف منورما کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بار بار مگر نہایت آہستگی سے پوچھ رہا ہے۔

"وہ کون ہے۔ وہ کون ہے۔ وہ کون ہے"

میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور فوراً دیا سلائی جلا کر لیمپ روشن کیا۔ میں نے دیکھا۔ کہ مسہری ہوا سے ہل رہی ہے۔ اور ہماری کشتی ہچکولے کھا رہی ہے میری رگوں میں خون جم گیا۔ اور میرے جسم پر موٹے موٹے پسینہ کے قطرے بہنے لگے۔ میں نے پھر ایک قہقہہ کی آواز سنی۔

ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا

جو کہ اس گہری تاریکی میں گونج رہا تھا۔ یہ آواز دریا کی مسافت کو طے کرتی ہوئی ریگستان کے اس پار سے گذرتی ہوئی خواب راحت میں مست ملکوں گاؤں اور شہروں پر سے سرسراتی ہوئی یوں آ رہی تھی۔ گویا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کسی دوسری دنیا سے برابر چلی آ رہی ہے۔ رفتہ رفتہ آواز کم ہوتی گئی۔ اور ایسی کم سنائی دینے لگی۔ جیسے ایک سوئی کی نوک کی آواز ہو۔ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسی دل کو چھیدنے والی آواز نہ سنی تھی۔ یہ ایک ایسی غیر معمولی آواز تھی۔ جس کا تصور بھی میں اپنے دماغ میں لا نہ سکتا تھا۔

میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ میرے دماغ میں یہ آواز اپنی جگہ پیدا کر چکی ہے اور اب کسی طرح نکل ہی نہیں سکتی۔ خواہ وہ آواز مجھ سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو جائے۔ آخرکار وہ آواز میرے لئے اس قدر تکلیف دہ اور ناقابل برداشت ہو گئی۔ کہ میں نے خیال کیا۔ جب تک اس روشنی کو بجھا نہ دوں۔ سو نہ سکونگا میں نے اٹھ کر روشنی بجھا دی۔ جیسے ہی میں تکیہ پر لیٹا۔ دوبارہ مجھے معلوم ہوا۔ کہ میری مسہری کے بالکل قریب اندھیرے میں آہستہ آہستہ کوئی کہہ رہا ہے۔

"وہ کون ہے۔ وہ کون ہے۔ وہ کون ہے"

اس کے بعد تو ایسا ہوا۔ کہ خود میرے دل و دماغ نے اسی سوال کو دہرانا شروع کیا۔ کہ

"وہ کون ہے۔ وہ کون ہے۔ وہ کون ہے"

رات کی خاموشی میں مجھے معلوم ہوا۔ کہ میری گھڑی کی سوئی بھی منورما کی طرف اشارہ کر کے پوچھ رہی ہے۔

"وہ کون ہے۔ وہ کون ہے۔ وہ کون ہے"

کہانی بیان کرتے کرتے اب دکھن بابو کے چہرے پر ایک زردی چھا گئی تھی۔ اور ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ کہ ان کے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔

میں نے جلدی سے ان کا شانہ ہلایا۔ اور کہا۔ "ذرا سا پانی پی لو"۔

اسی وقت لیمپ ایک دم بھڑک کر بجھ گیا۔ تو باہر صبح کی ہلکی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ایک کوا چلاتا ہوا گذر گیا۔ اور ساتھ ہی ایک ننھی چڑیا کی سیٹی سنائی دی۔ راستہ پر میرے گھر کے سامنے میں نے ایک بیل گاڑی کے پہیے کی آواز سنی۔ دکھن بابو کے چہرے پر اب تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ اور اب اس میں کوئی خوف کے آثار نہ تھے۔

ایک خیالی خوف کے خمار میں مخمور ہو کر اور شب کے سحر سے مسحور ہو کر انہوں نے اپنی کہانی بلا ارادہ مجھے سنا دی۔ اب اپنی اس حرکت پر وہ مجھ سے شرمندہ نظر آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ خفگی کے آثار بھی ان کے چہرے پر نمایاں تھے۔

وہ کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور رخصت ہونے کے بارے میں بغیر کچھ کہے نہایت عجلت کے ساتھ وہ مکان سے نکل گئے۔

(ترجمہ ٹیگور) (راحت آرا بیگم)

شاعری کے تخیلات پر ناقدانہ تبسم

(از جناب عطاء الرحمٰن خان صاحب عطاؔ بی اے علیگ)

ہر زبان کا لٹریچر اہل زبان کے تمدن کا مرقع ہوتا ہے۔ شاعر تمدن اور ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور انہیں کے تحت وہ شعر کہتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو ہم چھپا نہیں سکتا۔ کہ ہر نوآموز شاعر ماحول اور تمدن۔ مشاہدات اور جذبات سے کم و بیش ٹھنا اور علیحدہ رہ کر شعرائے قدیم کے کلام کے بیان کردہ تخیلات کا اتباع کرنا چاہتا ہے۔ شدہ شدہ انہیں کی پیروی کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور طبع رواں منظوم کرتا رہتا ہے۔ ذہنیت سامعین و قارئین کلام کی بھی کم و بیش یہی حالت ہے۔ کہ وہ اس بات پر تلے بیٹھے ہیں۔ کہ ہم کسی ایسے تخیل کو جو قدامت و فرسودگی سے معرا ہو۔ قابل توجہ ہی نہ سمجھیں گے۔ یعنی شعر کے محرکات غلط و غیر واجب! اثر و حسیات سفلی و سوقی قسمت سے بکسوٹی بھی غلط! اور تعجب ہے۔ کہ ہم اس کو پھر نوازنے سر دھن بھی بیٹھے کی سعی بیجا فرماتے ہیں۔ اور شاید سمجھ بھی جاتے ہیں۔ اپنی۔ باں کی شاعری کے چند مسلمات کو پیش کرنے سے پہلے یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ شاعری کن شعبہ جات حیات انسانی پر مشتمل ہے۔

(۱) انسان اور مذہب یا روحانیت۔ اس میں اردو شاعری کسقدر پیچھے ہے۔ ہم سب جانتے ہیں۔

(۲) انسان اور فطرت یعنی نیچر۔ اس کے مشاہدہ سے ہم جتنا دور ہیں۔ تاسف انگیز ہے۔ جن انقلابات نے بیسویں صدی عیسوی میں [illegible] قابل فخر ہیں۔ لیکن مشاہدات قدرت ابھی [illegible] شعریت سے اوال۔

(۳) انسان اور تمدن — اخلاقیات۔ سیاسیات۔ وقائع نگاری وغیرہ سب اس میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں سوائے ایک مخصوص انداز اظہار کے اس طرف جو توجہ فرمائی گئی ہے۔ غیر مکمل۔ غیر مربوط اور نہایت ناکافی ہے۔ دور حاضر میں چند نامور شعرا نے اس طرف قلم اٹھایا ہے۔ اور بنی نوع انسان پر احسان فرمایا ہے۔ مگر اس سب کو ابتدا ہی کہا جا سکتا ہے۔

(۴) انسان اور حسن — یہ شاخ تمدن ہی ہے۔ اس کے جزو لاینفک یعنی محبت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۵) (الف) محبت عام یا غیر جنسی — اس قسم خاص پر بہت کم شعرا نے قلم اٹھایا ہے۔

(۶) (ب) محبت جنسی — اس شعبہ میں قدیم شاعری مالا مال ہے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ اردو کے قدیم شعرا نے اسی قسم خاص پر قلم فرسائی فرمائی ہے۔ اور بس! لیکن آپ اس کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ کہ اس آخری مگر ضروری شعبۂ حیات کو شعرائے قدیم نے کس نہج پر پیش کیا ہے۔ اور ان کی پرواز تخیل طیر طائف کہاں کہاں گردش کناں رہی یا محدود رہی یا مخصوص ہو گئی۔ نصف درجن کے قریب شعبہ جات حیات انسانی کو چھوڑ کر جو شاعری "محبت جنسی" پر اردو کلام میں پائی جاتی ہے۔ اس کے چند عجیب تخیلات کو سامعین کے روبرو پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ اور معذرت بھی پیش کرتا ہوں۔

(۱) عورت :- یعنی محبوب ۔ اصل تو یہی معلوم نہ ہو سکا ۔ کہ اردو شاعری کا معشوق کوئی حسین لڑکا ہے یا عورت! ملاحظہ فرمایئے ؎

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک (غالب)

باغ میں جاتے ہو پہنے ہو گلابی ٹوپی !
بلبل بے ادب آ بیٹھے نہ اے جاں سر پر ! (رشک)

اس حسین لڑکے کا بازار عالم شباب میں آمد خط سے سرد پڑ جاتا ہے ؎

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست (غالب)

خیر! شاعری کی محبوبہ ایک ایسی صنفِ نازک ہے ۔ جس پر نزاکت کا اطلاق ہوتا ہی نہیں ۔ کیونکہ مذبح خاص میں اس کو سیکڑوں کو قتل کرنا پڑتا ہے ۔ اور تیغِ براں سے ہزاروں ۔ گلے کاٹنے پڑتے ہیں ۔ علاوہ ازیں ؎

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں ! (خلیل)

اور اگر کبھی نزاکت کا اطلاق ہوتا ہے ۔ تو ایسا کہ خدا کی پناہ ۔ اس کے تصور سے عشق کرتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے ۔ مبادا دم نکل جائے ۔ کبھی تو یہ عورت خون کے دریا بہاتی ہے ۔ اور کبھی محض بوسہ کا خیال اس کے رخسار کو نیلا کر دیتا ہے ۔ صراحی دار گردن ۔ کمر غائب ؎

کمر اس کی ممکن نہیں ہاتھ آئے
گر صاحبِ دستِ غیب اسکو پائے (میر)

اس کے عاشق ایک سے زائد ہوتے ہیں ۔ کامیاب عاشق غیر شاعر ہوتے ہیں ۔ وہ ہجر کے تو کیا وصل کے بھی اشعار نہیں کہتے ۔ سچا عاشق محض ایک شاعر ہوتا ہے ۔ یعنی وہ شاعر سچے عاشق نہیں ہو سکتے ۔ سچے عاشق کی نازک خیالی سے یعنی شاعر سے یہ حسینہ ہمیشہ چڑاتی ہے ۔ حضرت کو خوب سناتی ہے ۔ کبھی گالیاں بھی دے بیٹھتی ہے ؎

بوسہ نہ دیجئے ، دشنام ہی سہی
آخر زبان تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں (غالب)

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا علاج
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں (غالب)

بوسہ کیسا ، یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام (غالب)

سوائے شاعر کے سب کے ساتھ ارتباط و اختلاط رہتا ہے ۔ اور یہ اگر سر سے کفن باندھ کر بھی آتے ہیں ۔ تو ان کو قتل نہیں کرتی ؎

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا (غالب)

ہمیشہ ترچھی نظروں سے دیکھتی ہے ۔ غرفہ سے جھانکتی ہے چلمن کے پیچھے جلوہ فگن ہوتی ہے ۔ کبھی بازاروں میں سنگار کئے پھرا کرتی ہے اور ایک مجمع عشاق اس کے ساتھ ہوتا ہے ؎

وہ ساتھ رکھتے ہیں اس طرح مجمعِ عشاق
صحابہ ساتھ لئے جس طرح رسول چلے (بیدم)

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گذر ہے کیا کہئے (غالب)

بن سنور کے گھر سے نکلے سیر کو جانے لگے
جب ہجومِ عاشقاں دیکھا تو شرمانے لگے

ایک مثل بچہ کی محبوبہ کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے ؎ ،

بھیس میں گذرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے (غالب)

اس کا نکاح کبھی نہیں ہوتا ۔ کبھی کبھی یہ عورت شراب بھی پیتی ہے ؎

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں (غالب)

کبھی کبھی اس کی بزمِ ناز میں دھول دھپا بھی ہوتا ہے ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

غضب کا عشق ہے ۔ کہ دھول دھپا کھانے کے بعد بھی شاعر صاحب

---

۱ زندگی کی حقیقت [illegible] شرم ! (ناظم)

اپنی ہی ہستی کو معشوق میں پیش فرما رہے ہیں۔ اس کے علاوہ
پرانا کرتا ہے جو شاعر کو مکان میں گھسنے نہیں دیتا۔ اور کبھی کبھی یہ محبوبہ
بھی شاعر عاشق کو اپنی محفل سے کان پکڑ کر نکال دیتی ہے ؎

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں (غالب)

بزم زن اور شاعر کی شرم ملاحظہ فرمایئے ؎

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

الغرض ہماری شاعری کے محبوب کو کچھ تماشائیوں سے بھی صحیح بیان فرما
دیا ہے ملاحظہ فرمایئے ؎

کیونکر نبھے گی ہم سے ملاقات آپ کی
واللہ کیا ذلیل ہے اوقات آپ کی
ہرجائی پن کی آپ کے کچھ انتہا نہیں
کٹتا ہے دن کہیں تو کہیں رات آپ کی (رند)

ہم کیا تمہارے عشق میں گھاٹے میں رہ گئے
وہ جو ہزاروں سے بھی زیادہ ہیں چاہیئے (خلیل)

بیداد مجھے یاد ہے واللہ تمہاری
یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری
للہ قدم شرم کے کوچہ سے نکالو
بازار میں سب دیکھتے ہیں راہ تمہاری
عاشق کو خوشی اور رقیبوں کو الم ہو!
جائے جو سواری کبھی درگاہ تمہاری (امانت)

ہم بھی خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی! (مومن)

مصنف کی تخیل اس قدر خراب مرقع جمالیات! عورت کی بدترین تصویر
... شعریت کا استہزا۔ طفلان حسین اور ہرجائی

عورت کے علاوہ کبھی یہ معشوق ایک چھوٹی لڑکی ہوتی ہے ؎

بچپن میں ان کو شوق ہوا میرے قتل کا
ننھی سی ان کے واسطے تلوار چاہیئے

کہا اس سے کیا تو تیغ بزمانۂ جوانی
کبھی کم سنی میں جس نے نہ سنی میری کہانی

ناظرین! میرا یہاں یہ بیان کر دینا بیحد ضروری ہے۔ کہ شاعر ایک
شریف عورت کو کیوں بیان نہیں کر سکا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی
کی سوسائٹی کی عورت کی تقلید۔ پردہ کی بے انتہا سختی۔ رؤسا و نوابانِ
اودھ کی مروجہ عیش پرستی۔ نوجوانوں کو محض طوائفوں یا دیگر بازاری عورتوں
کے مشاہدہ کرنے کا موقع ملنا۔ وغیرہ۔ ایسے اسباب ہیں۔ کہ جس سے
شاعر شریف خواتین کے متعلق کچھ نہ کہہ سکا۔ مجبور رہا! میرے نزدیک
اس دور خرابات کی ابتدا ناسخ سے ہوئی۔ اور غالب کے زمانہ تک
کم و بیش رہی۔ لیکن دور حاضر میں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ کہ ہم اسی قسم
کی عورت کو پیش کریں۔ سب سے بڑا ظلم میرے نزدیک یہ ہے
کہ عورت کے صحیح جذبات کی جو بمقابلہ مرد کے ہمدردی اور محبت سے
کہیں زیادہ پُر ہوتی ہے۔ ترجمانی اردو شاعری میں نہیں کی گئی۔ مرد نے
اپنے جذبات کو تعلّی اور غلو سے بیان کیا۔ اور عورت کو ہمیشہ ظالم اور
بے وفا بتایا ؎

نہ بدلے گی زمانہ کی ہوا کیا
نہ پیدا ہوگی عورت میں وفا کیا
رہے گا کیا سدا محبوب ظالم
نہ پیدا ہوگی اس میں کچھ وفا کیا (عطا)

(۲) تذکیر و تانیث۔ اسی ضمن میں ستم ظریفی شعرا کی انتہا بھی بیان
کردوں۔ اظہار بیان میں بے پناہ عریانی کو روا رکھا۔ لیکن وہ "آئے"
کے بجائے "وہ آئیں" کہتے ہوئے شرماتے رہے۔ شاید ان کا گمان تھا۔
کہ ان کے مردانہ قلم میں کہیں زنانہ پن نہ آجائے۔ تعجب! صیغۂ تانیث
کے افعال کی گردان وہ بے نظیر لطافت ہے۔ وہ مؤثر طرز ادا ہے۔
وہ نفیس ترین جذبات کی نقاشی ہے۔ وہ مرتعش و پُر کیف طرز اظہار ہے

کہ جس کی مثال سوائے ہماری خوش نصیب اردو کے کسی دوسرے لٹریچر میں کم ملتی ہے۔ بلکہ ہے ہی نہیں! لیکن دیگر زبانوں کے ابتذال نے اس لطافت و حسن ادب کی خاص خوبی کو شاید ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا۔ تذکیر و تانیث افعال کو شعرا نے ہمیشہ خنجر تذبذب سے حلال کیا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ "وہ آئے کچھ دیر بیٹھے بات نہ کی اور چلے گئے"۔ اس سے کہیں زیادہ لطیف تر جملے یہ نہیں ہیں۔ کہ "وہ آئیں کچھ دیر بیٹھیں شرما شرما کر مزاج دریافت کرتی ہیں۔ لیکن جلد چلی گئیں"۔ ان مذکورالذکر جملوں کو اگر نثر میں بھی بیان کیا جائے۔ تو بھی شعریت سے معمور اور کیف زا معلوم ہوتے ہیں۔ اگر انہیں کو داخل نظم کر لیا جائے۔ تو معمولی شعر بھی جذبات میں ارتقائی کیفیات پیدا کر سکتا ہے۔ اور اظہار میں انتہائی قابل قبول تاثرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ میں پھر کہونگا۔ کہ افعال تانیث کا اظہار اردو لٹریچر کی فقید المثال لطافت و حسن و خوبی ہے۔ اس کو نظم نہ کرنا ہمارے لٹریچر پر سب سے بڑا ظلم کرنا ہے۔ اور شمع التہاب کلام کو پر پرواز پروانہ سے گل کر دینا ہے۔

(۳) مرد۔ یعنی عاشق:۔ ہمیشہ نامراد۔ گریبان چاک۔ خاک اڑانے والا۔ صحت خراب۔ مرض عشق میں مبتلا۔ اس کے ایک بے باک تیماردار کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ کس سے؟ کہاں؟ کیوں اور کیسے! فرماتے ہیں ؎

لو ہم مریض عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج (غالب)

جب دیکھئے۔ نزع کا عالم طاری۔ مگر اس کی صحت دماغ اس قدر درست اور غیر معمولی ہوتی ہے۔ کہ بیماری اور حالت نزع میں تو کیا قبر لحد میں جا کر بھی شعر بکھارتا رہتا ہے۔ اور وہاں اسکے تخیل کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ ان کی محبوبہ فاتحہ پڑھنے۔ پھول چڑھانے۔ قبر پر شاید جھاڑو دینے یا رونے دھونے آتی ہے۔ جس کو یہ قبر میں پڑے دیکھا کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ملامت بھی کر دیتے ہیں۔ اور ان کی جفاؤں کو یاد دلایا کرتے ہیں۔ اس مردہ عاشق کو یہ بھی یقین ہوتا ہے۔ کہ یہ عورت ان کی یہ سب

اور کمزور ہوتے ہیں۔ چہرہ پر مردنی چھائی رہتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ محبوب کی نظروں میں نہیں جچتے۔ اور موٹے تازے رقیبوں کے مقابلہ میں ہزیمت خوردہ رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ان سے پٹ بھی جاتے ہیں اور باہر نکال دیئے جاتے ہیں ؎

کوچۂ یار سے ہم ایسے نکلوائے گئے
پا بدست دگرے دست بدست دگرے

عاشق صاحب کس درجہ نحیف و نزار ہوتے ہیں؟ ملاحظہ فرمائیے ؎

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر۔ گر کوئی بتلا دے مجھے (غالب)

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیئے

بہرکیف ہماری شاعری نے بھی عاشق کی حقیقت کو ذرا عریاں کر کے کہیں کہیں بتا دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ معشوق۔ عیرت الدعد کے تخیل پر بھی غور فرمائیے۔ مثل بچہ صاحب کہاں تو خود مشق کروا رہے ہوئے تھے۔ کہاں پاؤں دباتے ہیں۔ ماشاءاللہ۔

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے (غالب)

کہاں پیری کہاں گلچینیاں باغ جوانی کی!
خزاں کا وقت ہے بیٹھے ہوئے کیسے اڑاتے ہیں!

تو تو کیا ہے میں وہ عاشق رنگین دل ہوں
چوم کر لاکھوں کا منہ غنچہ دہن چھوڑ دیا!
سارے گلشن میں ... [illegible]
... [illegible]
... [illegible]

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے (مومن)

غیر سے سرگوشیاں کیجئے پھر ہم بھی کچھ
آرزو مندِ دلِ درد آشنا کہنے کو ہیں

جس کو دیکھا۔ اسی پہ مر جانا
اپنی طبیعت تو بے تکلف ہے!

جان نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

ایسے عشاق کو پیش کرنا بد مذاقی نہیں تو اور کیا ہے؟ سراسر تخریب ہے۔ تمدن کی مذہبی تصویر ہے۔ اور سوسائٹی میں تزلزل و انحطاط کی ترغیب اور بد اخلاقی کی ترویج ہے۔

(۴) وصل:۔ اب تخیل وصل کو لیجئے۔ دیدار۔ جلوہ گفتگو کو چھوڑتے ہوئے وصل کا بیان کردہ تخیل عجیب مضحکہ ہے۔ یہ حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر نہیں ہوتا ہے

مزے وصال کے مدت ہوئی اٹھائے ہوئے
گذر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے

ہمارا وصل حاصل کر لینا اور پھر محروم ہو جانا اور دوسروں کو ہمیشہ حاصل رہنا لیکن ہمارا پھر بھی خواہش رکھنا عجیب بات ہے۔ کتنا بھونڈا خیال اور کتنا رکیک تصور۔

(۵) رقیب:۔ اب رقیب کے تخیل پر غور فرمائیے جب کبھی طلباء مجھ سے اس لفظ کے معنی پوچھ بیٹھتے ہیں۔ تو آپ سے سچ عرض کر رہا ہوں۔ کہ بسا اوقات ان سے جھوٹ بول کر ٹال دینا پڑتا ہے۔ لیکن با [illegible] معنی پر اور اپنے مصلحت آمیز جھوٹ پر احساس شرم ناگزیر ہوتا ہے۔ مگر جب اشعار میں اول معنی سے کام نہیں چلتا۔ [illegible] کو بات [illegible] پھیر کر بتانا پڑتا ہے۔ اگر سچ عرض کیا جائے۔ تو کہنا پڑتا ہے۔ کہ طلباء سے ایسے وقت اخلاقی فرض مدنظر رکھتے ہوئے اور غیرت عربی کا لحاظ رکھتے ہوئے آنکھیں ملانا بے حد مشکل کام ہے۔ رومال نکال کر پسینہ پونچھنے کی نوبت بھی کبھی کبھی آ جایا کرتی ہے۔ اور اگر کسی ذہین طالب علم نے معترضانہ استفسار کر لیا۔ تو بس قیامت آ گئی۔ پھر تو سوائے ڈانٹ کر خاموش رہنے کی تاکید کے اور کچھ چارہ نہیں ہوتا۔ انجمن اساتذہ کے کتنے ارکان ہیں۔ جو رقیب کے بیان کردہ تخیل کی وضاحت کرتے وقت نہیں شرماتے۔ میں نہیں پوچھتا۔ کہیں آپ میں سے چند اس وقت بھی خواہ مخواہ خفیف نہ ہو جائیں۔

رقیب ایک نہیں ہوتا بلکہ اکثر زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں۔ شاعری کا رقیب کم بخت عجیب چیز ہوتا ہے۔ بہت طاقتور۔ مضبوط۔ ہٹا کٹا مسٹنڈا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ محبوب پر چھایا رہتا ہے۔ شاعر عاشق کی اس کے سامنے کچھ پیش نہیں جاتی۔ اسے ہمیشہ وصل حاصل رہتا ہے۔ اور یہ حسرت سے منہ تکتے ہیں۔ خلاف فطرت ایثار عاشق کا خاکہ ملاحظہ فرمائیے ؎

تم جانو تم کو غیر سے جو راہ و رسم ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو (غالب)

آگے ملاحظہ ہو۔ رقیب صاحب نے بوسہ لے لیا۔ اور ہم نے دیکھ بھی لیا۔ مگر ہماری حمیت و غیرت کو محض اس قدر غصہ آیا۔ کہ فقط اتنا کہا ؎

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے (غالب)

کامیاب رقیب کم پڑھا لکھا ہوتا ہے۔ یا جاہل ہوتا ہے۔ یا شاید نثار ہوتا ہے۔ مگر شاعر کبھی نہیں ہوتا۔ یعنی وہ شعر کبھی نہیں کہتا۔ ہجر و فراق کو کبھی بیان نہیں کرتا۔ کیونکہ اس سے اس کو واسطہ ہی نہیں پڑتا۔ جب شاعر عاشق اس کے سامنے آتا ہے۔ تو منہ کی کھاتا ہے۔ ڈر جاتا ہے۔ رقیب سے شاعر کی روح کانپتی ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ اور خدانخواستہ رقیب کا تصور فرمائیے ؎

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

غیر سے رات کیا بنی؟ یہ جو کہا تو دیکھئے !
سامنے آن بیٹھنا - اور یہ کہنا کہ یوں !

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

کبھی شاعر رقیب کے مقابلہ میں ہیہم شکست کھا کے سیاسی چال اختیار کرتا ہے - اور اس کو بھی محبوب کی شکایت میں ہمنوا کر لیتا ہے ؎

تاکرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا (غالب)

مگر رقیب اس کو کب خاطر میں لاتا ہے - موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی دریغ نہیں کرتا ؎

تجھے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو (غالب)

(۶) دربان :- دربان اور بھی بلائے بے درماں ہوتا ہے - طاقتور رقیبوں سے ڈرتا ہے - در حبیب میں باریابی کی ان کو اجازت دیتا ہے - شاعر عاشق آیا - اور اس نے ڈنڈا سنبھالا - خوب مرمت کرتا ہے -

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے (غالب)

مرمت ہونے پر بھی عاشق صاحب دربان کے قدموں سے جدا ہونا پسند نہیں کرتے ؎

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سرزیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے (غالب)

بعض اوقات حضرتِ عاشق کی اخلاقی حالت اس قدر گر جاتی ہے - کہ اپنی ذلت کا بھی احساس نہیں رہتا - دربان کا سخت سست کہنا مذاق میں ٹال دیتے ہیں ؎

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا (غالب)

(۷) ہوس :- تعجب ہے کہ ہوس جیسے رکیک تخیل کو بھی باندھا جاتا ہے ؎

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے (غالب)

محض اس ایک شعر کا مطلب اس قسم کی تمام عاشقانہ اور مجاہدانہ شاعری کا مرقع پیش کر سکتا ہے - مگر افسوس کہ اتنا وقت نہیں - کہ اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کر سکوں - لفظ ہوس کبھی اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا - اور اس کا تخیل شاعری کے غیر فطری دعوے عجب عشق پر دلالت کرتا ہے - چنانچہ مرزا نوشہ بوالہوسی کے متعلق ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں ؟

دورِ متقدمین کا خاکہ اور تردیدِ تخیل سابق بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی !
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی !

(۸) گل و بلبل :- ایران کے مختصر خطہ کا مقامی تخیل اور تمام ہندوستان پر حاوی سمجھا جائے - اور وہ بھی واقعات و مشاہدات کے خلاف ! ہند میں اول تو وہ بلبل ہوتا ہی نہیں - اور ہے تو اس کو کبھی چشم خود میں نے دیکھا ہے - کہ گلاب کی پنکھڑیاں نوچتا ہے - اور یہ مشکل ہے اگر یہی عشق ہے - تو سبحان اللہ - جب وجہ شبہ ہی مفقود ہو - تو نقص تشبیہ ظاہر ہے - کنایہ و مجاز مرسل کا بھی اطلاق نہیں ہوتا - محض معہود ذہنی یا معہود خارجی ہے - جس پر دو زار قلم فرسائی کرتے ہیں -

گل :- محض حسن کے لئے استعمال ہو سکتا ہے - لیکن معشوق کے لئے اور وہ بھی اردو شاعری کے لئے مخصوص نہیں کیا جا سکتا - ہر وقت بلبل کا خیر مقدم کرتا ہے - اپنی پنکھڑیاں بچھاتا ہے زیرہ کھلاتا ہے - کوئی بے وفائی نہیں کرتا - بلکہ خود اس پر بلبل ظلم کرتی ہے - مظلوم گل مثل بیمار غم ایک [illegible] ہو جاتا ہے - [illegible] فرمائیے - کتنا بہتر تخیل دو حقیقت کے ایک غیر [illegible] ہے - جس پر [illegible] کلیاں کے شاعر [illegible]
سر و صنوبر اور دودیتی میں [illegible]

بجلی، آب، شمع، شبنم، چاندنی، بیار، غم
جو ہے وہ خاص غرض ایک رات کا مہمان ہے

گل کو حسن [illegible] شے سمجھئے۔ پسند فرمایئے۔ خوش ہو جیئے۔ [illegible] کی قسمت کی یاد دیجئے۔ اس کو حسن فانی کہئے۔ عبرت حاصل کیجئے۔ نہ کہ اس کو بلبل جیسے ظالم پرندہ کا معشوق متصور فرمایئے۔ اور الٹا ظالم بھی بتلائیے۔ ایران کا خدا گل یہاں ہے نہ وہ بلبل۔ اس لئے شعر کا مشاہدہ یعنی تشبیہات اور فطری نیچرل ہونا چاہئے۔ نہ کہ کتب، اموز، مجہول! اور غیر معقول!

(۹) صیاد: ——— ظالم ہے۔ مگر اس کو معشوق نہیں کہتے! لہٰذا جفا و ظلم معشوق کے لئے خصوصیت وصفت لائق نہیں ہے۔ کتنا اچھا ہے کہ ہم محبوب کو کبھی وفادار۔ ہمدرد۔ رحمدل بھی کہا کریں۔ کیونکہ عورت میں [illegible] نفسیات بتاتی ہے۔ رحم اور وفاداری و ہمدردی کا مادہ مرد سے کہیں [illegible] ہوتا ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے۔ کہ ہم بازاری عورت منظوم کرتے چلے [illegible] ہیں۔ جس کا شعار ہی دغا و جفا ہوتا ہے۔

کس قدر خلاف واقعات و مسلمات میں سے ہے۔ کہ آنکھ بند کئے تسلیم کئے بیٹھے ہیں۔ کہ عورت کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ وہ کسی سے محبت کرنا جانتی ہی نہیں۔ ورنہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک دیکھتے ہیں۔ اور بالکل صحیح دیکھتے ہیں۔ کہ مرد عورت پر محبت کے سلسلہ میں طرح طرح کے ظلم و ستم توڑتا ہے۔ جفا و دغا کرتا ہے۔ ہرجائی ہو جاتا ہے۔ مگر کسی شاعر کی زبان سے آج تک نہ نکلا۔ کہ مرد کو بھی بھولے سے جفاکار۔ ظالم۔ دغاباز یا ہرجائی کہے۔ اور ایسا منظوم بھی کرے۔ [illegible] واقعات و مشاہدات کا سراسر خون اور تضحیک ہے۔ بے عمل [illegible] محبت کم ہے۔ ورنہ بتاتا۔ کہ مرد کتنے کتنے اور کیسے کیسے ظلم [illegible] ڈھاتا ہے۔ اور عورت کی انتہائے وفا کیا ہے۔

[illegible] قافیہ و ردیف: ——— کی پابندی سے جو نقصانات اردو [illegible] ضرور قابل تذکرہ ہیں۔ مگر گنجائش وقت [illegible] کے ساتھ بیان کر سکیں۔ مختصراً [illegible] اوقات بہترین تخیل کو پیش

کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ اس کو بدلنے یا ترمیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شعر کا مقصود اثر و اظہار ہے۔ جو بذریعہ موسیقیت زیادہ گہرا پڑتا ہے۔ اور موسیقیت محض بحر ہے۔ نہ کہ چیستہ در مشرقی شعرا کے قیود قوافی۔ عربی کی ابتدائی شاعری۔ برج بھاشا کی شاعری۔ انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کی شاعری۔ ہندی راگ۔ راگنیاں یعنی موسیقیت کی جان تمام قوافی کے سخت تقید سے مبرا ہیں۔ لیکن کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اثر و اظہار سے معرا ہیں۔

فرسودگی تخیل اور پابندی قوافی کی سختی سے باوجود نیچرل اور قادر الکلام شاعر ہونے کے بھی بسا اوقات اس کا تخیل محدود ہو جاتا ہے۔ اور اس کی طبیعت منقبض ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اردو شاعری میں ڈرامہ یا ایپک پوئم (رزمیہ شاعری) جیسی مفید اور ضروری نظمیں آج تک پیدا نہ ہو سکیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ان سخت ترین پابندیوں کی وجہ سے شاعر وہ پیش نہیں کر سکتا۔ جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ بلکہ وہ کہتا ہے۔ جو یہ پابندی و قیود کہلواتی ہے۔ اور روانی تخیل اور سہولت نظم تو باقی نہیں رہتی۔ کاش! ہم ان قیود کو قدرے آزاد کر دیں۔ اور اس آزادی کو دنیائے شاعری سے تسلیم کرا لیں۔ اور نظم کے صحیح مفہوم کو فوت نہ کرتے ہوئے شاعری کر سکیں۔

(۱۱) شراب خانہ: ——— خدا کی پناہ! سوائے مشرقی شاعری کے اور وہ بھی ایرانی اور اردو شاعری کے اس میخانہ خراب کے تخیل کی مثال اور وہ بھی اپنے لوازم۔ ساز و سامان اور تکلفات کے ساتھ اور کسی زبان میں اس قدر تعدد کے ساتھ نہیں ملتی۔ یہ تخیل قطعاً مضر، بے کار، قابل مقاطعہ ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں ؎

پی جس قدر ملے شب مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں
آج ہی ہوا منظور امتحاں اپنا
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

الحمرا کی شہزادیاں

(از:- راؤ شفیق الرحمٰن خان - میڈیکل کالج - لاہور)

مُدت گذری - ہسپانیہ (اُندلس) میں مسلمانوں کا دورِ حکومت تھا - ان دنوں غرناطے پر ایک بادشاہ حکمران تھا - اس کا نام غالب تھا - مگر اس کے نام کے ساتھ اسکی رعایا ایک اور لقب لگا دیتی تھی - اور وہ لقب "احمق" کا تھا - اسکی کئی وجوہات تھیں - سب سے پہلی تو یہ کہ بادشاہ ہر ایک کام کو ہمیشہ غلط طریقے سے شروع کرتا - اور پھر اُسے ادھورا ہی چھوڑ کر علیحدہ ہو جاتا -

دوسری وجہ یہ تھی - کہ اس کا بایاں ہاتھ دا ہنے ہاتھ کی نسبت زیادہ طاقتور تھا - اور ہمیشہ کھانا بائیں ہاتھ سے کھاتا - لڑتا بھی بائیں ہاتھ سے ہی - اور لکھتا بھی بائیں ہاتھ سے - جب کبھی وہ کسی کام کے سرانجام کرنے کی کوشش ظاہر کرتا - تو لوگ ازراہِ تمسخر کہا کرتے - " دیکھنا خدا خیر ہی کرے احمق صاحب ایک نئی مہم سر کرنے لگے ہیں " - اس کے زمانے میں امن و امان بہت کم تھا - خواہ لوگ اسے اس کے احمق پن سے تعبیر کریں - خواہ اسے اسکی بدقسمتی کہا جائے - مگر وہ اپنی بیوقوفی سے ہمیشہ پریشان رہا - اس کے عہدِ حکومت میں ہمیشہ بغاوتیں ہوتی رہیں - تین مرتبہ اسے تخت سے اتارا گیا - مگر جسقدر وہ احمق تھا - اتنا ہی بہادر اور دلیر تھا - ہر مرتبہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے چھپ کر فرار ہو جاتا - پھر خفیہ طور پر فوج فراہم کر کے تخت حاصل کر لیتا تھا -

ایک دفعہ ایک بڑی زبردست بغاوت ہوئی - جسمیں بادشاہ کو جان کے لالے پڑ گئے - مگر وہ اپنے ایک جان نثار خادم کی مدد سے محل سے فرار ہو گیا - اس نے ماہی گیر کا بھیس بدلا - اور کشتی میں بیٹھ کر افریقہ چلا گیا - مراقش میں اس کے ساتھ بہت برا سلوک ہوا - وہ یوں کہ وہ حاکم مراقش سے مدد کا خواہاں ہوا - مگر یا تو حاکم مراقش کو اس کے بادشاہ ہونے کا یقین نہ آیا - کیونکہ وہ ایک ماہی گیر کے لباس میں تھا - یا شاید اس نے دانستہ طور پر ایک احمق کی مدد نہ کرنی چاہی - چنانچہ اس نے صاف جواب دے دیا - بادشاہ دانت پیستا اور حاکم کو کوستا ہوا دربار سے چلا آیا - اس نے حکمت عملی سے قسم قسم کے لالچ دیئے - اور طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر ایک چھوٹی سی فوج فراہم کر لی - پھر یکلخت رات کے وقت غرناطے پر ٹوٹ پڑا - علے الصبح سورج نے نکل کر اپنی سنہری کرنیں غرناطے پر پھینکیں - تو پھر احمق صاحب کی حکومت تھی - سورج بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا -

تخت پر بیٹھ کر اس نے پھر وہی حماقتیں شروع کر دیں - مگر اب وہ ہر ایک حماقت سے پہلے ذرا دیر سوچ لیا کرتا تھا - ایک دن وہ شکار کھیل کر واپس آ رہا تھا - جب وہ کوہ الوپرہ کے دامن سے گذر رہا تھا - تو اسے ایک جماعت آتی ہوئی دکھائی دی - وہ ٹھہر گیا - اور آنے والوں کی طرف گھورنے لگا - یہ لوگ پہاڑی ڈاکو تھے - جو ساحل پر کسی جہاز کو لوٹ کر لائے تھے - لوٹ کھسوٹ کا مال خچروں پر لدا ہوا تھا - سب سے آخری خچر پر ایک بیحد حسین نو عمر لڑکی تھی - جسکا زرق برق لباس اس بات کا شاہد تھا - کہ وہ کسی امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے - اس کے ساتھ ہی ایک موٹی سی ادھیڑ عمر کی عورت پیدل جا رہی تھی - جو بار بار اسے سمجھاتی - اور چپ رہنے کی تلقین کرتی تھی - مگر لڑکی [illegible] ایک نہ سُنتی - اور برابر شور سے چلا رہی تھی - لڑکی کے جا [illegible] حسن سے متاثر ہو کر [illegible] تحقیقات کرنے کو [illegible] لڑکی سے [illegible] معلوم ہوا - کہ

امیر کی بیٹی ہے۔ اور اس کا جہاز بحری ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ بادشاہ نے اس جماعت کے سردار کو بلوا کر بحیثیت ایک حاکم کے اس مالِ غنیمت میں اپنا حصہ طلب کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنی داڑھی کھجائی۔ پھر بادشاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے لڑکی کو پیش کر دیا۔ اور پھر سلام کر کے اپنے قافلے کو لیکر پہاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

بادشاہ نے ڈاکوؤں کے سردار کی دانشمندی اور دور اندیشی کی داد دی۔ اور لڑکی کو اور اسکی دایہ کو قصرِ الحمراء کے حرم میں بھیج دیا۔

بادشاہ لڑکی کو دیکھ کر ہزار جان سے اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ سینکڑوں نازبرداریاں کیں۔ لاکھوں منتیں کیں۔ بہتیرا سمجھایا بجھایا۔ مگر لڑکی کے آنسو تھے۔ کہ تھمنے ہی میں نہ آتے تھے۔ بادشاہ بہتیرا سر پٹکتا۔ لالچ دیتا۔ عاجزی سے سمجھاتا۔ کہ اگر تو یہ رونا دھونا بند کر دے۔ تو میں تجھے آج اپنی ملکہ بنا لوں۔ مگر لڑکی کی عجیب ضد کے سامنے اسکی ایک نہ چلی۔ آخر اس نے لڑکی کی دایہ کو بلایا۔ اور اس کا نام دریافت کیا۔ جس پر اس نے مؤدبانہ جواب دیا۔ عالیجاہ! میرا نام قدسیہ ہے!

"اچھا تو قدسیہ! ہمیں تم سے ایک بات کہنی ہے — ایک کام کرو گی تم؟"

"جہاں پناہ! بسر و چشم!! قدسیہ بولی۔

"تمہاری بیگم ہم سے بہت ناراض ہیں۔ ذرا انہیں سمجھاؤ تو سہی"

قدسیہ نے سر ہلا کر وعدہ کیا۔ اور آداب بجا لا کر رخصت ہولی۔ اور سیدھی لڑکی کے پاس گئی۔ اور ناک چڑھا کر بولی۔

"یہ کیا ایں ایں لگا رکھی ہے ہر وقت کی! توبہ توبہ۔ ایسی لڑکی تو میں نے آج تک کبھی نہیں دیکھی۔ اچھی طرح جانتی ہے۔ کہ اب واپس جانا محال ہے۔ اور اگر بالفرض واپس بھی گئی۔ تو وہاں ایسی نازبرداریاں اٹھانے والا کون بیٹھا ہے۔ ذرا عقل کے ناخن لے۔ آنکھ کھول کر دیکھ — یہ سب [illegible] — باغ — فوارے — اور یہ ساری سلطنت — سب کچھ تیرے ہو سکتے ہیں۔ فقط ایک مرتبہ ہاں کہہ دے۔ اور اس [illegible] کر دیکھ لے۔ تو یہاں کی ملکہ بن جائے گی۔ اور یہاں کا حکمران [illegible] آپ کے [illegible] خشک ملک میں ایسا کیا رکھا ہے؟ تو ساری عمر تو اپنے گھر میں کنواری بیٹھنے سے رہی۔ آخر تیری شادی بھی ہو گی — پھر اس سے اچھی جگہ تجھے اور کہاں مل سکتی ہے پھر ملکہ بنکر تیری مرضی ہے کہیں پھر لے — خواہ اپنے باپ کے ہاں جا کر جو یا کہیں اور —!

بس اب کہنا مان لے۔ اور اس سے ہنسی خوشی اقرار کر لے۔ یہ سمجھ لے۔ کہ یا تو تو یہاں کی ملکہ بنکر راج کرے گی۔ اور یا باندی بن کر غلامی کرے گی۔"

قدسیہ نے اس طرح سمجھا بجھا کر اسے شادی پر راضی کر لیا۔ چنانچہ دوسرے ماہ نہایت دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ اور قدسیہ نئی ملکہ کی خاص رازدان مقرر ہوئی — تیسرے سال بادشاہ تین لڑکیوں کا باپ بن گیا۔ اس خبر سے رعایا میں کھلبلی پڑ گئی۔ وہ ایک ولیعہد چاہتے تھے۔ ادھر خدا نے دی بھی تو لڑکیاں — وہ بھی ایک دو نہیں — پوری تین! رعایا نے اسے بھی بادشاہ کی حماقت سے تعبیر کیا۔

بادشاہ خود بھی پریشان تھا — مگر پھر اسے صبر آ گیا۔ کچھ بھی ہو۔ خدا نے اسے اولاد تو عطا فرما دی۔ کیا لڑکیاں اولاد نہیں ہوتیں؟ — لڑکوں ہی میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوتا ہے۔ اپنے دل کو تسلی دے کر اس نے نجومیوں کو بلایا۔ اور لڑکیوں کی آئندہ زندگی کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے کچھ دیر حساب لگا کر یکزبان ہو کر کہا۔

"اے بادشاہ! لڑکیاں راج کرینگی۔ انکی قسمت بہت اچھی ہے۔ زندگی نہایت آرام سے گذرے گی۔ مگر ایک خطرہ ہے —!"

"خطرہ ہے؟ — کب؟" بادشاہ نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"خطرہ بالکل معمولی ہے۔ بس جب شہزادیاں عہدِ شباب میں قدم رکھنے لگیں۔ تو انکی سخت نگرانی کی جائے۔ بہتر تو یہی ہو گا۔ کہ آپ انہیں خود اپنی حفاظت میں لے لیں۔ ان کے پاس کسی نوجوان کا سایہ تک نہ پھٹک سکے۔ اس کے بعد خطرہ ٹل جائے گا۔"

بادشاہ نے غور سے سنتے ہوئے اس طرح سر ہلایا۔ گویا وہ قسمت کو شکست دیدے گا۔ ملکہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکی۔ اور

چند ہی سال کے بعد اپنی تینوں بچیوں کو قدسیہ کے حوالے کر کے رخصت ہوئی۔ دن جلدی جلدی گذرتے گئے۔ شہزادیوں نے عمر کے دسویں سال میں قدم رکھا۔ ادھر ذرا بادشاہ کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے قدسیہ کو بلا کر کہا۔

"قدسیہ! اب وہ وقت آنے والا ہے۔ جس کے بارے میں نجومیوں نے پیشگوئی کی تھی۔ اب ہمیں ہوشیار رہنا چاہیئے۔ اور چونکہ مجھے تمہاری ذات پر کامل اعتماد ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں۔ کہ تم لڑکیوں کو لیکر صالورینا کے شاہی قصر میں چلی جاؤ۔ پھر پندرہ سال کی عمر میں یعنی آج سے پانچسال بعد لڑکیوں کی حفاظت میں خود کرونگا۔ پھر تاکید کرتا ہوں۔ کوئی ایسی بات نہ ہو۔ جس سے میرے اعتبار میں فرق آئے"

قدسیہ نے بادشاہ کو اچھی طرح سے مطمئن کر دیا۔ پھر لڑکیوں کو ساتھ لیکر ایک فوجی دستے کی حفاظت میں صالورینا کے محل میں چلی گئی۔

قصر صالورینا ایک عالیشان محل تھا۔ جو بحیرہ روم کے کنارے ایک بہت اونچی چٹان پر واقع تھا۔ اس قصر میں عموماً شاہی نظر بندی رہا کرتے تھے۔ یعنی بادشاہ کے ایسے عزیز جن سے شاہی کاروبار میں خلل اندازی کا خطرہ ہوتا تھا۔ انہیں یہاں نظر بند کر کے نہایت عیش و عشرت سے رکھا جاتا تھا۔

اسی قصر میں تینوں بہنیں رہا کرتی تھیں — دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر۔ بچپن کے دلکش خواب میں مدہوش بلبلوں کی طرح باغوں میں چہکتیں۔ ان کی خدمت کے لئے بہت سی لونڈیاں تھیں۔ تفریح کے لئے ہزاروں سامان تھے۔ چاروں طرف رنگ رنگ کے پھولوں سے پٹے ہوئے تھے۔ درختوں کی ڈالیوں میں سنہری پنجرے آویزاں تھے۔ جن میں نہائیت ہی خوبصورت پرندے مقید تھے۔ جن کے چہکنے سے روح کو تازگی پہنچتی تھی۔ باغوں میں خوبصورت فوارے اور سنگ مرمر کے معطر حوض تھے۔ قصر کے تین طرف تو کوہ البفصرہ کی سرسبز اور شاداب پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ اور ایک طرف نیلا نیلا چمکتا ہوا سمندر تھا۔

غرضیکہ ایسے دلکش ماحول اور ایسی موافق آب و ہوا میں تینوں شہزادیوں نے پرورش پائی۔ چمکیلے آسمان کے نیچے اسی روح پرور فضا میں وہ عہد شباب کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ انکی عمر اب چودہ سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اب بچپن کی شوخیوں اور الہڑپن کی جگہ سنجیدگی اور سلیقے نے لے لی تھی۔ بچپن کے ناتراشیدہ خط و خال کی جگہ اب ان کے چہرے بے پناہ حسن کی جگمگاہٹ سے روشن تھے۔

سب سے بڑی کا نام زاہدہ تھا۔ اس سے چھوٹی کا زہرابدہ اور سب سے چھوٹی زہراہیدہ تھی — اگرچہ یہ بڑائی یا چھوٹائی محض برائے نام ہی تھی۔

زاہدہ جہاں سب سے بڑی تھی۔ وہاں اور بہنوں سے عاقل اور بے باک تھی۔ ہر ایک تحریک میں وہ پہلے حصہ لیتی۔ سوچ بچار کی عادی تھی۔ ہمیشہ اسکی خواہش یہی ہوتی۔ کہ وہ باتوں کی تہہ تک پہنچ جائے۔

زہرابدہ حسن کی بڑی دلدادہ تھی۔ ظاہری نمائش کی عاشق اشائد یہی وجہ تھی۔ کہ وہ اپنا زیادہ وقت قد آدم آئینے کے سامنے بناؤ سنگار میں صرف کرتی۔ اور پھر یونہی کچھ کھوئی ہوئی سی اپنا بے پناہ جمال دیکھتی رہتی تھی۔

زہراہیدہ سب سے چھوٹی تھی — بڑی شرمیلی اور چنچل تھی۔ اس کی طبیعت اپنی بہنوں کی نسبت زیادہ حساس واقع ہوئی تھی۔ اپنا وقت وہ چھوٹے چھوٹے پالتو جانوروں اور خوبصورت پرندوں میں گذارتی۔ جب دیکھو زہراہیدہ ان ہی سے چہلیں کرتی ہوئی ملتی ہے — اس کی بہنیں اس کے اس عجیب خبط پر ہنسا کرتیں۔

بعض اوقات جب کہ اندھیری راتوں میں سیاہ بھیانک سمندر پر ننھے ننھے تارے ٹمٹماتے۔ یا چاندنی راتوں میں جب کہ سرسبز درختوں اور اودی اودی پہاڑیوں پر ایک نورانی دریا موجیں مارتا ہوتا۔ یا سمندر میں نورانی چاند کا عکس جھلملاتا — یا آسمان پر تارے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوتے۔ اس وقت زہراہیدہ جھروکے میں بیٹھی سنگ مرمر کی سیلوں سے رخسار لگائے — کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوتی۔ گویا وہ قدرت کے ان مخفی رازوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

جب وہ کبھی جھروکے میں بیٹھی ہوئی کسی ...

یاں تک کا اندھیں بانسری کی دلسوز صدا آتی — جیسے کوئی ناشاد روح نالہ و شیون کر رہی ہو۔ تو ان کا ننھا سا دل ادرسی دھڑکنے لگتا۔ پھر طوفان کے دنوں میں لہروں کا مسلسل سا شور یا بجلی کی ایک کڑک ہی اسے سہما دینے کے لئے کافی ہوتی۔

سلطان کا عظیم الشان محل ایک بہت اونچی چٹان پر واقع تھا — یہ چٹان سمندر کی جانب کچھ اس طرح سے جھکی ہوئی تھی۔ جیسے کسی ریندے کی چونچ ہو۔ محل کی ایک فصیل میں اس جھکاؤ کے اوپر واقع تھی۔ اسی دیوار میں ایک بہت بڑا جھروکہ بنا ہوا تھا۔ جس کے نیچے نیلی نیلی پُرجوش لہریں بڑے زور سے سخت اور نکیلی چٹانوں سے ٹکراتیں۔ اور پھر سفید سفید جھاگ میں تبدیل ہو جاتیں۔

اسی جھروکے میں شہزادیاں اپنا وقت گذارتیں۔ بعض اوقات وہ شام کے وقت محل کے بلند میناروں پر چڑھ جاتیں۔ اور اپنی لمبی لمبی گردنیں کھڑکیوں سے باہر نکال کر آتی جاتی کشتیوں کو دیکھتیں۔

ایک روز دوپہر کے وقت تینوں بہنیں جھروکے میں بیٹھی مختلف شغلوں سے اپنا دل بہلا رہی تھیں۔ زاہدہ ایک رُبط لئے کچھ گنگنا رہی تھی۔ زہرا بدہ لیٹی ہوئی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ زہرا ہیدہ اپنے ہاتھ پر ٹھوڑی رکھے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

یکایک زہرہ نے کہا۔ "دیکھنا ذرا — وہ جہاز آ رہا ہے!"

— واقعی سطح سمندر پر ایک چھوٹا سا جہاز قصر کی طرف آ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں جہاز کنارے پر آ لگا۔ اس میں سے کئی حبشی سپاہی نکلے۔ جنہیں زاہدہ پہچان گئی — یہ اس کے والد کے ملازم تھے۔ ان کے پیچھے عربی لباس پہنے تین خوبصورت جوان نکلے۔ جنہوں نے مختلف رنگ کی عبائیں پہن رکھی تھیں۔ سروں پر سرخ ٹوپیاں تھیں۔ جن کے پھندنے لٹکے ہوئے تھے۔ تینوں جوانوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ حبشی انہیں قید کر کے لائے ہیں۔ تینوں کی حالت [illegible]۔ ایک دلفریب تبسم ان کے لبوں پر [illegible] ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ [illegible] ٹھنڈی بڑی شاہانہ [illegible] پیدا ہو گئی

انہوں نے ایسے خوبصورت جوان دیکھے ہی کب تھے۔ ان کے سامنے تو سیاہ رنگ کے حبشی پھرا کرتے تھے۔ یا پھر کبھی کبھار وہ کسی بوڑھے خرانٹ ماہی گیر کو دیکھ پاتیں۔ ان کے نازک دل سینوں میں زور زور سے دھڑکنے لگے۔

"زاہدہ نے اپنی بہنوں سے کہا: ذرا اس گلابی عبا والے جوان کو دیکھنا کتنا قد آور ہے؟ اُفوہ۔ کس رعب سے قدم اُٹھاتا ہے — گویا یہ سب اس کے غلام ہی تو ہیں۔ اسکی سُرخ ٹوپی کا پُھندنا ہوا میں کس طرح لہرا رہا ہے؟"

زہرا بدہ بولی "خیر وہ تو ہو گا۔ مگر وہ سبز رنگ کی عبا والے کے سامنے سب ہیچ ہیں۔ اس کے گلابی چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں کیسی بھلی معلوم دیتی ہیں۔ اور پھر پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ کیسی کھیل رہی ہے۔"

زہرا ہیدہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ مگر نیلی عبا والے نوجوان کی طرف غور سے دیکھتی رہی۔ جو سب میں چھوٹا تھا۔ تینوں شہزادیاں نوجوانوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہیں۔ حتیٰ کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر انہوں نے ٹھنڈے سانس بھرے۔ اور پھر نرم نرم ریشمی تکیوں سے سر لگا کر کچھ سوچنے لگیں۔

اتنے میں آہٹ ہوئی۔ اور قدسیہ داخل ہوئی۔ لڑکیوں کو اُداس دیکھ کر بولی۔

"یہ تم تینوں لیٹی ہوئی کیا کر رہی ہو؟ بولتی چالتی کیوں نہیں۔ سارے دن منہ بسور رہا کس نے بنایا ہے؟"

زاہدہ نے آہستہ سے کہا۔ "اچھی قدسیہ! تم نے دیکھا یہ حبشی کمبخت کتنے ظالم ہیں۔ کیسے اچھے جوانوں کو کتنی بے دردی سے قید کئے لے جا رہے ہیں۔"

"بے چارے نوجوان! کہاں آن پھنسے؟ انہیں اس حال میں دیکھ کر کس کا دل نہیں پگھلتا۔ اُفوہ۔ اپنے ملک مراقش میں یہ کس شان سے زندگی گذارتے ہیں۔ مجھے ہی معلوم ہے۔ کشتیاں۔ اکھاڑے۔ دنگل۔ انعامی مقابلے۔ کھیل کود۔ اور پھر چاندنی راتوں میں [illegible] کے جھروکوں کے نیچے محبت بھرے گیت گانا [illegible]۔

تو بتاؤں!"

"ہاں ہاں! کہتی جاؤ نا قدسیہ! چپ کیوں ہوگئیں؟" زاہدہ نے اشتیاق سے دریافت کیا۔

"بیٹی یہ حاکم مراکش کے لڑکے ہیں۔ اور تیرا باپ مراکش کے حاکم کا جانی دشمن ہے۔ تیرے باپ نے خود ہی اس سے لڑائی مول لی ہے۔ وہ تو بے چارہ بہت شریف ہے۔ ایک مرتبہ تیرا باپ جلاوطنی کی حالت میں مراکش گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہاں کے حاکم نے مدد سے انکار کر دیا تھا۔ بس اتنی سی بات پر تو تو۔ میں میں ہوگئی۔ اور تیرا باپ اس کا دشمن بن گیا۔ بیٹی! تیری ماں بھی مراکش کے ایک بڑے امیر کی لڑکی تھی جسے تیرے باپ نے زبردستی چھین کر بیاہ لیا تھا۔ اور پھر میں بھی مراکش کی ہوں!"

تینوں بہنیں چپ ہوگئیں۔ زاہدہ قدسیہ کو ایک طرف لے گئی۔ اور کچھ کھسر پھسر کرنے لگی۔ زاہدہ چپکے سے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر شرمائی ہوئی نگاہوں سے اپنے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ مگر زہرا سیدہ حسب عادت وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ کہ چاندنی رات میں جھروکے میں بیٹھ کر کسی نوجوان کا محبت بھرا نغمہ کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہوگا!

دن بیتتے گئے۔ ہر روز قدسیہ شہزادیوں کو مراکش کے دربار کے حالات بتاتی۔ وہاں کی دلفریبیوں کا ذکر کرتی۔ محبت بھرے قصے سناتی۔ محبت کا نام سن کر شہزادیوں کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آجاتی۔ آخر ایک روز قدسیہ چونک اٹھی۔ زاہدہ پوچھ رہی تھی۔ "کیوں قدسیہ! ہمارے باپ نے ہمیں یہاں کیوں رکھا ہوا ہے؟"

قدسیہ چپ ہوگئی۔ کیسا بے باک سوال تھا۔ زاہدہ کو وہ ایک بچہ سمجھے تھی۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ محبت کی ان باتوں نے جنہیں وہ تفریحاً سنایا کرتی تھی۔ شہزادیوں کے نازک دلوں کے تاروں کو مرتعش کر دیا ہے۔ اب شہزادیوں کی عمر سولہ برس کی تھی۔ وہ خطرناک عہد شروع ہوگیا تھا جس کے بارے میں نجومیوں نے پیشگوئی کی تھی۔

قدسیہ نے بہتری اسی میں سمجھی۔ کہ چپ چاپ بادشاہ کو اطلاع دے دے [illegible] ڈال لے۔ ادھر قدسیہ کو اس [illegible]

سے کہ خلاصی ہو جائے۔"

ایک روز بادشاہ الحمرا کے ایک کمرے میں بیٹھا کچھ [illegible] رہا تھا۔ ایک غلام نے اطلاع دی۔ کہ قصر صالوبرینا سے ایک پیغام بر آیا ہے۔ بادشاہ نے سر ہلا کر کہا۔ اسے اندر آنے دو۔

ایک حبشی غلام ایک ٹوکری لئے اندر داخل ہوا۔ آداب بجا لا کر بولا۔ "جہاں پناہ، شہزادیوں کی سولہویں سالگرہ پر قدسیہ خاتون مبارکباد پیش کرتی ہیں اور یہ تحفہ حضور کی خدمت میں بھیجا ہے۔"

بادشاہ نے خوشی خوشی ٹوکری کھولی۔ جو کہ معطر پھولوں اور [illegible] پتوں سے پر تھی۔ اور ہیں پکے ہوئے پھل رکھے تھے۔ ایک شفتالو ایک خوبانی اور ایک آڑو۔ بادشاہ اگرچہ احمق ضرور تھا۔ مگر [illegible] اس کے شباب کے ساتھ آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا۔ وہ اس لطیف اشارے کو سمجھ گیا۔ اور مسکرا کر بولا۔

"خوب! پکے ہوئے پھل! گویا کہ اب وہ وقت آن پہنچا۔ جب کہ میں لڑکیوں کو خود اپنی حفاظت میں رکھوں!"

اس نے وزیر کو بلا کر کہہ دیا۔ کہ الحمرا کا برج شہزادیوں کے لئے سجایا جائے۔ اور ہر ایک سامان آسائش مہیا کر دیا جائے۔

پھر ایک افسر کو بلا کر حکم دیا۔ کہ "فوج کا ایک دستہ تیار [illegible] صالوبرینا کے قصر کو علی الصبح روانہ ہو جائیں گے۔" دوسرے روز بادشاہ روانہ ہوگیا۔ قصر میں اس کا خاطر خواہ استقبال کیا گیا۔ [illegible] میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے لڑکیوں کو دیکھنے کی خواہش [illegible] اس طویل وقفے میں شہزادیاں وہ حد [illegible] کر چکی تھیں [illegible] بے وقوف اور ناسمجھ لڑکی اور ایک دانشمند [illegible] کے [illegible] ہوتی ہے۔

سب سے پہلے [illegible] نگاہیں اوپر اٹھائے داخل ہوئی۔ [illegible] زمین کو [illegible]

ہی بیٹھے۔ اور میٹھی میٹھی باتیں کرے۔

شہزادی ہما ۔۔۔ نہایت بھڑکیلا اور معطر لباس پہنے ہوئے۔ بناؤ سنگھار کئے ہوئے۔ آتے ہی اس نے اپنے والد کا ہاتھ چوما۔ پھر لب سے ایک حسین شاعر کے کہے ہوئے چند عاشقانہ اشعار پڑھے۔ جنہیں سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا۔

سب سے بعد میں زہرا حمیدہ داخل ہوئی۔ اس کے بدن سے سادہ رنگین لباس بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ حسن کا نور اس کے ملیح چہرے پر برستا ہوا تھا۔ اس نے اپنی شرمیلی نگاہیں اٹھا کر اپنے والد کا پُرجلال چہرہ دیکھنا چاہا۔ مگر اتنی جرأت نہ ہوئی۔ وہ وہیں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

اس کی بہنیں اس کے شرمیلے انداز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے والد کی طرف بڑھی۔ قریب پہنچ کر چاہا۔ کہ اپنے باپ کا ہاتھ چوم لے۔ مگر اس کی نگاہیں اپنے والد کی نگاہوں سے چار ہوئیں ۔۔۔ اس نے وہ پُرشفقت چہرہ پہلی مرتبہ دیکھا۔ جو پدری محبت سے روشن تھا۔ اتنی سی دیر میں زہرا حمیدہ کا سانس پھول گیا۔ وہ آہستہ سے جھکی۔ اور اپنے باپ کی ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

پھر اس نے فوج کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اور چوبدار کو آگے آگے بھیج دیا گیا ۔۔۔ ساری شاہراہ پر پہرہ لگا دیا گیا۔ کوئی شخص اگر سڑک پر سے ہٹنے سے انکاری ہو۔ تو حبشی غلاموں کو اختیار تھا۔ کہ بغیر کسی جھجک کے اس کا سر اڑا دیا جائے۔

تھوڑی دیر میں شاہی سواری قصر سے روانہ ہوئی۔ شہزادیاں بادشاہ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے پالکیوں پر سوار تھیں۔ چہروں پر ریشمی نقاب پڑے تھے۔ جو کہ بے پناہ حسن کی کرنوں کو اچھی طرح روکنے کی قدرت تو نہ رکھتے تھے۔ البتہ انہیں دھندلا ضرور کر دیتے تھے۔ شاہی سواری دریا کے کنارے کنارے جا رہی تھی۔ غرناطہ تھوڑی دور رہ گیا تھا۔ کہ اچانک انہیں چند سواروں نے آلیا۔ یہ سوار بادشاہ کے ملازم تھے۔ اور غرناطہ جا رہے تھے۔ چونکہ انہیں شاہی سواری کے بالکل نزدیک آ گئے۔ اب وہ پیچھے تو ہٹ نہ

سکتے تھے۔ اس لئے سب سواروں نے گھوڑوں سے اتر کر اپنے چہرے خاک میں چھپا لئے۔ اور اپنے قیدیوں کو بھی اسی طرح کرنے کا حکم دیا۔

یہ تینوں قیدی وہی بدنصیب شہزادے تھے۔ جنہیں شہزادیوں نے جھروکے میں سے دیکھا تھا۔ ممکن ہے کہ شہزادے اس حرکت کا مقصد نہ سمجھ سکے ہوں۔ یا شاید اس طرح جھکنا انہوں نے اپنی شان کے خلاف سمجھا ۔۔۔ وہ جوں کے توں کھڑے شاہی جلوس کی طرف بے باک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

ایسی گستاخی اور حکم عدولی دیکھ کر بادشاہ کا خون کھول اٹھا ۔۔۔ اس نے طیش میں آکر اپنا خنجر نکالا۔ اور آگے بڑھ کر چاہتا تھا۔ کہ بائیں ہاتھ سے دیکھنے والوں کو شدید ضرب لگائے۔ جو ان میں سے ایک کے لئے تو ضرور مہلک ثابت ہوتی۔ کہ ایک دم شہزادیوں نے بادشاہ کو گھیر لیا۔ اور رحم کی درخواست کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ شرمیلی زہرا حمیدہ بھی اپنا حجاب بھول گئی۔ بادشاہ رک گیا۔ اتنے میں فوج کا ایک سردار آگے بڑھا۔ اور جھک کر بولا۔

"جہاں پناہ ان کے قتل سے دریغ فرمادیں۔ کیونکہ اس سے آپ کی رعایا میں سنسنی پھیل جائے گی۔ اور طرح طرح کی افواہیں اڑیں گی"

"مگر یہ شیطان ہیں کون ۔۔۔ ؟" بادشاہ نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ حاکم مراقش کے لڑکے ہیں۔ ان کے نام احمد۔ حامد اور حمید ہیں۔ یہ کہیں جا رہے تھے۔ ہم نے ان کا جہاز جبل الطارق کے نزدیک پکڑ لیا۔ انہوں نے بڑی ہمت کے ساتھ ہمارا مقابلہ کیا۔ اور شیروں کی طرح لڑتے ہوئے گرفتار ہوئے۔"

"اچھا تو اسی بدذات مراقش والے مداری کے لڑکے ہیں۔ جس نے ہمارے ساتھ اس قدر کمینہ سلوک کیا تھا۔ مگر منصور تو ان کا کرے گا کیا! ۔۔۔ ہمارے خیال میں تو ان کے سر کاٹ کر مراقش بھجوا دیئے جائیں۔ ان کا باپ ہمارا یہ شاہی تحفہ قبول کر کے واقعی بہت خوش ہوگا۔"

"نہیں نہیں۔ جہاں پناہ! مفت میں دشمنی بڑھانے سے کیا فائدہ۔ ان کی گرفتاری کی اطلاع مراقش دے دی جائے۔ امید ہے۔ کہ ہم ایک

بہت بڑی رقم بطور فدیہ وصول کر سکیں گے۔" منصور نے کہا۔

"ٹھیک ہے یونہی سہی۔ منصور تم بڑے عقلمند ہو۔ اچھا فی الحال انہیں الحمرا کے ساتھ والے سُرخ برجوں پر کام میں لگا دو۔ اُن سے جانوروں کی طرح کام لو۔" بادشاہ سب سے بڑی حماقت کر رہا تھا۔

منصور نے جھک کر سلام کیا۔ اور اپنے قیدیوں کو لیکر جلوس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

اسی کشمکش میں شہزادیوں کے نقاب الٹ گئے تھے۔ اس گفت و شنید کے دوران میں تینوں شہزادے حسین شہزادیوں کے چہروں کو اچھی طرح دیکھ چکے تھے۔ اور اس مختصر سے وقفے میں حُسن اپنا جادو اچھی طرح چلا چکا تھا۔

احمد سب سے بڑا تھا ——— اس کی نگاہیں صرف زاہدہ کے چہرے کا طواف کر چکی تھیں۔ حامد نے محض زہرا بدہ کے بے پناہ حسن کا مطالعہ کیا تھا۔ مگر سب سے چھوٹا حمید تھا۔ کہ بے طرح زہرا حمیدہ کے معصوم جمال پر کٹ مرا تھا۔ راستے میں کئی مرتبہ شہزادیوں نے مڑ مڑ کر نوجوان قیدیوں کو دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ غرناطہ پہنچ گئے۔ شہزادوں کو ان سُرخ برجوں پر کام کے لئے لگا دیا گیا۔ جنہیں آجکل ورمیلین ٹاورز کہا جاتا ہے۔

شہزادیوں کی جائے رہائش ——— الحمرا کے ایک خوبصورت برج میں تھی۔ یہ برج الحمرا کے قصر سے بالکل علیحدہ تھا۔ البتہ بیرونی فصیل نے اسے الحمرا کے قصر ہی میں شامل کیا ہوا تھا۔ برج کو ہر ممکن طریقہ سے سجایا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف ہرے بھرے باغات تھے۔ جن سے ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہواؤں کے جھونکے آیا کرتے تھے۔ برج کا صحن فواروں اور قسم قسم کے پودوں سے پٹا پڑا تھا۔ درختوں کی نازک ٹہنیوں میں سنہری پنجرے لٹکے ہوئے تھے۔ جن میں خوش گلو اور خوبصورت پرندے بند تھے۔

شہزادیوں کے برج کے ایک طرف تو قصر الحمرا کے سرخ سرخ ہشت پہلو برج اور اونچے اونچے مینار تھے۔ اور دوسری طرف ایک گہری خندق تھی۔ . . . . . جو الحمرا کے میدان کو جنرالیف

برج کو نہایت کاریگری سے چھوٹے چھوٹے خوبصورت کمروں، غلام گردشوں اور برآمدوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ وسط میں ایک وسیع ہال تھا جس کی دیواروں پر دمشق کے رنگین پردے آویزاں تھے۔ اور چھت پر مختلف قسم کے نقش و نگار کھدے ہوئے تھے۔ ہال کے سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ جس میں سنگ مرمر کا ایک فوارہ تھا۔ جو کہ رنگ برنگے معطر پھولوں سے گھرا ہوا تھا۔ فوارے سے ایک اونچی پانی کی دھار نکلتی تھی۔ جو چاند کی نورانی روشنی میں جھلمل جھلمل کرتی ہوئی ننھے ننھے قطروں میں بکھر جاتی ——— یہ قطرے موتیوں کی صورت میں نہایت آہستگی سے نیچے گرتے ——— اور ایک نہایت لطیف ترنم پیدا کرتے۔

شہزادیاں جب قصر سالوبرینا میں تھیں۔ تو ہر وقت ہشاش بشاش رہتی تھیں۔ مگر یہاں آتے ہی ان میں ایک زبردست تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ اب انکی طبیعت میں پہلی سی جولانی اور شگفتگی نہ تھی ——— وہ دلفریب مسکراہٹ اور نقرئی قہقہے اب رخصت ہو چکے تھے۔ اب وہ ہر وقت اداس رہتیں۔ ہر وقت کسی سوچ میں مستغرق رہتیں۔ اب وہ لذیذ سے لذیذ پھل معطر سے معطر پھولوں کو خاطر میں نہ لاتیں۔ رنگ برنگی پوشاکوں اور بیش قیمت جواہر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتیں۔ بلبلوں کے نغمے سنکر وہ جھنجھلا اٹھتیں۔ رات کے وقت فوارے کی مدھم سی آواز انہیں بے چین کئے رکھتی۔ وہ ساری ساری رات کسی سوچ بچار میں گذار دیتیں۔ رات کے خاموش لمحے اُن کے رفیق ہوتے۔ مسکراتا ہوا چاند۔ ٹمٹماتے ہوئے تارے اُن کے خیالات کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔ اور وہ گھنٹوں انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتیں ——— اور ہر وقت کیا سوچتی رہتی تھیں یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ قدسیہ بھی غمگین تھی ——— بادشاہ بھی شہزادیوں کی اس ناسمجھی بے چینی پر فکرمند تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ... قدسیہ کو بلایا۔ اور رازدارانہ طریق پر کہا۔ "دیکھو قدسیہ! میں انکی اس بے چینی کا سبب سمجھ گیا ہوں۔ اب وہ ... بہلانے سے یا گڑیا مینا اور چڑے چڑی کی کہانیاں سنکر خوش ... یا پھر اپنی توجہ پھلوں۔ پھولوں اور پرندوں کی طرف ... تفریح کے لئے اچھی چیزیں درکار ہیں

[illegible] ہیں ان کے لئے کیسے کیسے عجیب تحائف منگواتا ہوں
خاص طور پر بادشاہ نے عزلمے کے قیمتی سے قیمتی زیورات۔ نفیس سے
نفیس [illegible] ریشمی پوشاکیں اور ہر قسم کے تحائف۔
[illegible] ہیں۔ عدن کے موتی۔ کشمیر کی شالیں۔ غرضیکہ شہر بھر
[illegible] ایسی قابل تعریف چیز نہ رہی۔ جو کہ اس نے منگوائی ہو۔
ساری چیزیں لا کر شہزادیوں کے سامنے ڈھیر لگا دیا گیا۔
مگر انہوں نے ایک چیز سے بھی دلچسپی ظاہر نہ کی۔ [illegible] اسی طرح سہمی سہمی بیٹھی
رہیں۔ بادشاہ نے ناچار تھک کر قدسیہ کو بلایا۔ اور بولا۔
"قدسیہ! تم [illegible] ہو۔ کہ تم پر مجھے کس قدر اعتبار ہے۔ تم ایک عرصہ
تک میری ماں [illegible] ہو۔ میں تمہیں سلطنت بھر میں سب سے زیادہ
دانشمند اور عاقل عورت تصور کرتا ہوں۔ میری دلی خواہش ہے۔ کہ میں
اس عجیب [illegible] لگاؤں۔ جو آجکل شہزادیوں پر مسلط ہے۔
یہ تم بھی جانتی ہو۔ کہ میں ان سے ان کے بارے میں ایک حرف
بھی نہیں پوچھ سکتا۔ کیونکہ میرا رعب یا کچھ ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ فقط تم ہی
اس [illegible] ہو۔ لہذا میں چاہتا ہوں۔ کہ تم اس راز کو خاطر خواہ معلوم کرو
اور مجھے [illegible] دو۔"

قدسیہ [illegible] بجا لائی۔ اور رخصت ہو کر شہزادیوں کے پاس پہنچی۔
شہزادیاں سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔ قدسیہ نے انتہائی شفقت
سے زاہدہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر محبت سے بولی۔
"تو دیکھ بیٹی! تمہارا اس طرح گم سم رہنا کسی کو نہیں بھاتا۔ ہنس بول
[illegible] کھیل کود میں حصہ لے۔ یہ دیکھ تیرے باپ نے تیرے لئے
کیا کیا ہے! تمہاری تفریح و آسائش کے لئے اس نے کوئی دقیقہ
[illegible] سوچ۔ اس عجیب خاموشی سے اس کے دل کو کیسی
[illegible] ہے۔ وہ ایک عرصے سے بے چین ہے۔ آخر مجھے
بھی بتا کیا بات ہے؟ بول تو سہی!" زاہدہ نے کوئی جواب نہ
[illegible] سامنے لٹکے ہوئے سنہری پنجرے کی طرف

"دیکھو بیٹی زاہدہ! اگر تو کہے۔ تو تیرے لئے عزلمے کا وہ مشہور
طوطا منگوا دوں۔ جو بالکل انسانوں کی طرح باتیں کرتا ہے۔ ایسی میٹھی میٹھی
باتوں کا وہ تار باندھتا ہے۔ کہ سننے والے لٹو ہو جاتے ہیں۔"
زاہدہ ناک بھوں چڑھا کر بولی۔
"توبہ توبہ۔ ایسے بدتمیز مغز چاٹنے والے پرندے کو تو میں ہرگز
نہیں دیکھنا چاہتی۔ پھر طوطا بھی کوئی پرندہ ہے۔ جب دیکھو ڈھائی ہاتھ
کی زبان کتر کتر چلتی رہتی ہے۔"
قدسیہ زہرزاہدہ کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔
"اچھا بیٹی زہرا زاہدہ تو ہی بتا۔ تیرے لئے جبل الطارق کا عجیب
بندر کیسا رہے گا۔ جو ایسی ایسی حرکتیں کرتا ہے۔ کہ انسان ششدر
رہ جاتا ہے۔"
"بندر! لاحول ولاقوۃ۔ کتنا مکروہ جانور! پھر انسان کی نقلیں اتارتا
ہوا تو مجھے اتنا برا لگتا ہے۔ کہ اگر بس چلے۔ تو کمبخت کا منہ نوچ ڈالوں۔
نہ نہ قدسیہ! بس بخشو مجھے تو!"
یہ کہہ کر زہرا زاہدہ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔
"کیوں زہرا زاہدہ! تو تو بڑی پیاری بیٹی ہے۔ ننھی اگر تیرے
دل کو خوش کرنے کے لئے میں امیر طلیطلہ کے حرم سے قاسم نامی حبشی
گوئیے کو منگا دوں۔ تو تجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور دیکھ تو سہی۔
اس کی آواز بالکل عورتوں کی سی ہے۔ بڑا مست ہو کر گاتا ہے۔
دنیا مبہوت رہ جاتی ہے۔"
"اول تو مجھے ان سیاہ فام حبشیوں سے ہی ڈر لگتا ہے۔
اور پھر ——"
"توبہ ہے الٰہی۔" قدسیہ نے چیخ کر کہا۔ "یوں بھی نہیں یوں
ہی نہیں! تو پھر آخر تم چاہتی کیا ہو! جسے کہتی ہوں۔ ٹکا سا جواب
مل جاتا ہے۔ اچھا ہاں تو کیا کہہ رہی تھی۔ زہرا زاہدہ! ایک تو تجھے
حبشیوں سے ڈر لگتا ہے۔ پھر اور کیا ہوتا ہے ——؟"
"ہونا کیا تھا۔ دراصل مجھے آج کل موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں
رہی۔ پرانے نغمے سن سن کر تنگ آ چکی ہوں۔" زہرا زاہدہ بولی۔

"خیر! بیٹی یہ تو تو مت کہہ۔ موسیقی سے تو تجھے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ اگر تو وہ راگ سن لے۔ جو کل دوپہر میں نے ان مرآتش کے شہزادوں کو گاتے سنا۔ تو یقیناً تیرا دل بھی میری طرح موسیقی کا شیدا ہو جائے ارے یہ تم شرماتی کیوں ہو؟ —— میں نے ایسی بات کیا کہہ دی —— بولو نا —— ؟"

"کہے جاؤ بھی! —— چپ کیوں ہو گئیں؟" زاہدہ بولی۔

"اں تو کل دوپہر میں سامنے کے برجوں کی طرف جا رہی تھی —— وہاں میں نے ان تینوں شہزادوں کو دیکھا۔ جو سستانے کے لئے ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ باقی سب مزدور سو رہے تھے نگران میں سے ایک تو طنبورہ بجا رہا تھا۔ باقی کے دو باری باری ایک مست عربی گیت الاپ رہے تھے۔ کئی سپاہی بُت بنے چپ چاپ سُن رہے تھے۔ اور تو کیا ہوگا۔ مجھ سی خشک دل عورت بھی ایسے دل میں اتر جانے والے نغمے سنکر تڑپ گئی۔ اور بہت دیر تک میں کھڑی سُنا کی۔ اپنے وطن کے گانے سنکر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور پھر اپنے ملک کے شہزادوں کو اس حالت میں دیکھ کر میری روح بیقرار ہو گئی۔ مگر میرا بس ہی کیا چلتا ہے۔ چپ چاپ روتی ہوئی واپس آ گئی۔"

"کیوں قدسیہ، ہمیں وہ گانا نہ سناؤ گی؟" زاہدہ نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"بس ذرا سی دیر کے لئے!" زہرا ہدہ بولی۔

شرمیلی زہرا بیدہ کچھ نہ بولی۔ بلکہ قدسیہ کے گلے میں باہیں ڈالکر لپٹ گئی۔

لڑکیو ذرا ہوش کی بات کرو۔ اگر اپنا نہیں تو میرے اس سفید چونڈے ہی کا لحاظ کرو۔ اگر تمہارے ظالم باپ کے کان میں اس بات کی ذرا سی بھنک پڑ جائے گی۔ تو خدا جانے کیا آفت ڈھائے گا۔ مانا کہ یہ اونی بنے کے قیدی نہیں تمہاری طرح ہی بادشاہزادے ہیں۔ مگر ان کا باپ تمہارے باپ کا جانی دشمن ہے۔ اچھا اب ایسی گفتگو کو تو ڈالو ماڑمیں اور ستار لیکر کوئی اچھی سی چیز سناؤ۔

مگر لڑکیوں کو تو ضد ہو گئی تھی۔ تریا ہٹ ویسے بھی مشہور ہے۔ ایک تو نسوانی ضد اور پھر جوانی کی ضد۔ خدا کی پناہ! [illegible] کا ڈر نہ کسی آفت کا اندیشہ —— ! تینوں بہنوں نے قدسیہ [illegible] میں دم کر دیا۔ اُٹھتے۔ بیٹھتے۔ جاگتے۔ سوتے۔ بس ایک ہی [illegible] رہ گیا تھا جس کی تسبیح لڑکیاں ہر وقت کیا کرتی تھیں۔ آخر کئی روز تک لگاتار کوشش کے بعد شہزادیاں بڑی منت سماجت کر کے قدسیہ کو بہلا پھسلا کر اپنے ڈھب پر لے ہی آئیں۔ قدسیہ نے دل میں [illegible] "اتنی سی معمولی بات کے لئے شہزادیوں کا دل توڑنا سراسر بے [illegible] تو اور کیا ہے! اور پھر وہ قیدی کون سے ان کے موتی توڑ لیں گے ٹکڑوں کو دور بٹھا کر ذرا سی دیر کے لئے انہیں گانا سنا دوں گی۔ چلو قصہ ختم ہوا۔ سلام کی خاطر کیوں بہاں اٹھائیں؟ —— !"

تینوں شہزادے ایک حبشی داروغہ حسین بابا کی نگرانی میں سارا دن کام کیا کرتے تھے۔ حسین بابا ایک کالا کلوٹا، فربہ اندام، زبردست [illegible] کا ادھیڑ عمر کا حبشی تھا۔ جس کے دہنے ہاتھ کا تھپڑ غرناطے بھر میں مشہور تھا۔ بس جسے دل لگا کر ایک تھپڑ جما دیتا۔ تو وہ غریب وہیں کا وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا۔

قدسیہ علے الصبح حسین بابا کے پاس گئی۔ اور اسکی مٹھی میں ایک سونے کا سکہ دے کر مسکراتی ہوئی بولی۔

"حسین بابا۔ ایک کام کر دو۔ تو بتاؤں بھی —— وہ سامنے [illegible] نا! ہاں ہاں۔ وہی اس اونچے درخت کے پچھواڑے۔ بس اسی [illegible] بادشاہ سلامت کی تینوں بیٹیاں رہتی ہیں۔ آج کل وہ کچھ [illegible] جس سے مجھ نگوڑی کا برا حال ہو رہا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟" حسین بابا نے اپنی چوڑی [illegible] ہوئے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ یہ تمہارے تین نئے قیدی موسیقی کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ بہت اچھا گاتے ہیں۔ [illegible] نہیں رہتی۔ اگر تم کوئی اعتراض نہ [illegible] تو شہزادیاں [illegible] ان کا گانا سُن لیں۔ ذرا سی تو بات ہی ہے۔ کیوں حسین [illegible]"

"سبحان اللہ [illegible]"

خندق ہے نا۔ کہ آج دوپہر تک میرا بسورتا ہوا سر خود میرے ہی برج کے کنگرے پر ٹانگ دیا جائے۔ اور یہ سب سپاہی اور قیدی مجھ پر ہنسیں۔

خدا نہ کرے جو کبھی ایسی حرکت! بادشاہ سلامت بھی دیکھے ہیں؟"

نہیں نہیں! تم سمجھے ہی نہیں داروغہ جی۔ دیکھو میں تمہیں ایک تدبیر بتاتی ہوں کہ سانپ بھی مر جائے۔ اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ وہ جو برج کے سامنے خندق ہے نا ـــ وہی گہری سی خندق ـــ بس آج وہیں ان قیدیوں کو کام پر لگا دو۔ دوپہر کو یہ تھک کر خود ہی گائیں گے۔ بس قصہ ختم ہوا۔ لڑکیاں بھی سن لیں گی ـــ اور بادشاہ کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ تمہیں بھی تمہاری اس مہربانی کا معاوضہ خاطر خواہ ملے گا۔"

قدسیہ حسین بابا کو رضامند دیکھ کر قدرے مسکرائی۔ اور پھر اس کی کھردری ہتھیلی پر چپکے سے ایک سونے کا چمکدار سکہ رکھ کر آہستہ سے واپس چلی آئی۔

اسی روز دوپہر کو تینوں شہزادوں کو شہزادیوں کے برج کے نیچے خندق میں کام پر لگا دیا گیا۔ جب وہ تھک گئے۔ تو حسین بابا نے تھوڑی دیر کے لئے سب قیدیوں کو چھٹی دے دی۔ باقی کے قیدی تو درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں سو گئے۔ مگر تینوں شہزادے پھولوں کے درمیان جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ایک نے طنبورہ لے کر بجانا شروع کیا۔ اور باقی کے دونوں نے مل کر ایک نہایت ہی مست لے میں گانا شروع کیا۔

پہرے دار اپنی جگہ کھڑے اونگھ رہے تھے۔ برج اگرچہ بلند تھا۔ مگر پھر بھی گانے کی آواز اوپر صاف سنائی دیتی تھی۔ تینوں شہزادیاں جھروکے میں بیٹھی بڑے غور سے گانا سن رہی تھیں۔ ان کے دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔ یکایک قدسیہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ اور چیخ کر بولی۔ "غضب خدا کا تم کچھ سمجھ بھی رہی ہو۔ یہ کیا گا رہے ہیں؟"

"ہاں کیا گا رہے ہیں!" زاہدہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"توبہ ـــ توبہ توبہ اتنی بدتمیزی تو میں نے آج تک کبھی نہیں دیکھی۔ ... تمہیں مخاطب کر کے گا رہے ہیں!

... ـــ !" زہرا بولی۔

... شہزادے اور بھٹی میں جائے ان کا راگ میں ابھی ابھی انہیں اس گستاخی کا مزہ چکھائے دیتی ہوں۔ حسین بابا سے اتنے کوڑے لگواؤں گی۔ کہ طبلا ہی تو اٹھیں گے۔ اور یہ محبت بھرے نغمے ناک کے رستے نکل جائیں گے۔"

"نہیں نہیں! ابھی قدسیہ۔ نہ معلوم وہ کسے مخاطب کر رہے ہوں۔ اور شاید کسی کو بھی نہ مخاطب کرتے ہوں۔ ویسے ہی اپنا دل بہلا رہے ہوں۔ جانے بھی دو۔ کیوں مفت میں کسی کا دل دکھانا" زاہدہ بولی۔ قدسیہ تڑی بدل عورت تھی۔ ذرا سی مست خوشامد سے کیسی ہی بات مان لیتی تھی۔ اس نے شہزادیوں کے دو دلہن چہروں کو غور سے دیکھا۔ جن پر آہستہ آہستہ سرخی کی جھلک آ رہی تھی۔ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ مگر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور غنودگی کی حالت میں جھروکے سے سر لگا کر لیٹ گئی۔

جب شہزادے اپنا گانا ختم کر چکے۔ تو کچھ دیر تو فضا میں خاموشی طاری رہی۔ پھر زہرا بیدہ نے ستار ہاتھ میں لیا۔ اور نہایت ہی پیاری مگر تھرتھراتی ہوئی آواز میں ایک عربی گیت شروع کیا۔

"خوشبودار پھول پتوں اور کانٹوں میں چھپا ہوا ہے۔

وہ زمین کی دلفریبیوں سے ناواقف ہے۔

مگر بلبل کے دردناک نغموں کو وہ غور سے سنتا ہے۔

وہ دھڑکتے ہوئے دل سے سنتا ہے اور سر دھنتا ہے"

اس خفیہ ملاقات کے بعد طرفین کے حوصلے بڑھ گئے۔ اب تینوں شہزادے روزانہ اسی برج کے نیچے کام کرتے۔ اور حسین بابا دن بدن شفیق ہوتا گیا۔ وہ نارنگی کے ایک پیڑ کے نیچے سو جاتا۔ اور زور زور سے خراٹے لینے لگتا۔ ادھر یہ ملاقاتیں جو محبت بھرے نغموں کے ذریعہ سے ہوا کرتیں ترقی کرتی گئیں۔

بعض اوقات جب تمام پہرہ دار سو رہے ہوتے۔ تو شہزادے اپنے طنبورے سے ایک عجیب سُر نکالتے۔ جسے سن کر شہزادیاں جھروکے میں آ کر اپنا جمال دکھا دیتیں۔ اور کبھی کبھی جب شہزادے معہودہ نشانی دے کر نیچے کو دبک جاتے۔ یا کسی پھولدار پودے کے پیچھے چھپ جاتے۔ تو شہزادیاں اپنی لمبی لمبی گردنیں جھروکے سے نکال کر نیچے جھانکا کرتیں ـــ نغموں کے علاوہ اپنے دلی جذبات کے اظہار کا

ایک اور طریقہ نکالا ہوا تھا ـــ مختلف پھولوں کو مختلف طریقوں سے رکھ کر کسی
خاص جذبے کا اظہار ہوتا تھا۔ شہزادے اچھی طرح سمجھتے تھے۔ شہزادیاں
جھروکے سے باہر سے آتی جھانکا کرتیں۔ اس کے ذریعے ان کی لامحدود محبت کا
اظہار ہوتا۔

ان تمام مشکلات کے ہوتے ہوئے بھی محبت بجائے دبنے کے
دونی بڑھ رہی تھی ـــ عشق کا یہ بیان ستہ دن بدن تیز ہو رہا تھا۔ کیوں کہ
نخل محبت خشک آب و ہوا میں خوب سرسبز ہوتا ہے۔ اور بنجر زمین میں دُگنا
پھلتا پھولتا ہے۔ شہزادیوں کے لبوں سے اب مسرت ٹپکتی تھی۔ اب
وہ بات بات پر مسکرا پڑتی تھیں۔ مادر سا اس حیرت انگیز تبدیلی پر پھولا نہ
سماتا۔ اور قدسیہ کی سہیلیوں کے دل کے بل باد ہوتیا۔

ان پوشیدہ ملاقاتوں کا علم یا تو قدسیہ کو تھا۔ اور یا حسین بابا کو۔
قدسیہ اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتی۔

یکایک ملاقاتوں کا سلسلہ یکلخت بند ہوگیا۔ کیوں کہ کئی روز سے شہزادے
نیچے کام کر رہا تھا۔ اور ادھر شہزادیاں اسیر بلبلوں کی طرح غمناک لیے
گاہیں۔ جھروکے سے نیچے جھانکتیں۔ اپنی ہنس جیسی گردنیں نکال کر ادھر
اُدھر دیکھتیں۔ اپنی نگاہیں شہزادوں کو تلاش کرتیں۔ گھنٹوں وہیں میٹھی سرد
آہیں بھرا کرتیں۔ مگر نیچے سے کوئی جواب نہ ملتا۔

ایک روز قدسیہ منہ لٹکائے اندر داخل ہوئی۔ اور بولی۔
"میں پہلے ہی سمجھتی تھی۔ کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اچھا شہزادیو! اب
اپنے ستار کھونٹیوں سے لٹکا دو۔ اور چپ چاپ بستروں میں جا دبکو۔
حاکم مراتش نے اپنے بیٹوں کی رہائی کے لئے مطلوبہ رقم بھیج دی ہے۔
اب شہزادے بالکل آزاد ہیں۔ اور مراتش جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔
شہزادیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے قدسیہ کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر ادھر
ادھر ہو گئیں۔ زاہدہ ایک قالین پر لیٹی ہوئی تھی ـــ اس کا سر ایک نرم
تکیے پر تھا۔ اسے بار بار احمد کی بے وفائی پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ بڑبڑائی۔
"اگر جانا ہی تھا۔ تو بتایا کیوں نہیں! شاید میں کوئی نشانی دے دیتی۔ یا
پھر کوئی اور صورت نکالتی۔ قدسیہ سچ کہتی تھی۔ کہ سب مرد بے وفا ہوتے
ہیں ـــ پھر رونے لگی۔

زہرا بہ و ایک آئینہ کے سامنے کھڑی [illegible] رو رہی تھی۔ [illegible]
سے اس کے لبوں سے شکایت کا ایک حرف تک نہ نکلا۔ ہاں ایک سرد آہ
کی سرد آہ کے ساتھ ایک نام سنائی دیا۔ اور وہ نام حامد کا تھا۔ شرمیلی لیلیٰ
نے اپنے غم کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ بلکہ اپنا سر سنگ مرمر کی سل کے ساتھ
لگا کر اسی جھروکے میں بیٹھ گئی۔ اسکی نگاہیں نیچے باغیچے پر تھیں۔ اور آنکھوں
سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپک رہے تھے۔ اور پھر انہی پھولوں پر گر رہے تھے۔
جہاں کبھی وہ اور حمید بیٹھا کرتا تھا۔

قدسیہ نے تسلی دینے کے لئے لڑکیوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔
اور کہنے لگی۔

"بس اتنے رنج سے نڈھال ہو گئیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے بیٹیو!
یہ تو پہلے ہی سے نظر آتا تھا۔ بھلا کہاں وہ اور کہاں تم! پھر تمہیں ان مردوں
پر اعتبار کرنے کو کس نے کہا تھا؟ جب تمہاری عمر مجھ جتنی ہو جائے گی۔ تب
تم ان مردوں کی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف ہو جاؤ گی۔ موئے سب
کے سب بے وفا ہوتے ہیں۔ میں حلفیہ کہتی ہوں۔ کہ ان شہزادوں کے
دل مراتش کی خوبصورت لڑکیوں کے گیسوؤں میں بے طرح اُلجھے ہوں گے۔
اور وہاں پہنچتے ہی یہ پھر ان کے جھروکوں کے نیچے طنبورے لئے محبت کے
گیت گایا کریں گے۔ اور اشارہ بازیاں ہوا کریں گی۔ اور تمہیں! بس بیٹیو
شہزادیو! تمہیں بالکل بھول جائیں گے۔ کہ غرناطہ کے برج میں [illegible]
جانے بھی دو اب! اچھا ہوا دفع ہوئے۔ ان کا خیال دل سے نکال دو۔ [illegible]
ادھر اُدھر کھیل کود میں غم غلط کرو۔"

قدسیہ کے اس تسلی آمیز جملوں نے شہزادیوں کے زخمی دلوں پر نمک
کا کام کیا۔ ان کا رنج دوگنا ہو گیا۔ وہ دو دن تک بالکل کھوئی کھوئی سی دنیا و مافیہا
سے بے خبر۔ چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ تیسرے روز صبح صبح قدسیہ [illegible]
غصے سے کانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اور چلا کر بولی:

"اے خدا غارت کرے ان کمبختوں کو! [illegible]
میں ڈال رکھی ہے۔ توبہ توبہ ایسی دیدہ دلیر [illegible] میں نے آج تک
نہیں دیکھی۔ خیر مجھے اس [illegible]
لڑکیو خبردار! جو تم نے پھر ان کافر شہزادوں کا [illegible]

"کیا کہا! — یہ تو بڑی خوشی کی بات کیا ہے!!" زاہدہ بولی۔

"میرا [illegible] ہونے میں کسر ہی باقی رہی ہے۔ وہ ہو گیا ہے۔ [illegible] نے دیکھا۔ نہ سنا۔ وہ باجی شہزادے جیسے [illegible] — مجھ سی دور اندیش اور دانشمند عورت کو بہکانے [illegible]۔ انہوں نے مجھے تمہارے فرار کی ترغیب دی ہے [illegible] کہ تمہیں اپنے ساتھ مراقش بھگا لے چلیں۔ اچھی طرح سن [illegible]! ابھی کچھ اور بھی سنو گی!" قدسیہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شہزادیوں کے چہرے فق ہو گئے۔ انہوں نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر جرأت نہ پڑی۔ قدسیہ نے سسکتے ہوئے کہا: "خدا کی قدرت! میری قسمت میں بھی کس طرح سے ذلیل و خوار ہو کر مرنا لکھا تھا! بادشاہ کو مجھ پر کس قدر اعتبار ہے!"

تینوں شہزادیاں ایک دوسری کی طرف ٹکٹکی باندھے تک رہی تھیں زبانوں کو گویا قفل لگ گئے تھے۔

آخر زاہدہ ہمت کر کے بولی۔ "بس بس رونے چلانے کی کیا بات ہے! بالفرض اگر ہم ان کے ساتھ جانے پر رضامند ہوں۔ تو کیا یہ ممکن ہے؟"

"ممکن نہیں تو اور کیا ہے۔ بالکل یقینی امر ہے۔ شہزادوں نے داروغہ حسین بابا کو اچھی طرح سے رشوت دے دی ہے۔ اور اس کے ساتھ مل کر سب کچھ طے کر لیا ہے۔ بس تمہاری رضامندی کی دیر ہے۔ مگر ذرا اپنے باپ کا تو خیال کرو۔ اسے مجھ پر کس قدر اعتبار ہے۔ جب وہ اپنی پیاری بیٹیوں کی یہ کرتوت سنے گا۔ تو دل میں کیا کہے گا — کتنا اعتماد ہے اسے مجھ پر" قدسیہ بولی۔

زاہدہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر بولی۔ "اگر ہمارے والد کو کسی پر اعتبار ہو گا۔ تو وہ تمہاری ذات پر ہو گا۔ ہم پر تو انہیں مطلق بھروسہ [illegible] اپنی اولاد پر اعتبار ہوتا۔ تو وہ ہمیں اس طرح مقفل [illegible] تم پر اعتبار کرتے ہیں۔ اور کیا ان بھاری بھاری [illegible] سنگ سرخ کی ان مضبوط فصیلوں [illegible] — ہماری حیثیت یہاں شہزادیوں کی سی تھوڑا ہی ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں ایسے ہیں۔ جیسے قیدی پنچھی —!"

قدسیہ نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور آنسو پونچھ کر بولی۔

"یہ تو واقعی درست ہے۔ اس کا سلوک تم سے نہایت غیر منصفانہ ہے۔ تمہیں اس طرح سے قید رکھنا اسے ہرگز زیب نہیں دیتا۔ اس قید میں تمہاری جوانی — تمہارا حسن و جمال فضول ضائع ہو رہا ہے۔ تمہیں دنیا کی دلفریبیوں کا اتنا سا بھی علم نہیں! تم کیا جانو کہ اس عمر میں زندگی کس قدر پُرلطف ہوتی ہے۔ آخر وہ کب تک تمہیں یونہی قید رکھے گا؟ — کبھی تمہیں آزاد بھی کرے گا یا نہیں؟ شائد اس وقت آزاد کرے۔ جب تمہاری عمر ڈھل جائے گی — مگر لڑکیو پھر بھی سوچو تو سہی۔ تم ایک غیر ملک کو اپنے پیارے وطن پر کس طرح ترجیح دے سکتی ہو؟"

"کیوں غیر ملک کیوں ہونے لگا۔" ساجدہ بولی۔ "کیا ہماری والدہ مراقش کی نہ تھیں۔ اگر وہ آج زندہ ہوتیں۔ تو وہ ہمیں کئی مرتبہ وہاں لے گئی ہوتیں اور پھر یہ آپس کی دشمنی۔ جو آجکل ابا اور مراقش کے حاکم کے درمیان ہے کبھی بھی نہ ہوتی۔"

"یہ تو سب کچھ درست ہے۔ مگر پیاری بچیو۔ تم مجھے یہیں قید میں سڑنے کو چھوڑ جاؤ گی۔ پھر تمہارے باپ جیسا کٹر بادشاہ خدا معلوم مجھے کن کن عذابوں سے مارے" قدسیہ بولی۔

"نہیں نہیں قدسیہ! بھلا تمہیں ہم کس طرح چھوڑ سکتے ہیں۔" زاہدہ بولی۔ "تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلنا!"

"بہت اچھا! میں نے کل شام حسین بابا سے گفتگو کی تھی۔ اس نے مجھے یقین دلایا تھا۔ کہ اگر میں اس کے ساتھ مراقش چلی چلوں۔ تو وہ میری خبرگیری کرے گا۔ اور وہاں پہنچ کر مجھ سے شادی بھی کرے گا کیونکہ حسن بابا کی مرتے دم تک یہی خواہش رہی۔ کہ کسی طرح وہ اپنا ملک ایک مرتبہ اور دیکھ لے۔ مگر تمہارے ظالم باپ نے بالکل اجازت نہ دی۔ اچھا تو اب تیار ہو جاؤ۔ میں حسین بابا سے سب کچھ طے کئے لیتی ہوں۔"

ادھر شہزادیوں میں سب سے بڑی زاہدہ تو فوراً رضامند ہو گئی

زہرا بھی تھوڑی سی رد و قدح کے بعد تیار ہو گئی۔ مگر زہرا حمیدہ تھی۔ کہ برابر انکار کئے جا رہی تھی۔ کیونکہ وہ بہت ہی شرمیلی اور کمزور دل تھی۔ آخر دونوں بہنوں کے قدسیہ کے مجبور کرنے پر اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اثبات کے طور پر سر ہلایا۔

جس اونچی پہاڑی پر الحمرا بنا ہوا ہے۔ وہ کبھی زمانے میں زمین دوز سرنگوں سے کٹی ہوئی تھی۔ سرنگیں چٹانوں میں اس صفائی سے کاٹی گئی تھیں۔ کہ نیچے خواہ کچھ ہی ہوتا رہے۔ اوپر والوں کے فرشتوں تک کو پتہ نہ چلتا تھا۔ کئی سرنگیں تو قصر الحمرا سے آس پاس کے محلوں اور قلعوں میں جا ملتی تھیں۔ اور بعض لمبی سرنگیں تو بہت دور دریائے ڈارو یا دریائے زنیل کے کنارے چھوٹی چھوٹی بندرگاہوں میں جا نکلتی تھیں۔ یہ سرنگیں پرانے وقت کے مسلمان بادشاہوں نے اپنی حفاظت کے لئے بنوائی ہوئی تھیں۔ تاکہ خطرے کے وقت فوراً نیچے نیچے کہیں دور پہنچ جائیں۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ آجکل یہ سرنگیں بالکل معدوم ہو گئی ہیں۔ کچھ تو مٹی اور کوڑے کرکٹ سے اٹی پڑی ہیں۔ اور کچھ بھونچال کے جھٹکوں سے بالکل بند ہو گئی ہیں۔

انہی میں سے ایک چھوٹی سی سرنگ حسین بابا نے چنی۔ جو کہ برج کے قریب ہی سے شروع ہو کر فصیلوں کے نیچے سے نکلتی ہوئی شہر سے باہر ایک کھنڈر میں ختم ہوتی تھی۔ اور یہ طے پایا۔ کہ تینوں شہزادے، چار نہایت تیز عربی النسل گھوڑے لے کر شہر کے باہر کھنڈر میں آدھی رات کو بالکل تیار ہیں۔

خدا خدا کر کے مقررہ رات آئی۔ شہزادیوں کے برج کو حسب معمول مقفل کر دیا گیا۔ اور الحمرا پر خاموشی طاری ہو گئی۔ قدسیہ اوپر جھروکے میں بیٹھی نیچے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی — حسین بابا کے مقررہ اشارے کی منتظر تھی۔ آدھی رات کے قریب حسین بابا نے برج کے نزدیک آکر سیٹی بجائی۔ قدسیہ نے نیچے جھک کر ہاتھ ہلا دیا۔ کہ ہم تیار ہیں۔ پھر اندر جا کر شہزادیوں کو ہوشیار کر دیا۔ اور ایک ریشمی کمند جھروکے کے ستون سے باندھ کر نیچے لٹکا دیا۔ شہزادیوں کو پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے خود کمند کو مضبوطی سے پکڑ کر اترنے لگی۔ زاہدہ اور زہرا مہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کمند کو پکڑا۔ اور آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگیں۔ اب سب سے چھوٹی زہرا حمیدہ کی باری آئی۔ وہ کمند پکڑتے وقت ذرا جھجکی۔ اور قدم پیچھے ہٹا لیا۔ پھر دل کڑا کر کے قدم کمند پر رکھا۔

مگر کسی جذبۂ بے اختیار سے مغلوب ہو کر واپس ہٹ گئی۔ اس کا دل [illegible] سے دھڑک رہا تھا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر [illegible] کمرے پر نظر ڈالی۔ اس نے اس ریشمی پردوں اور قالین سے سجے ہوئے قفس میں کتنے دن خوشی خوشی گزارے تھے۔ مانا کہ وہ ایک قیدی کی طرح اس میں رہتی تھی — مگر پھر بھی وہ اس میں محفوظ تھی — بڑی ساری میں پناہ گزین تھی۔ مگر وہ فرار ہو گئی۔ تو اس شری دنیا میں خدا جانے کیا کیا مصیبتیں پیش آئیں! — اس برج سے نیچے اترتے ہی نہ معلوم کون کون سی مصیبتیں اس کی منتظر ہوں گی؟ جب حمید کا خوبصورت چہرہ اس کی خوبصورت آنکھوں کے سامنے پھرتا۔ تو اس کا کانپتا ہوا پیر خود بخود آگے بڑھ جاتا۔ مگر جب اس کے تصور میں اپنے پیارے باپ کا پُر جلال چہرہ آجاتا۔ تو فوراً پیچھے ہٹ جاتی۔ اس کے نازک سینے میں خیالات کا طوفان برپا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ اس نے جھک کر رات کی تاریکی میں نیچے کی طرف نگاہ ڈالی — اس کی بہنیں منتیں کر رہی تھیں۔ اور زور زور سے قسمیں کھا رہی تھیں۔ بہنیں ہاتھ ہلا ہلا کر اسے نیچے بلا رہی تھیں۔

اس نے ایک مرتبہ ہمت کر کے فیصلہ کیا۔ کہ دل کڑا کر کے [illegible] لذت کو چکھ ہی لے۔ مگر جب گناہ کی تلخی اور خطرات سامنے آئے [illegible] ہمت ٹوٹ گئی۔ شہزادیوں کا اس طرح برج کے نیچے کھڑا رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ پہرے دار ادھر اُدھر گشت لگا رہے تھے [illegible] حسین بابا نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔

"شہزادی صاحبہ! کیا غضب کر رہی ہو! یہ سوچنے اور [illegible] کا وقت نہیں ہے۔ ہم چاروں طرف سے پہرے والوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ آپ فوراً تشریف لے آئیں۔ ورنہ ہمیں اجازت دیں!"

زہرا حمیدہ نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ گویا وہ ایک اٹل فیصلہ کرنے والی تھی۔ یکایک اسے اپنے والد کی پدری شفقت یاد آگئی — آہ! کس قدر نورانی چہرہ — محبت کی کرنوں سے چمکتا ہوا چہرہ! کیسی دلفریب مسکراہٹ! پھر اس نے [illegible] محبت سے [illegible] بٹھا کر پیار کیا تھا — [illegible] اپنے [illegible]

[illegible] نہیں کر سکتی ـــــ وہ اپنی خوشیوں کو اپنے والد کے مقابلے میں ہزار بار قربان کر سکتی تھی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کمند کھولی۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے پھینک دیا۔ پھر نیچے جھک کر رُوتی ہوئی بولی:۔

"اب نیچے آنا میری طاقت سے باہر ہے۔ پیاری بہنو مجھے اس غداری کے لئے معاف کرنا۔ میں مرتے دم تک تمہیں یاد کیا کروں گی! اب جاؤ مجھ بدنصیب کو یہیں سڑنے دو۔ اور اپنے دنیاوی جنت میں مزے اڑاؤ۔ خدا تعالے تمہیں خوش رکھے۔ اور ہر آفت سے بچائے۔"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور آخری مرتبہ اپنی بہنوں کو دیکھا جن کے ساتھ اس نے اتنے دن گزارے تھے۔ پھر واپس کمرے میں چلی گئی۔ اور ایک گدیلے پر لیٹ کر رونے لگی۔ زاہدہ اور زہرا اپنی چھوٹی بہن کی اس حرکت پر تھرا اٹھیں۔ مگر حسین بابا جلدی کر رہا تھا۔ یہ وقت ٹھہرنے اور سوچنے کا ہرگز نہ تھا۔ اس لئے مجبوراً زہرا ہیدہ کو چھوڑ کر سرنگ میں داخل ہوئیں۔ تھوڑی سی دیر میں یہ چاروں شہر کے باہر تھے۔ تینوں شہزادے چار گھوڑے لئے کھڑے تھے۔ حمید نے جب دیکھا کہ زہرا ہیدہ نہیں آئی۔ تو مچل گیا۔ اور آنسو پونچھتے ہوئے آگے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ بھائیوں نے بہترا سمجھایا بجھایا۔ مگر وہ یہی کہے گیا۔

"تم جاؤ۔ میں اُسے لیکر ہی آؤں گا!"

آخر بڑے بھائی احمد نے ناراض ہو کر کہا۔ "حمید دیوانہ ہوا ہے۔ اگر موقعہ ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ کم از کم ہماری خوشیوں کا ہی خیال کرے۔ تجھے چھوڑ کر ہم کس طرح چلے جائیں۔ آچل سعادتمند بن! تو چھوٹا بھائی ہے۔" حمید نے برج کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈا سا سانس بھرا ـــ جس کے ساتھ ایک آنسو [illegible] ـــ ایک آنسو۔ محبت کی ناکامی و نامرادی کا راز دان روح کی [illegible] رفیق۔ دل کی آگ کا شاہد! اس نے پھر ایک مرتبہ حسرت بھری [illegible] سے اسی جھروکے کی طرف دیکھا۔ جہاں اس کی روح اس کی امید [illegible] تھی۔ جہاں معشوقہ پر ایک تجلی سی گر پڑی۔ اسکی آنکھوں سے آنسوؤں [illegible] وہ اسی جھروکے سے کبھی کبھی وہ اپنا جمال دکھایا کرتی تھی [illegible] کھیل دیکھنے جاتے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی

چیز دل کو مسوس رہی ہے۔ آہستہ آہستہ بھینچ رہی ہے۔ مگر پھر اس کی نگاہیں اپنے بھائیوں کے بیقرار چہروں پر پڑیں۔ وہ کس بے تابی سے اس کے جواب کے منتظر تھے۔ گویا ان کی خوشیوں کا دار و مدار صرف حمید کے فیصلے پر تھا۔ دونوں بڑے بھائی ـــــ نہیں وہ انکی عدول حکمی نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے احمد کا ہاتھ چوما۔ پھر نارنگی کے درخت کا ایک پتہ توڑا۔ اسے آنسوؤں میں تر کر کے برج کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر پتے کو ہوا میں اُڑا دیا ـــــ اس نے اپنے دل کی بے تابی کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ ستمگر نہ دیکھے نہ سہی۔ مگر اس نے ایک بے جان پتے کو اپنا راز دان بنا لیا تھا۔ بس یہی اس کے لئے کافی تھا۔ اس نے گھوڑے کی باگ تھامی۔ اور ایک جست لگا کر سوار ہو گیا۔ احمد اور حامد کے چہرے تمتما اُٹھے۔ احمد نے زاہدہ کو۔ حامد نے زہرا کو اور حسین بابا نے قدسیہ کو اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ اور گھوڑوں کو سرپٹ چھوڑ دیا۔ فقط حمید ہی تھا جو اکیلا جا رہا تھا۔ حسین بابا نے اپنا گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے سب کا رُخ درہ لوپ کی طرف کر دیا۔

ابھی وہ تھوڑی دور ہی نکلے ہوں گے کہ انہیں الحمرا سے جنگی ڈھولوں کے بجنے کی آواز سنائی دی۔

"غضب ہو گیا۔ انہیں ہمارے بارے میں علم ہو گیا۔" حسین بابا نے چلا کر کہا۔

"مگر ہمارے عربی گھوڑے بہت تیز ہیں۔ وہ اب ہماری گرد تک کو نہیں پہنچ سکتے۔" حامد نے کہا۔

وہ اب دریا کی پہاڑیوں سے نکل آئے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں کوہ البیرا کے دامن میں تھے۔ "خدا کا شکر ہے۔ کہ اب تک کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا۔ اُدھر مڑ جاؤ۔ پہاڑیوں کے بیچ میں سے نکلیں گے۔ میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔" حسین بابا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ کہ رستے میں الحمرا کی سب سے اونچی پہاڑی پر دھندلی روشنی نظر آئی۔ ادھر حبشی نے چلا کر کہا۔ "خدا ہی رحم کرے۔ یہ روشنی آس پاس کے سب پہرے داروں کو چوکنا کر دیگی۔ ایڑ لگاؤ۔ جلدی کرو! اب سامنے اطلایا کی چوٹی پر بھی اسی قسم کی روشنی ہو گئی تھی۔ حسین بابا نے اپنے گھوڑے کا رُخ پل کی طرف موڑتے ہوئے کہا "جلدی کرو۔ جلدی! پل کی طرف رُخ بدل لو۔ فوراً موڑ لو۔ ورنہ وہ جیتی چشم زدن

میں گرفتار کر لینگے۔

اب ان کے سامنے ایک چوڑی ندی بہہ رہی تھی۔ یہ غرناطہ کی حد تھی۔ حسین بابا نے گھوڑا پل کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی ——— سامنے پل پر بھی ایک دھندلی سی روشنی موجود تھی۔ اور مسلح سپاہی ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ اس نے پھر اپنے گھوڑے کا رُخ موڑا۔ اور ساتھیوں کی ہمت بندھاتے ہوئے ندی میں گھوڑا چھوڑ دیا۔ ذرا سی دیر میں وہ ندی کے پار کھڑے تھے۔ حسین بابا نے پیچھے مڑ کر دیکھا ——— حمید نہیں تھا ——— سب کا خون خشک ہو گیا۔ شہزادیوں نے قدسیہ کو بلانا چاہا۔ مگر حسین بابا کے عقب میں جگہ خالی تھی زاہدہ نے گھبرا کر قدسیہ کے بارے میں پوچھا۔ جس پر حسین بابا نے کچھ سوچ کر جواب دیا "جب میں نے گھوڑا ندی میں ڈالا۔ تو وہ مجھے بُری طرح چمٹی ہوئی تھی۔ اور ساتھ ہی ڈر کے مارے چلا بھی رہی تھی۔ میں نے اُسے تلخ آمیز لہجے میں ڈانٹ کر کہا: — قدسیہ مجھے آسانی سے نہ سینچو۔ بلکہ صرف میری پیٹی پکڑ لو۔ اب یہاں کنارے پر پیٹی بھی غائب ہے اور قدسیہ بھی۔ شاید عین منجدھار میں پیٹی کھل گئی۔ وہ پیٹی میں نے پچھلے سال انعامی مقابلے میں جیتی تھی۔ بڑی قیمتی پیٹی تھی آہ!"

"چولہے میں جائے تمہاری پیٹی! پہلے قدسیہ کو تلاش کرو۔ پھر ہم یہاں سے قدم بڑھائیں گے۔" زاہدہ نے طیش میں آ کر کہا۔ حسین بابا نے ادھر ادھر دیکھا۔ ٹاپوں کی آواز آ رہی تھی۔ کیا کوئی ان کا تعاقب کر رہا تھا ——— سب نے تلواریں کھینچ لیں۔ مگر آنے والا سوار کوئی دشمن نہ تھا۔ یہ حمید تھا۔ اس کے آگے ایک گٹھڑی سی رکھی تھی ——— یہ قدسیہ تھی۔ حمید نے حسین بابا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "عجب بے پرواہ شخص ہو تم بھی۔ اس غریب کو بیچ میں چھوڑ چھاڑ کر چلتے بنے! اور یہ بھی علم نہ ہوا کہ پیٹی کھل گئی ہے۔ وہ تو خیر گذری کہ میں پیچھے پیچھے تھا۔ ورنہ اس کا پتہ بھی نہ چلتا۔"

حسین بابا نے مسکراتے ہوئے پہلے اپنی پیٹی سنبھالی۔ پھر قدسیہ کو اپنے سامنے بٹھا کر گھوڑا سرپٹ دوڑایا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دشمن کی پہنچ سے باہر تھے۔ اور بہت جلد جبل الطارق پہنچ گئے۔ جہاں حاکم مراکش کا ارسال شدہ جہاز تیار کھڑا تھا ——— مختصر یہ کہ وہ بخیر و عافیت مراکش پہنچ گئے۔ وہاں کا حاکم شہزادوں کو اور بیٹی بہنوں کو دیکھ کر مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔

حمید نے زاہدہ سے۔ حامد نے زہرا ہدہ سے اور حسین بابا نے [illegible] شادی کر لی۔ مگر حمید زہرا ہیدہ کے غم میں پاگل رہا۔ اور جب تک [illegible] زہرا ہیدہ ہی کا کلمہ پڑھتا رہا۔ ساری عمر اس نے شادی نہ کی۔ اور [illegible] اس کے لبوں سے جو نام نکلا۔ وہ زہرا ہیدہ کا تھا۔

اُدھر الحمرا میں کیا کچھ گزرا؟ ——— بادشاہ نے سنتے ہی اپنا بایاں ہاتھ غصے سے پیشانی پر مارا۔ قدسیہ کو جی بھر کر کوسا ——— پھر زہرا ہیدہ پر بڑا خفا ہوا۔ کہ اس نے اس سازش کی اطلاع کیوں نہ دی؟

مگر یہ ناراضگی بہت جلد دور ہو گئی۔ کیونکہ بادشاہ نے محسوس کیا۔ کہ یہ فقط پدری محبت ہی تھی۔ جس نے شہزادی کو اپنی خوشیاں قربان کر دینے پر مجبور کیا۔ اور فرار ہو جانے سے روکا۔ بعد میں جہاں تک سنا جاتا ہے [illegible] نے پھر ایسی شدید حماقت نہ کی۔ اور باقی رہی چھوٹی چھوٹی بیوقوفیاں۔ سو ایسی تو وہ روزانہ کرتا تھا۔

زہرا ہیدہ کی بے چینی بڑھتی گئی۔ وہ سارے سارے دن اسی جھروکے میں بیٹھی رہتی۔ جہاں اس نے اپنے محبوب سے باتیں کی تھیں۔ ساری ساری رات وہ ستار لئے وہیں بیٹھی رہتی۔ اور اس کے لبوں سے ایسے پُر درد نغمے نکلتے۔ جنہیں سن کر لوگ تڑپ اُٹھتے۔

ہر وقت اس کی نگاہیں کوہ دینا کی پہاڑی اور آلویرا کی چوٹیوں پر جمی رہتیں ——— جدھر سے اس کا محبوب نامراد رخصت ہوا تھا ——— جس طرف سے اس کی پیاری بہنیں گئی تھیں۔ وہ سارے دن اکیلی اداس بیٹھی رہتی ——— دن بدن کمزور ہوتی گئی۔ آخر محبت کی بے پناہ آگ نے اسے پھونک ڈالا اور وہ بادشاہ کے ہر ممکن علاج کے باوجود عین جوانی میں اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اور اپنی وصیت کے مطابق برج کے نیچے پھولوں کے ایک جھرمٹ میں دفن ہوئی۔ جہاں اس کا محبوب بیٹھ کر اشارے کیا کرتا تھا۔ مگر اس کی روح بیقرار پھرتی ہے۔

اب بھی الحمرا کے سیر کرنے والوں کو صبح کے دھندلکے یا شام کے خاموش لمحوں میں نہایت ہی دردناک نغمے سنائی دیتے ہیں۔ جنہیں سن کر سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ بعض اوقات [illegible] چاند کی نورانی چاندنی میں آلویرا کے زبردست جھنڈ [illegible]

ایک ... بہت ہی حسین نوجوان لڑکی کی روح اسی برج پر یا برج کے آس پاس راتوں میں آہ و زاری کرتی ہوئی کسی کسی کو نظر آ جاتی ہے۔ اس کی بے نور آنکھیں دیتا اور دیرا کی چوٹیوں کی طرف ہوتی ہیں۔ اور دونوں ہاتھ سینے پر ہوتے ہیں۔ سخت سے سخت دل بھی اس کے نالہ و شیون سے تلملا اٹھتے ہیں۔ اور سننے والے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ عرصے تک لوگوں کو اس روح کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا۔ مگر اب اس ناکام محبت کی داستان ... [illegible] ... کے تو بچے بچے کی زبان پر ہے۔ کئی محبت کے مارے آدھی رات کو اُٹھ کے باغوں — بڑے بڑے عالیشان کروں — جو کہ برجوں اور فواروں پر اسی لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ کہ اس ناکام آرزو کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ جس نے آج تک دنیا کی ایک صبح خوشی نہ دیکھی۔ جس کی روح خدا معلوم کب سے آہ و زاری کر رہی ہے۔ اور اسی طرح سے کب تک کرتی رہے گی؟ — کون جانتا ہے! بس خدا کسی کو محبت کا روگ نہ لگائے!

کیا آپ کو بواسیر کی تکلیف ہے؟

اگر ہے تو پھر آپ نے اس کا علاج بھی کیا ہے یا نہیں؟ ممکن ہے آپ کو اس کا صحیح علاج نہ معلوم ہو۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس موذی مرض کو ختم کر دینے کی صحیح ترکیب آپ کو بتا دی جائے۔

بعض اطباء کا خیال تھا کہ بواسیر لاعلاج بیماری ہے اور ہر قسم کے علاج تلاش کرتے کرتے وہ لوگ تھک گئے تھے۔ لیکن اب یہ ... کر خوشی ہوگی کہ ہندوستان کے طبیب اعظم عالیجناب خانصاحب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبر آبادی اس تلاش میں کامیاب ہو گئے ہیں اور سالہا سال کی ان تھک کوششوں اور بے شمار تجربوں کے بعد جناب موصوف ایک ایسا مرکب بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں جو ہر قسم کی بواسیر کو چند ہی روز میں جڑ سے کھو دیتا ہے اس وقت تک اس دوا کا لاتعداد مریضوں پر تجربہ ہو چکا ہے۔ خونی اور بادی اور ریاحی وغیرہ بواسیر کے لئے یہ دوا بہترین علاج ثابت ہوئی ہے۔ ہر مریض کو شفا ہو گئی۔ سب سے بڑی خوبی اس دوا میں یہ ہے کہ چند ہی روز میں پرانی سے پرانی بواسیر کو آرام کر دیتی ہے۔ عالیجناب حکیم صاحب موصوف ہندوستان کے ان ممتاز اطباء میں سے ہیں جن پر آج یونانی طب کو ... ناز ہے۔ آپ کی بے شمار طبی تصانیف ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور موصوف کی حیرت انگیز طبی قابلیت کا زندہ ثبوت ہیں ... فائدہ پہنچا رہی ہیں۔ اب یہ بواسیر کی دوا جس کا نام "انکول" ہے ایجاد کر کے یونانی کے ایک اہم اور برسوں کے ڈھکے چھپے راز کو معلوم ... اب یقین ہے کہ تھوڑے عرصے کے بعد ہندوستان سے بواسیر جیسی موذی مرض کا خاتمہ ہو جائیگا۔ "انکول" ہر قسم کی بواسیر کے ... دوا ہے عورت مرد کے لئے یکساں مفید ہے۔ انکول کی ایک شیشی کے ساتھ ہی "پائیلین" کی ایک شیشی مفت بھی دی جاتی ... استعمال کی ہے جب ان دونوں دواؤں کا ایک ساتھ عمل شروع ہوتا ہے تو بواسیر دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتی ہے۔ پس جو لوگ کسی ... مرض میں ہوں وہ جنرل منیجر زنانہ دواخانہ پی ۲۴ دہلی کو خط لکھ کر "انکول" کی ایک شیشی منگا کر استعمال کریں۔ ... مفت مل جائیگی۔ "انکول" کی ایک شیشی کی قیمت چار روپے ہے اور اس کے ساتھ "پائیلین" کی ایک ... (محصول ڈاک عام فائدہ کے خیال سے معاف ہے)

ہم ہیں گردش کے مارے۔ بیچارے۔ آوارے۔
عشق و محبت کا گھنا نالکھا۔
نہ گل ہو تو بلبل کو کیا بھائے لالہ زار وغیرہ وغیرہ۔

مناظر قائم کرنے میں فن کے اعتبار سے طالب کو جو قدرت حاصل تھی۔ وہ لیل و نہار کے دوسرے ایکٹ کے پہلے سین سے خوب ظاہر ہے۔ اس سین میں دیکھنے کی یہ بات ہے کہ وہ کتنے بڑے بہت کیرکٹر اور واقعات ایک ہی جگہ پر سلیقہ سے لے آنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

قبرستان کے پیچھے ایک مکان نظر آرہا ہے۔ اس مکان میں ایک جعلی سکے بنانے والا شخص اکرام رہتا ہے۔ جسے فلک سیر کے عزیز اور ہمراز سفیر جاہ کے بعض راز معلوم ہیں۔ پردہ اٹھتے ہی سفیر جاہ اور عالم سوز وہیں داخل ہوتے اور اکرام کو گرفتار کرانے کے مشورے کرتے ہیں۔

سامنے جو قبرستان ہے۔ اس میں شہ ناز کی قبر ہے اور فیروز اور انور اس پر پھول چڑھانے آتے ہیں سفیر جاہ عالم سوز سے کہتا ہے کہ یہاں قبرستان میں موقع پاکر کسی طرح انور کو اڑاؤ۔ اور فلک سیر کے ہاں پہنچا دو۔ یہ ہدایات دے کر سفیر جاہ چلا جاتا ہے۔ عالم سوز فیروز اور انور کی آمد کے انتظار میں دوسری طرف چلا جاتا ہے اتنے میں وہاں اکرام کی منہ بولی بیٹی دل افروز اپنی سہیلیوں سمیت آجاتی ہے۔ دل افروز قبرستان میں فیروز کو آتے دیکھ کر مائل ہو چکی ہے۔ اور ہر روز اُس کی آمد کا انتظار کرتی ہے۔

مگر اُسی وقت اندر سے اکرام کے بلانے پر لڑکیاں گھر میں چلی جاتی ہیں۔

فیروز اور انور داخل ہوتے ہیں۔ ماں کی قبر پر پھول چڑھانے کے بعد فیروز اکرام سے ملنے اس کے مکان میں جاتا ہے۔ اکرام اسے کئی دفعہ اپنے ہاں مدعو کر چکا ہے۔ فیروز انور کو پھولوں کی چھکیریں کر گھر جانے کو کہہ دیتا ہے۔ فیروز کے جاتے ہی عالم سوز یہاں آپہنچتا اور بہلا پھسلا کر انور کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے

ادھر یہ روانہ ہوتے ہیں کہ اکرام اور فیروز باتیں کرتے ہوئے صحن میں آگئے ہیں۔ اکرام دل افروز کو بلاتا اور اس سے پان لانے کو کہتا ہے۔ خود فیروز کو وہیں چھوڑ کر اپنی ٹولی کے ایک شخص نثار کو ایک ضروری کتاب دینے جاتا ہے۔ فیروز اکیلا ہے۔ کہ دل افروز آپہنچتی ہے اور دونوں میں محبت کی چند باتیں ہوتی ہیں۔ اسی وقت فیروز کو اکرام اندر بلا لیتا ہے۔ دل افروز اکیلی رہتی ہے کہ نثار تاڑی پیئے وہاں آجاتا ہے۔ اور دل افروز سے اظہار محبت کرتا اور اس سے کہتا ہے۔ کہ اگر میری محبت کا جواب محبت سے نہ ملا۔ تو میں تمہارے باپ کی جعلی سکہ سازی کا راز افشا کر دوں گا۔

دل افروز کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے لئے اس سے مہلت مانگتی اور جاتی ہے۔ اتنے میں اکرام اندر سے آجاتا ہے۔ اور اکرام اور نثار کی اہم گفتگو ہوتی ہے۔

اس کے بعد یہ سین ختم ہو جاتا ہے۔

لیل و نہار کی خصوصیات پر ایک مختصر سی بحث بھی بہت زیادہ طوالت و تفصیل کی محتاج ہے جس کا یہاں موقع نہیں مختصراً یوں سمجھئے۔ کہ اردو ڈراما کے تصنع و تکلف اور رومانی انداز کے خلاف جو ردعمل ہُوا۔ وہ لیل و نہار میں اپنے معراج کمال پر نظر آتا ہے۔ اور اردو اسٹیج پر اب تک کوئی ایسا ڈراما نہیں آیا۔ جو رومانی انداز کے واقعات اور انداز بیان سے اس قدر بچ کر لکھا گیا ہو۔ جس قدر لیل و نہار ہے۔

(باقی) امتیاز علی تاج

حیاتِ سعدی

اک آفت بن گیا قلبِ تپاں میرے لئے
اب سکونِ دل ہے دنیا میں کہاں میرے لئے

اُف نگاہِ مہر کب تک عشقِ ناشاد پر
اک نگاہِ مہر بھی اے مہرباں میرے لئے

ان کا شکوہ کر نہیں سکتا یہ پاسِ عشق ہے
اب تو اک بیکار سی شے ہے زباں میرے لئے

بجلیوں کا قہر۔ ڈر آندھی کا۔ خوفِ باغباں
کیا وبالِ جاں ہوا ہے آشیاں میرے لئے

گو اثر اُن پر نہ ہو دل کی تو کچھ نکلی بھڑاس
کارآمد ہیں یہ اشکِ رائیگاں میرے لئے

اُف کا مطلب گر نہ سمجھے لوگ تو میں کیا کروں
کیا کوئی لازم ہے شرحِ داستاں میرے لئے

میرے گلشن میں ابھی فصلِ خزاں کا دور ہے
کر نہیں سکتی ہیں کچھ تبدیلیاں میرے لئے

یہ بھی ہے میری مخالف، وہ بھی ہے میرے خلاف
ایکساں ہیں یہ زمین و آسماں میرے لئے

آؤ اے سعدی تصور سے ذرا اب کام لوں
کیوں محبت ہو بھلا خوابِ گراں میرے لئے

سعدی مچھلی شہری

ہاشمی بکڈپو ہندوستان میں اُردو کا سب سے بڑا کتبخانہ ہے جہاں مشہور مصنفین کی تمام بلند پایہ تصانیف و
تراجم کی سب کتابیں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہاشمی بکڈپو نے مشہور مصنفین مثلاً پطرس [illegible]
سید امتیاز علی تاج بی-اے، حکیم احمد شجاع بی-اے، ڈاکٹر تاثیر ایم-اے-پی-ایچ-ڈی (کینٹب)، ڈاکٹر کے ایم اشرف
پروفیسر عابد علی عابد، محترمہ حجاب امتیاز علی صاحبہ، ڈاکٹر رشید جہاں (مصنف "انگارے")، راشد ایم-اے وغیرہ سے
متعدد مضامین پر نہایت اعلیٰ اور شاندار کتابیں لکھوا کر شایع کی ہیں۔ جو حضرات علم و ادب کا ذوق رکھتے ہیں اور اُردو
زبان و ادب کی خدمت اور ادبی اداروں اور ناشروں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں وہ ہاشمی بکڈپو کی سرپرستی
قبول فرمائیں۔ یہ اُردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت تصور ہوگی۔

ہاشمی بکڈپو کی تازہ کتاب

صنوبر کے سائے اور دوسرے رومان

از مسز حجاب امتیاز علی صاحبہ

اُردو کی بہترین رومان نویس کی تازہ ترین تصنیف، ایک کتاب جو آپ کو [illegible]
جو آپ کو آہوں کی سحر آلود سرزمین میں گم کر دیگا۔ جن سے آپ [illegible] انداز [illegible]
آپ بار بار پڑھینگے اور ہر مرتبہ نیا محسوس کرینگے [illegible]
سربستہ حیرت انگیز انکشاف [illegible]
[illegible] ہاشمی [illegible]

خوابوں کی دُنیا

(از جناب مسعود حسن صاحب ذوقی ایم اے علیگ گونڈوی)

(۱)

بسائیں کہیں چل کے خوابوں کی دُنیا — محبت کی رنگین شرابوں کی دُنیا

جہاں سانس لیتے ہوں گنجان جنگل — جہاں رقص کرتے ہوں آوارہ بادل

جہاں ندیاں بن میں لہرا رہی ہوں — جہاں دکھ بھری کوئلیں گا رہی ہوں

تمدن کی قیدوں سے آزاد ہو کر — جہاں گھاس پر لیٹنا ہو میسر

جہاں خنکیاں ہوں جہاں تازگی ہو — ہواؤں میں سحر آفریں راگنی ہو

بسائیں وہیں چل کے خوابوں کی دنیا — محبت کی رنگین شرابوں کی دنیا

(۲)

بسائیں کہیں چل کے خوابوں کی دنیا — محبت کی رنگین شرابوں کی دنیا

ہوائیں جہاں چھیڑتے ہوں ترانے — شفق کے لبوں پر ہوں رنگیں فسانے

جہاں چھاؤنی چھا رہی ہوں بیولیں — جہاں لال برگد کے جھولوں میں جھولیں

جہاں گنگناتے ہوں شفاف چشمے — جہاں چاند کا عکس لہروں سے کھیلے

جہاں مست چیتل ٹلہ چر رہے ہوں — جہاں پر ہرن چوکڑی بھر رہے ہوں

بسائیں وہیں چل کے خوابونکی دنیا — محبت کی رنگیں شرابوں کی دنیا

(۳)

بسائیں کہیں چل کے خوابونکی دنیا — محبت کی رنگیں شرابوں کی دنیا

جہاں پر کنول کھل رہے ہوں لب جُو — وہیں دونوں بیٹھے ہوں پہلو بہ پہلو

تری زلف چہرے پہ بکھری ہوئی ہو — کہیں ظلمتیں ہوں کہیں چاندنی ہو

مجھے دیکھتی ہوں یہ مخمور آنکھیں — جوانی کے خوابوں سے معمور آنکھیں

نظر میں محبت کی رعنائیاں ہوں — تبسم ہوں آہیں ہوں انگڑائیاں ہوں

بسائیں وہیں چل کے خوابونکی دنیا — محبت کی رنگیں شرابوں کی دنیا

غزل

(نقیب الملۃ - سحبان الہند حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی)

خرد کو ظرف بناؤں میں اور ظرف کو ہوش — کہ آج ساقیِ میخانہ ہے سبو بردوش

سکوت اصل میں ہے پیچ و تاب کی صورت — تمام دل کی گرہ ہیں میرے لبِ خاموش

تمام شوقِ نظارہ ہوں اور میں حیراں — ہر ایک ذرۂ ہستی میں دیدہ و گوش

حجابِ دید نہیں وہ حجاب ہیں ہے خرد — حدودِ حسن کو سمجھا نہیں ہے عقل کا ہوش

سمجھ میں آ نہیں سکتا کہ بادہ کیا ہوگا — جنونِ ہوش اگر ہے نگاہِ بادہ فروش

نگاہِ ساقی و مینا مقامِ عرفاں ہے — سمجھ سکی ہے اسے ایک تہمتِ مئے نوش

کوئی سنا دے یہ جا کر حرم نشینوں کو — کہ اصل فطرتِ ہستی ہے بزمِ جوش و خروش

میں کس زباں سے بتاؤں کہ کون ہوں کیا ہوں! — کہ بزمِ کون و مکاں جب تیری ہے حلقہ بگوش

بس اتنا تو کھلا مجھ پہ حسن و عشق کا راز — نگاہ اس کی خریدار میں ہوں عقل فروش

بچا لے لوٹ سے یارب متاعِ توبہ کو — کہ سن رہا ہوں میں ہر سمت بانگِ نوشانوش

بلاؤں ان کو وہ آئیں بھی ہاں مگر کیفی!
نہ اپنے بس میں ہیں میں خود ہوں نہ میرے ہاتھ میں ہوش!

مخزنِ حکمت
یا گھر کا ڈاکٹر و حکیم
مصور ایڈیشن

مصنفہ و مؤلفہ
...ان صاحب ڈاکٹر و حکیم غلام جیلانی شمس الاطبا

طبع یازدہم

اس موجودہ ایڈیشن میں دیگر اضافات کے علاوہ تقریباً چار صد
...نگین بلاکس (عکسی تصاویر) اور دو صد کے قریب دستی تصاویر
...ا اضافہ کیا گیا ہے کتاب ہذا ہر پہلو سے سابقہ ایڈیشنوں کی نسبت زیادہ
...فید اور زیادہ مفید اور زمانہ حال کی ضروریات کے عین مطابق بن
...ئی ہے جس میں ہر مرض کی تعریف۔ ماہیت کیفیت اسباب علامات
...نام تشخیص انجام و عوارض و اصول علاج کے بیان کے بعد ڈاکٹری طب
...ن حصول حفظِ ماتقدم۔ پھر علاج شافی۔ ڈاکٹری اور بہترین نسخہ جات
...کھنے کے بعد یورپ و امریکہ کی بہترین اور مفید ترین پیٹنٹ ادویہ بھی
...تحریر کر دی گئی ہیں علاوہ بریں علاج بذریعہ انجکشن (جلدی پچکاری) کا
...مزید اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح طبی علاج میں بہترین طبی مجربات کے علاوہ
...مفید ترین مفرد ادویہ کے استعمال کا طریقہ بھی لکھ دیا ہے اور ساتھ ہی ہر
...رض کے آخر میں غذا و پرہیز کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے ان عظیم الشان اضافات
...ور بلند ترین خوبیوں کے باوجود قیمت میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا گیا۔
...یمت ہر دو جلد مکمل بلا جلد عـہ مجلد عـہ فی جلد بغیر جلد۔
...ہے مجلد ہے علاوہ محصول ڈاک۔

مخزن مرکبات یعنی معلم دواسازی قیمت بلا جلد عـہ مجلد تین روپیہ
اس کتاب میں تقریباً ڈیڑھ دو ہزار قدیم و جدید یونانی مرکبات کے صحیح
منتخب نسخہ جات درج ہیں اس کے علاوہ ضمیمہ معلم دواسازی اور ضمیمہ
...ضمیمہ علاج الامراض بھی شامل ہیں ◆

بیسیوں انگریزی کتابوں کا نچوڑ

انجکشن بک
یا کتاب التقلیح با تصویر
مصور

جس میں

انجکشن کے مخصوص فوائد اور طریق عمل ٹیکہ کے مقام کا انتخاب
ضروری ہدایات انجکشن میں بے احتیاطی سے نقصانات انجکشن کے
اقسام اور ان میں مستعملہ ادویات کا مفصل بیان درج ہے اس کے علاوہ جلدی
پچکاری (سبکیوٹینس انجکشن) عضلی پچکاری (انٹرامسکولر انجکشن) وریدی
پچکاری (انٹراوینس انجکشن) نخاعی پچکاری (انٹراتھیکل انجکشن) بے حسی
پیدا کرنیوالا ٹیکہ (لوکل انیس تھیٹک انجکشن) ویکسینز اور سیرم کے
ٹیکے (ویکسینز اینڈ سیرم انجکشن) وغیرہ کا مفصل تذکرہ اور آسان طریق
پر ہر ایک کا بیان درج ہے علاوہ ازیں قوت مناعت (امیونٹی) اور
لمبر پنکچر وغیرہ اور حسبقدر آفیشل اور ناٹ آفیشل نیز مشہور انگریزی
دوا ساز کمپنیوں کی ادویات انجکشن جو آجکل مروج ہیں نہایت وضاحت
کیساتھ درج کر دیا ہے۔ ہر دوا کی مقدار خوراک طاقت و تاثیر و تھیرا
پیوٹکس استعمال وغیرہ کے متعلق بیان درج ہے ان کے علاوہ علاج جراحی
میں جو انجکشن مستعمل ہیں ان کو بھی تفصیل وار درج کر دیا ہے۔ آخر میں دو
ضمیمے یعنی ضمیمہ میٹریا میڈیکا اور ضمیمہ علاج الامراض لگا دیئے ہیں۔
غرض بے شمار ایسی خوبیاں موجود ہیں جو کتاب دیکھنے اور مطالعہ کرنے سے
معلوم ہو سکتی ہیں مزید آسانی پیدا کرنے کے لئے جا بجا رنگین تصاویر
لگا دی گئی ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اردو کسی زبان میں آج تک ایسی کتاب
شائع نہیں ہوئی۔ جو اس قدر مواد بہم پہنچائے۔
ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت بہت کم رکھی گئی ہے یعنی صرف
تین روپے (عـہ) بلا جلد۔ مجلد ہے علاوہ محصول ڈاک ◆

ملنے کا پتہ: **طبی کتب خانہ جناب شمس الاطباء رجسٹرڈ بھاٹی گیٹ۔ لاہور**

فریبِ آرزو

(از جناب ظفر احمد صدیقی بدایونی ایم اے (علیگ) لکچرر فلاسفی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ!)

فطرتِ انساں بھی کس درجہ تحیر خیز ہے
آتشِ فرقت سمندِ شوق کو مہمیز ہے

سیلِ محرومی سے ہے شاداب باغِ آرزو!
بادِ ناکامی سے ہے روشن چراغِ آرزو

قطرۂ دریا ہی سے رنگینئ ساحل بھی ہے
جستجو ہی پر مدارِ راحتِ منزل بھی ہے!

بیقراری میں ہے مضمر لذتِ تسکیں کا راز
ہے سحر کی دلکشی ممنونِ شب ہائے دراز

مختصر یہ ہے تمناؤں کا دل میں پیچ و تاب
ڈال دیتا ہے رخِ مقصد پہ اک رنگیں نقاب

دوریِ منظر بنا دیتی ہے منظر کو حسیں
نور سے روشن نظر آتی ہے ظلمت کی جبیں

خواب میں جیسے کوئی رنگین منظر دیکھ کر
بھر لے اپنے دامنِ امید میں گلہائے تر

آنکھ کھلتے ہی مگر وہ رنگ و بو کچھ بھی نہیں
سامنے اب جز سرابِ آرزو کچھ بھی نہیں

اب وہ ساماں دلفریبی کا نظر آتا نہیں
جس مسرت کی توقع تھی اُسے پاتا نہیں

جس کے ملنے کا تصور تھا عجب کیف آفریں
دلنوازی کا اب اس میں شائبہ ملتا نہیں

تشنگی میں جسکو سمجھا آبِ حیواں کا گلاس
ذوق کی تسکیں تو کیا ہوتی بجھی اس سے نہ پیاس

آرزو دکھلا رہی تھی دور سے جو سبز باغ
ظلمتِ غم میں جو روشن تھا تمنا کا چراغ

پاس سے دیکھا تو وہ اندازِ رعنائی نہ تھا
جیسے گویا مرکزِ جذبِ تمنا ہی نہ تھا

ہٹ گیا آنکھوں سے پردہ کم ہوا سر سے خمار
تلخ اور عریاں حقیقت سے ہوئیں نظریں دوچار

دوست کی جانب بڑھے جیسے کوئی پہچان کر
پاس جا کر اجنبی اک شکل ہو پیشِ نظر

جیسے اک بچہ ہو نالاں بھوک کی بیداد سے
کچھ کھلونے اس کو مل جائیں بہلنے کے لئے

پہلے بے تابی کا اپنی ان کو سمجھے گا علاج
اور لیکن جب نہ ہوگا ان سے دردِ احتیاج

پھینک دیگا غیظ میں ان کو فرازِ خاک پر
گریۂ بیتاب سے پھر آنکھ ہو جائے گی تر

یونہی انساں اک حقیقت کے لئے ہے بے قرار
جس کی حسرت روح کو رکھتی ہے وقفِ انتظار

جذبۂ بے تاب جو انساں کے آب و گل میں ہے
ایک لامحدود ہستی کی تمنا دل میں ہے!

اک خلش سینہ میں ہے جو منزلِ مقصود کی
آرزو محدود کو ہے حسنِ لامحدود کی!

آرزو ہے ذرہ کے دل میں کسی خورشید کی
سوز سے جس کے فروزاں شمع ہے امید کی!

بحرِ بے پایاں کی ہے قطرہ کے دل میں آرزو
رات دن رکھتی ہے جو اس کو شہیدِ جستجو!

دل کو آرزو رکھتی ہے وقفِ انتظار
دور سے ہر شے میں آتی ہے نظر تصویرِ یار

ہوتا ہے ہر شمع پر پروانہ کی صورت فدا
آہ! لیکن جب حقیقت کا نہیں چلتا پتا

یا تو اپنے عشق کی آتش میں جل جاتا ہے یہ
جان کر یا پھر کھلونوں سے بہل جاتا ہے یہ

ہر پڑھے لکھے گھر میں
رکھنے والی
کتابیں
پرشین ٹیچر:-
فارسی ترجمہ سکھانے کے لئے بہترین کتاب ہے۔
قیمت دس آنے (۱۰/)
رفیق مضمون نگاری:-
اردو جواب مضمون پر لاجواب کتاب ہے۔
قیمت بارہ آنہ (۱۲/)
نیو ماڈل انگلش کمپوزیشن:-
جس میں ایسیز۔ لیٹرز۔ سٹوریز۔ ڈیالاگ درج ہیں۔
امیدواران امتحان مڈل اور ہائی کے لئے مفید ہے۔
قیمت ایک روپیہ چھ آنہ
انوواد چندر ادے:-
سنسکرت ٹرانسلیشن کے لئے ازبس مفید کتاب ہے
قیمت بارہ آنہ (۱۲/)
سکول کمپوزیشن:-
اس میں لیٹرز۔ سٹوریز۔ مسمریز۔ ان سین ڈیالاگ
ایسیز وغیرہ شامل ہیں۔ جو طلباء مڈل و ہائی دونوں کے لئے
یکساں طور پر مفید ہے۔
قیمت ایک روپیہ دو آنہ
ایڈیومیٹک انگلش ٹرانسلیشن:-
مصنفہ برج لال
اس میں روزمرہ استعمال کے ۳۰۰۰ سے زائد فقرات کا
بامحاورہ انگلش میں ترجمہ کیا گیا ہے۔
قیمت بارہ آنہ (۱۲/)
پاکٹ ایڈیشن:-
اس میں ۱۲۰۰ فقرات کا ترجمہ کیا گیا ہے۔
قیمت چار آنہ
نوٹ:- جہاں ہر گھر میں معمولی لائبریری ضروری ہے۔ وہاں مندرجہ بالا کتب کا ہونا بھی لازمی ہے
المشتہران
پنجاب کتاب گھر (رجسٹرڈ) موہن لال روڈ۔ لاہور

خریداران نیرنگ خیال کو ضروری اطلاع

کنویسروں کے اختیارات

کنویسروں کے متعلق ہمیں بارہا نیرنگ خیال میں کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے لیکن ہم حیران ہیں کہ باوجود متعدد اعلانات کے بعض کنویسر خریداروں کو فریب دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بعض خریدار اُن سے ایسی باتیں منوا لیتے ہیں جو سراسر ناواجب اور نامناسب ہوتی ہیں آج پھر ایک بار ہم تفصیل کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ نیرنگ خیال کے کنویسر کو صرف مندرجہ ذیل اختیارات حاصل ہیں۔

الف :۔ وہ نیرنگ خیال کا سالانہ چندہ سالنامہ سمیت سوا چار روپے وصول کرسکتا ہے خواہ وہ ایک روپیہ پیشگی ہو اور بقایا تین روپیہ بہر کا وی پی ہو۔ فیس وی پی علیحدہ لی جاتی ہے۔ وہ اس چندہ میں شامل نہیں۔ ہر وی پی پر ۵ محصول بڑھا دیا جاتا ہے۔

ب :۔ کسی کنویسر کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ چندہ میں کسی قسم کی کمی کرے۔ یا چندہ اقساط میں وصول کرے یا ۴ چندہ میں سالنامہ مفت دے (کیونکہ سالنامہ للعہٗ چندہ اور محصول للعہٗ دینے والوں کو مفت ملتا ہے)۔

ج :۔ کسی کنویسر کو اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی خریدار کا کوئی اعلان یا اشتہار مفت شائع کرنے کا وعدہ کرے۔ کیونکہ ایک سطر شائع کرانے کی اجرت دو روپے تک ہے جو چندہ کے علاوہ لی جائیگی۔ اس لئے کسی قسم کا کوئی معاہدہ کرنے کا اُسے اختیار نہیں۔ وہ صرف پورا چندہ وصول کرسکتا ہے۔ یا کچھ پیشگی اور بقایا بذریعہ وی پی۔

د :۔ وی پی اسی ماہ میں ہوگا جس میں خریدار خریداری قبول کر کے کچھ رقم پیشگی دے دیتا ہے۔ چند مہینوں کے بعد وی پی نہ ہوگا۔ اور نہ ہی چند پرچوں کے بھجوانے کے بعد بقایا چندہ لیا جائے گا۔

ہ :۔ جو خریدار کوئی رقم پیشگی کنویسر کو ادا کرتا ہے۔ اگر وہ بقایا رقم بذریعہ منی آرڈر یا بذریعہ وی پی دفتر کو نہیں بھجوا دیتا تو وہ پیشگی رقم واپس لینے کا حقدار نہیں ہوگا۔ البتہ یہ رقم چھ ماہ تک حساب میں مجرا دی جاسکتی ہے۔ اور بقایا وصول ہونے پر رسالہ جاری ہو سکتا ہے۔ مع نقصان وی پی کی واپسی کے۔

س :۔ جو پرانے خریدار چندہ ختم ہونے سے قبل کسی کنویسر کو آرڈر دینا چاہیں وہ پورا چندہ ادا کر دیں۔ اور دفتر کو ایک کارڈ لکھ کر اطلاع بھی دے دیں۔ تاکہ انہیں دوبارہ وی پی غلطی سے نہ بھجوا دیا جائے۔ کیونکہ کنویسر اپنی کارگذاری دکھانے کے لئے بہت کم دفتر کو اس امر کی اطلاع دیتے ہیں کہ انہوں نے پرانے خریدار سے چندہ وصول کیا ہے۔

محمد علی کنویسر کی موقوفی :۔ نیرنگ خیال کے ایک کنویسر محمد علی کو دفتر سے علیحدہ کیا گیا ہے۔ اُس کا طریق عمل پبلک اور رسالہ دونوں کے لئے نقصان دہ تھا۔ وہ ہر جگہ لوگوں کو دھوکہ دیتے۔ جھوٹ بولتے۔ جھوٹے وعدے کرتے۔ رعائتیں دیتے۔ اشتہار مفت چھاپنے کا وعدہ کرتے۔ الغرض ہر ناجائز ذریعہ سے خریدار بناتے تھے۔ اُن کی درجنوں شکایات دفتر میں پہنچی ہیں۔ انہیں کسی ایسی حرکت کا حق حاصل تھا نہ اجازت۔ اس لئے انہیں علیحدہ کیا جاتا ہے۔ پبلک آگاہ رہے۔ اب وہ کوئی دوسرا رسالہ لے کر پھر دھوکہ دہی اور فریب دہی شروع کریں گے۔ اور یقیناً اپنے کئے کی سزا پائینگے۔ ہم نے محض لوگوں کے مجبور کرنے پر ان پر رحم کر دیا ہے۔

ہمارے کنویسر } اس وقت دفتر نیرنگ خیال کی طرف سے صرف دو حقیقی بھائی سید بہادر علی شاہ اور سید افتخار علی شاہ نیرنگ خیال کا کام کر رہے ہیں۔ یہ دونوں بھائی دیانت داری سے کام کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ ہمارے معاون ہر جگہ ان کی امداد کریں گے۔ اور نیرنگ خیال کے قواعد و ضوابط کے ماتحت اُن سے رسالہ کی خریداری کا معاملہ کرینگے۔

انہیں بھی صرف وہی حقوق حاصل ہیں۔ جن کا اس اعلان میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اگر ان قواعد کے باہر کسی صاحب نے اُن سے کوئی معاملہ کر لیا تو اُس کے لئے ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے۔

ہمیں توقع ہے کہ سید افتخار علی شاہ و سید بہادر علی شاہ پہلے سے بھی زیادہ بااصول اور دیانت دارانہ طریقہ سے اور بڑی محنت و مشقت سے کر کے ادارہ کو بھی فائدہ پہنچائیں گے۔ اور خود بھی فائدہ اٹھائیں گے۔

(مینجر)

نیرنگ خیال کا تجارتی صفحہ

نیرنگ خیال کو ملک کے ہر میگزین کو ملک کی تجارت سے تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ہم بھی کبھی کبھی اس عنوان پر چند سطور لکھا کرتے ہیں۔

(۱) تجارتی کمپنیوں میں تاج کمپنی لمیٹڈ اپنے کام کو آہستہ آہستہ وسعت دے کر ترقی کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ اس کے حصص کثرت سے فروخت ہو رہے ہیں۔ امسال اسلامی قطعات اور عید کارڈوں نے بہت رونق رہی۔ یہ ڈیزائن ملک میں بہت پسند کئے گئے۔ حمائل شریف جو سات رنگوں میں طبع ہوئی ہے اسی سرعت سے فروخت ہو رہی ہے۔ ادویات اور عطریات کی برانچ میں بھی معتد بہ ترقی ہو رہی ہے کتاب خانہ کو بہت ہی وسعت دی گئی ہے۔ الغرض کمپنی ہر طرح سے ترقی کر رہی ہے۔

۲۔ طبی کتب خانہ اندرون بھاٹی دروازہ لاہور جسے ملک کے مشہور طبیب جناب حکیم و ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب مرحوم و مغفور نے قائم کیا تھا۔ اب اُن کے فرزند جلیل حکیم محمد ... صاحب کی زیر نگرانی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔

مخزن حکمت کے جدید ایڈیشن درجنوں اضافات کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ میٹریا میڈیکا میں اصلاح کی گئی ہے۔ انگلش بک شائع کی گئی ہے۔ اور کئی دیگر تصنیفات زیر تیاری ہیں۔ الغرض طبی کتب خانہ اچھی طبی کتابوں کی اشاعت کے لئے مقبول ہو رہا ہے۔

۳۔ دلیسی دواخانوں میں لالہ گوبند رام کاہن چند جنرل عطاران کسیرا بازار لاہور نے امسال بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ اُنکا دواخانہ دیسی ادویات عرق و شربت مربہ و اچار چٹنی۔ تیل و عطریات کے لئے ... مشہور ہے ہی۔ یہ کارخانہ ایک سو پچیس سال سے برابر اسی جگہ کامیابی سے چل رہا ہے اسکی ایک شاخ انارکلی بازار لاہور میں قائم کی گئی ہے۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کوٹھیوں میں رہنے والے اور کالجوں میں پڑھنے والے اس دکان سے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور اپنی ضرورت کی ہر چیز یہاں سے خریدتے ہیں جو لوگ اصلی مال اور کم نرخ کے خواہشمند ہوں وہ گوبند رام کاہن چند کی دکان انارکلی لاہور میں ایک بار ضرور تشریف لے جائیں۔

۴۔ کرنال شاپ انارکلی لاہور۔ یہ کارخانہ بھی نصف صدی کی محنت و دیانت ... ہے دکان کے نوجوان کارکن شیخ عبدالمالک حسن مذاق و سلیقہ ... محنت سے کاروبار روبہ ترقی ہے اور دکان میں ہر وقت درجنوں گاہک نظر آتے ہیں کرنال شاپ کی کامیابی کا راز صرف دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ جتنے ڈیزائن چاہیں دیکھ سکتے ہیں ایک جوتا خریدنا ہو بلاشبہ دو درجن ڈیزائن آپ دیکھ سکتے ہیں اور پھر اپنی پسند کی چیز اُن میں سے تلاش کر سکتے ہیں۔ دوسری خصوصیات یہ ہے کہ لاہور بھر میں اُن کی دکان کا نرخ چار آنے سے لیکر ایک روپیہ اور بعض اوقات دو روپیہ تک فی جوڑا کم ہے۔ سی لئے پبلک کا ہجوم ہے۔

۵۔ شیخ مبارک علی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ لاہور کے کتب فروشوں کے رہنما ہیں۔ علمی کتب اور مشرقی علوم کی تمام کتابوں کے علاوہ ادبی کتابیں بھی آپکے ہاں سے مل سکتی ہیں۔ اور اس وقت تو بلاشبہ ہر اچھے مصنف کی کتاب آپ سے مل سکتی ہے۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں جن پر ہزاروں روپیے خرچ ہوئے ہیں آپ نے شائع فرمائی ہیں یہ کام بڑے حوصلے اور ہمت کا تھا مگر شیخ صاحب کی تجارتی اولوالعزمی ہمیشہ کٹھن سے کٹھن کام پر غالب آئی ہے۔ اردو زبان کی ترقی۔ قیام اور توسیع میں شیخ صاحب کی کوششیں ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہینگی۔ صاحبان علم و فن اور شائقین کتب کو ہمیشہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے کتابیں خریدنی چاہئیں

۶۔ امرت دھارا فارمیسی لاہور:۔ اشتہاری تجارتی اداروں میں امرت دھارا فارمیسی ملک بھر میں مشہور اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ پنڈت ٹھاکر دت صاحب شرما وید جو حسن اخلاق اور مجسمہ ایثار ہیں۔ جو دو سخا میں حاتم صفت۔ خدمت ملک میں سب سے پیش پیش۔ ایسے بزرگ صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ آپ نے امرت دھارا جیسی مفید دوا ایجاد کی جس کے بغیر کوئی گھر خالی نہیں اور جہاں یہ موجود نہیں۔ وہ گھر محفوظ نہیں۔ امرت دھارا کے علاوہ پنڈت صاحب نے درجنوں مفید و مجرب دوائیں اور بھی ایجاد کی ہیں۔ درجنوں طبی کتابیں لکھ کر ملک کو فائدہ پہنچایا ہے۔ الغرض آپ کا وجود مغتنمات سے ہے۔ خدا آپ کو مزید ترقی دے اور عمر دراز کرے۔

آپ کے قائم شدہ کارخانہ کا انتظام آپ کے برادر حقیقی پنڈت ہیرا نند جی کے سپرد ہے۔ جنہیں چھوٹا ٹھاکر دت سمجھنا چاہئے۔ آپ کی انتظامی قابلیت ہر تعریف سے مستغنی ہے۔ آپ اتنے وسیع کاروبار کو اس خوش اسلوبی سے سنبھالے ہوئے ہیں کہ ہر شخص تعریف کرتا ہے۔ ناظرین امرت دھارا فارمیسی لاہور کی فہرست مفت طلب کر کے ادویات و کتب پسند کر کے منگوائیں اور فائدہ اٹھائیں۔

مونا ویکس

آپ کا رنگ ہرگز کالا نہیں رہ سکتا کیونکہ آپ کی جلد کے نیچے سفید جلد موجود ہے "مونا کمپلیشن ویکس" کے متواتر استعمال سے آپ کی کالی اور کھردری جلد دور ہو کر نیچے سے سفید جلد نکل آئیگی۔ "مونا ویکس" کے اجزا جلد پر نہایت خوشگوار اثر پیدا کرتے ہیں جلد کو ملائم سفید اور صاف کرتے ہیں۔ مونا ویکس دوسری کریموں کی طرح آپ کی جلد پر سطح نہیں بنائیگی۔ بلکہ آپ کے جلدی مساموں میں داخل ہو کر دن بھر کی گرد و غبار کے ذرّوں کو نکال کر آپ کے چہرہ کو ایک نئی جاذبیت۔ بشاشت اور روح افزا ترو تازگی سے مالا مال کریگی۔ مونا ویکس کے متواتر استعمال سے آپ کے چہرہ کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ جھریاں۔ چھائیاں۔ کالے دھبے اور سفید داغ سب کافور ہو جائیں گے۔ تھوڑی سی توجہ سے آپ اپنے چہرہ اور رنگت کی دلآویزی میں مونا ویکس کے استعمال سے اضافہ کر سکتے ہیں۔ آج ہی مونا ویکس خرید کر استعمال کریں اور فائدہ اُٹھائیں۔

قیمت ۱—

ڈینٹلین

گوشت خورہ مسوڑھوں کی خرابیوں

اور

اُن میں پیپ پڑ جانے کی نادر دوا

آج دس آدمیوں میں سے نو آدمیوں کے دانت اور مسوڑے خراب ہوتے ہیں جس شخص کے دانت خراب ہوں اُن کی غذا ٹھیک ہضم نہیں ہوتی۔ اُس کے جسم کا خون پتلا پڑ جاتا ہے دانتوں کی خرابی تمام جسم کے نظام میں خوفناک خرابی پیدا کر دیتی ہے۔ اگر آپ کے دانتوں میں پیپ پڑ گئی ہو وہ ہلتے اور کمزور ہو گئے ہوں۔ ذرا دبانے سے خون نکل آتا ہو منہ سے بدبو آتی ہو تو ڈینٹلین کا استعمال کیجئے جو تمام امراض کے لئے تجربہ کار ڈاکٹروں نے ایجاد کی ہے جو کا حکمی اور شافی علاج ہے۔ خود بھی استعمال کرو اور اپنے بیوی بچوں کو بھی استعمال کراؤ۔ قیمت

ہر قسم کی انگریزی ادویات نیز سٹیتھسکوپ۔ تھرمامیٹر۔ انیما وغیرہ۔ ہر قسم کے ڈاکٹری آلات ملتے ہیں نسخہ جات بڑی احتیاط سے بنائے جاتے ہیں۔ اور لاہور سے باہر دوا فروشوں کو لاہور کے نرخ پر ہر قسم کا سامان و ادویہ مہیا کی جاتی ہیں۔

ملنے کا پتہ

میسرز بیلی رام اینڈ برادرز۔ انارکلی۔ لاہور

نین سُکھ

بال بچوں والے گھر کے لئے ایک نایاب تحفہ

ہر لڑکی شادی کے بعد ایسی دنیا میں قدم رکھتی ہے جس کے دستور العمل سے وہ بالکل ناواقف ہوتی ہے نہ اُس نے اب تک جاننے کی کوشش کی اور نہ کسی دوسرے نے اسکی ضرورت سمجھی۔ شادی کے بعد بیوی اور ماں بننے تک کی دشوار گذار گھاٹیاں۔ بیس فی صدی عورتیں اتفاقی طور پر صحت و سلامتی کے ساتھ گذر جاتی ہیں لیکن ۸۰ فیصدی عورتیں اپنی نادانیوں کی بدولت طرح طرح کی بیماریوں میں پھنس جاتی ہیں اور صحیح و تندرست اولاد کیلئے ترستی رہتی ہیں ان ہی بیچاری دُکھیاری عورتوں کو ایامِ حمل اور ایامِ زچگی کے دُکھوں سے بچانے اور اُن کے پیارے بچوں کے دکھ درد دور کرنے کے لئے **نین سُکھ** کا جنم عمل میں آیا ہے یہ ایک بےنظیر کتاب ہے۔ جسے **طبی لٹریچر سوسائٹی** نے قابل ماہرِ فن سے لکھوا کر فیضِ عام کے لئے شائع کیا ہے یہ آپ کی نئی نویلی دلہنوں اور ان کو پیدا ہونے والے بچوں کی زندگی کا بیمہ کریگی اور آپ کے گھروں میں خوشی اور مسرت کی لہریں دوڑائیگی۔ تعلیم یافتہ ماں اس کو پڑھ کر حکیموں اور ڈاکٹروں کے مشورے کی ضرورت نہ سمجھیگی اپنی اور اپنے بچوں کی خود حفاظت کر سکے گی۔ یہ ماں۔ باپ۔ دُلہن اور خاوند۔ ساس و نند سب کے لئے **نین سکھ** ثابت ہوگی۔

طبی لٹریچر سوسائٹی نے ہر ایک معمولی پڑھی لکھی خاتون کے لئے مفید اور کارآمد بنانے کیلئے اس کتاب کو نہایت سادہ اور سلیس اردو زبان میں لکھوا کر نیز ہر امیر و غریب گھرانے تک پہنچانے کے لئے اس کی قیمت بھی نہایت کم رکھی ہے یعنی **تین سو بیس صفحات کی خوبصورت مجلد کتاب کی قیمت صرف سوا روپیہ (عہ) ہے**۔ امید ہے کہ ملک میں سوسائٹی کی اس خدمت کو بنظرِ استحسان دیکھا جائیگا جس نے بڑے سرمایہ سے ملک کے عام لوگوں میں ایسے طبی لٹریچر کو پھیلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے جو اُن کو تندرست رہنے کے اصول و قواعد بتلائے اور معمولی بیماریوں کا علاج سکھلائے۔ نین سکھ کو زیادہ مفید بنانے کے لئے سوسائٹی اس کے ہندی اور انگریزی ترجمے بھی چھپوا رہی ہے۔ جو آپ عنقریب حاصل کر سکیں گے لیکن آرڈر ابھی سے بُک کئے جا سکتے ہیں۔ نین سُکھ کے سینکڑوں عنوانات سے چند عنوان درج ذیل ہیں:۔

حمل کس طرح قرار پاتا ہے؟
حمل قرار پانے کا وقت۔
ماں کے پیٹ میں بچے کا بڑھنا
مانعِ حمل دوائیں
میاں بیوی کا وقت
کیسے جوڑے سے کیسی اولاد پیدا ہوتی ہے؟
حمل کی علامتیں
اسقاطِ حمل سے محفوظ رہنے کی تدبیریں
زچہ خانہ
کا انتخاب اور اس کی فرائض

بچہ پیدا ہونے کی علامتیں
آنول کا خارج ہونا
بچے کو آسانی جننے کی ترکیب
زچہ کی حفاظت
زچہ کے لئے مقوی دوائیں۔
اور سپاری پاک کے نسخے
زچہ کی بیماریاں اور اُن کا علاج
پرسوت کا بخار
خونِ نفاس کا بند ہو جانا
دودھ کا بخار

دودھ کی زیادتی دودھ کی کمی
پستانوں کا ورم۔ تھنیلہ
بچے کی نال کاٹنا
بچے کو نہلانا
بچے کو غذا۔
بچے کی بیماریاں جو شیر خوار بچوں سے تعلق رکھتی ہیں
سر میں پانی بھر جانا۔
بچوں کی مرگی
عطاش اپیاس
ہنسلی اتر جانا

نیند میں ڈرنا۔
آنکھیں دُکھنا درد ہے
کان کا درد اور کان بہنا۔
منہ آنا۔ مال پھینا۔
کھانسی۔ کالی کھانسی
ڈبہ۔ پسلی چلنا۔
بدہضمی۔ قبض۔ دست وغیرہ
چیچک نکلنا۔ خسرہ۔ چھوٹی چھاتی وغیرہ
سوکھا اسان سوکھا
پھنسیاں وغیرہ

ملنے کا پتہ:۔ **طبی لٹریچر سوسائٹی دہلی**

ہر گھر میں کام آنیوالی تین کتابیں

اُستادِ درزیاں

مصنفہ ماسٹر محمد حسین صاحب دلاوری جیمبا ہر فیشن اور ہر قسم کے انگریزی کپڑوں کے ماپ لینے کے آسان طریقے اور ان کی کٹائی کر نیکے ہے
پیمائش کے صحیح صحیح نقشے ہنچوں تک نشان دیکر ایسے ایسے آسان طریقے لکھے گئے ہیں کہ جنکو
ان پڑھ اور معمولی پڑھا ہوا شخص بھی دیکھ کر ہر قسم کا انگریزی کپڑا ایسے بہترین طریق سے
تیار کرسکتا ہے کہ جو سالہا سال کی شاگردی کے بعد بھی تیار نہ ہوسکے۔ ہر کپڑے کی تیاری
کا امر اور تیاری کے بعد شکل بنا کر پہنا کر دکھایا گیا ہے تاکہ ہر شخص کو بخوبی سمجھ آجائے
ہمارا دعوےٰ ہے کہ یہ کتاب ہر طرح اعلیٰ اور عمدہ اور بہترین ہے سینکڑوں نقشے اور متعدد
تصاویر کتاب کے ساتھ ہیں لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ اعلیٰ اور سائز کلاں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

اُستادِ صابون سازی

یہ وہ کتاب ہے کہ جسے صابون سازی کے ایک اعلیٰ درجہ کے ماہر نے نہایت محنت سے مرتب کیا ہے۔ پہلے نئے
اور نئے طریقے سے ہر قسم کے عمدہ سے عمدہ صابون بنانے اور رنگ کرنے کی ترکیبیں نہایت
آسان [illegible] درج ہیں صابون سازی کے متعلق ہر قسم کے مصالح اور مشینری اور ڈبے وغیرہ کے
[illegible] درج ہیں [illegible] کارخانہ صابون سازی کھولنے کے لئے گورنمنٹ
[illegible] حاصل کرنے کا طریقہ درج ہے۔ کتاب میں قریباً [illegible] قسم کی مختلف مشینوں وغیرہ کے نقشے
[illegible] گئے ہیں قیمت صرف ایک روپیہ (عمہ) علاوہ محصولڈاک۔

اُستادِ روزگار

جو صحیح طور پر غریبوں مفلسوں ناداروں اور کم سرمایہ [illegible] کیلئے خضر راہ ہے اس کتاب میں جو کچھ درج ہے [illegible]
کے تجربہ کے بعد درج کیا گیا ہے۔ اس درجہ تجربہ روزگار کتاب میں ایسے ہنر اور [illegible]
ہزاروں روپے خرچ کرنے پر بھی میسر نہیں مثلاً ہر قسم کے دیسی انگریزی [illegible]
صابن بنانے کے سہل طریقے ہر قسم کے عطر تیل [illegible] وغیرہ [illegible] بنانے اور ہر قسم کے
وارنش رنگ [illegible] لاجواب خضاب آتشبازی گھڑی سازی [illegible] وغیرہ کے
[illegible] بنانے کے طریقے [illegible] قسم کے [illegible]
[illegible] بنانے کے [illegible]
[illegible]
[illegible]

روپیہ کماؤ

اپنے شہر و قصبہ میں بغیر سرمایہ باعزت کاروبار کرنے اور فرصت کے وقت معقول آمدنی پیدا کرنے کے خواہشمند مفصل لٹریچر منگوائیں۔

کمرشل سنڈیکیٹ ۱۹ لوہاری دروازہ لاہور

گورنمنٹ آف انڈیا سے

ٹریڈ مارک - ڈیزائن - دوائیوں کے نام - فرم کا نام لیبل وغیرہ رجسٹرڈ کرانے - ٹریڈ مارک حاصل کرنے اور مشینری پیٹنٹ کرانے کے لئے لٹریچر مفت منگوائیں۔

پتہ:-

کمرشل سنڈیکیٹ ۱۹ اندرون لوہاری دروازہ لاہور

ایک روپیہ میں ایک ہزار اشتہار چھپواؤ

پنجاب بھر میں سستی چھپوائی کا کام کرنیوالی واحد فرم

نرخ - چھپوائی اشتہارات وبمعہ قیمت کاغذ [illegible]

سائز اشتہارات	۱۰		
۴½" × ۵¾"	۱—۰—۰	۲—۰—۰	۳—٦—
۹' × ۵½"	۲—۰—۰	۱—۰—۰	۵—۰—۰
۹" × ۱۱"	۳—۸—۰	٦—۰—۰	
۱۰" × ۱۱	۵—۰—۰		

اشتہار غلط چھپنے یا خراب ہونے کی صورت میں دوسری دفعہ مفت چھاپ دیں گے۔

نرخ و نمونہ مفت طلب کریں

کمرشل سنڈیکیٹ ۱۹ اندرون لوہاری دروازہ لاہور

پوشیدہ بیماریوں کے علاج کیلئے موجودہ سائنس کے حیرت انگیز کرشمے

آلہ مردمی — طبابت کا انتہائی سائنٹیفک کمال — اس آلہ کے ذریعہ کمزوری کے دعیہ جلانے جسمانی خون کی شفا بخش تاثیر سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اسکی شیشہ کی نلکی کو عضو پر لگا کر نلکی کی ہوا خارج کر کے خلا پیدا کیا جاتا ہے جس سے خون صالح کی ایک کثیر مقدار عضو کے اندر کھنچ آتی ہے اور مردہ نسیں پٹھے اور شریانیں اس خون سے غذا حاصل کر کے تازہ اور تندرست ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مقامی نقائص مثلاً لاغری سستی وغیرہ دور ہو کر نامردی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جاتا ہے کسی زہریلی دوائی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر قسم کی کمزوری کا شرطیہ اور مستقل علاج۔ قیمت فی آلہ صرف دس روپیہ۔ محصول ڈاک ایک روپیہ تین آنہ (۱۳؍)

آلہ احتلام — جن بدقسمت نوجوانوں کا متاع شباب رات کو شیطان کے ہاتھوں لُٹ جاتا ہو ان کے لئے یہ آلہ ایک نعمت ہے اس عجیب و غریب آلہ کو رات کو سوتے وقت مقامی طور پر لگا لینے سے احتلام قطعی ناممکن ہو جاتا ہے یقیناً پہلے ہی روز اثر دکھاتا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔ محصول ڈاک ۸؍

سسپنسری بیلٹ — فوطوں کو ڈھیلا ہونے سے بچانے اور قوت مردمی کو قائم رکھنے بلکہ دوبالا کرنے کے لئے یہ پیٹی لاجواب چیز ہے کھیل کود۔ اُٹھنے۔ بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں یہ پیٹی فوطوں کو اوپر اٹھائے رکھتی ہے اور نہ صرف ان کو سہارا دے کر بچاتی ہے بلکہ فوطوں میں پانی بھرنا۔ بڑھ جانا۔ آنت اُترنا وغیرہ وغیرہ بیماریوں سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ آسانی کے لئے دو یا تین بیلٹ خرید لی چاہئیں تاکہ میلی ہونے پر دھوبی سے دھلائی جا سکیں۔ قیمت فی بیلٹ ایک روپیہ چار آنہ۔ دو عدد دو روپیہ چار آنہ۔ تین عدد تین روپیہ چار آنہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں ۸؍

جریان — اگر دھات مثل پانی پتلی ہو گئی ہو۔ پیشاب کرتے وقت یا سوتے ہوئے خارج ہو جاتی ہو اور پیشاب میں سفیدی بھی ہو یا پیشاب گرم سرخ رنگ کا ہو تو ہمارا واحد جریان [illegible] نامی سفوف جریان استعمال کریں دو ہفتہ کے اندر جریان کو جڑ سے اکھاڑ دیگا اور دھات کو شہد کی مانند گاڑھا کر دیگا۔ بدن میں طاقت چہرے پر سرخی۔ سر چکرانا اور سر درد کا نام و نشان بھی نہ رہیگا۔ قیمت فی بکس دو ہفتہ کے لئے ایک روپیہ بارہ آنہ۔ احتلام کی گولیاں — احتلام کو شرطیہ بند کرتی ہیں فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ محصول ڈاک دونوں حالتوں میں ۸؍

سپرے ڈوش — اس پچکاری سے عورت بستر پر لیٹے لیٹے نہایت آسانی سے اپنے پوشیدہ اعضا کی ہر روز صفائی کر سکتی ہے سپرے ڈوش کے ساتھ پچکاری کرنے سے نہ صرف گندے مواد اور بدبو کی ہی صفائی ہوتی ہے بلکہ لیکوریا یعنی پردہ یا جریان الرحم وغیرہ بیماریاں بھی کافور ہو جاتی ہیں مقامی پٹھے مضبوط اور سخت ہو جاتے ہیں اور عورت تمام عمر باکرہ کی مانند چست رہتی ہے قیمت فی سپرے ڈوش درجہ اول چار روپیہ آٹھ آنہ۔ درجہ دوم تین روپیہ آٹھ آنہ۔ ڈوش کا لوشن بنانے کے لئے ڈوش ٹیبلیٹ نامی ٹکیاں جن کو پانی میں گھول کر پچکاری کی جاتی ہے قیمت فی شیشی ایک سو ٹکیہ ایک روپیہ آٹھ آنہ محصول ڈاک ڈوش و شیشی دونوں کے ۔ ایک روپیہ

نسوانی بیلٹ — ایام حیض میں میلے کچیلے چیتھڑوں، گندے روئی وغیرہ کا استعمال نازک اعضا کو نہایت سخت نقصان پہنچاتا ہے جس سے کئی بیماریاں مثلاً سیلان الرحم، اسہال الرحم وغیرہ لاحق ہو جاتی ہیں اس پیٹی کو پہن لینے سے اعضا صاف ستھرے رہتے ہیں اس کے اندر رکھی ہوئی واٹر پروف روئی تمام خارج شدہ رطوبت کو چوس لیتی ہے اور اعضا ہر قسم کے متعدی امراض سے محفوظ رہتے ہیں۔ قیمت فی بیلٹ جو سالہا سال کام دیتی ہے صرف دو روپیہ محصول ۸؍

بواسیر — بواسیر جیسا موذی مرض خدا دشمن کو بھی نہ لگائے مسّوں کے درد اور ٹیس سے انسان چند دنوں میں ہی ہڈیوں کا ڈھانچ بن جاتا ہے جسم کا سارا خون مسّوں کی راہ خارج ہو جاتا ہے لیکن اس مرض کی بُری سے بُری حالت میں بھی ہماری پائیلکیور (PILCURE) گولیاں معجزے کا کام کرتی ہیں۔ پائیلکیور نمبر ۱ خونی بواسیر کے لئے اور پائیلکیور نمبر ۲ بادی بواسیر کے لئے۔ قیمت فی شیشی ہر دو قسم تین روپیہ محصول ڈاک ۸؍ مایوس العلاج مریض بھی شفا پائینگے۔ آزما دیکھیں۔

لیکوریا۔ جریان الرحم — ہندوستان میں عورتوں کو بڑی لاپروائی سے رکھا جاتا ہے۔ مرد خود تو مقوی باہ ادویات و معجونوں کے ڈبے خالی کر جاتے ہیں مگر ان بیچاریوں کی تکلیف کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے۔ نوّے فیصدی عورتیں جریان الرحم، اختناق الرحم وغیرہ بیماریوں سے تنگ تنگ [illegible] باقی اپنی پُر عذاب زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں۔ لیکو کورہٹ (LEUKOR RHIT) نامی گولیاں عورتوں کی نجات کا واحد ذریعہ ہیں۔ خدا کے واسطے [illegible] [illegible] ادویات بند کر کے لیکوریا یعنی سفید سرخ یا نیلا پانی، سنا وغیرہ کا علاج کریں۔ قیمت فی شیشی ۶۰ گولیاں مکمل شفا کے لئے صرف تین روپے محصول ڈاک ۸؍

مکمل فہرست مفت طلب کریں۔

امپیریل ناولٹی مارٹ (N . K) اندرون شاہ عالمی گیٹ لاہور (پنجاب)

کایاپلٹ

بوڑھے گوالہ نے عجیب پوگیرج تننگری جی مہاراج کی دی ہوئی دوائی کی چھ خوراکیں غلطی سے ایک ہی دفعہ کھالیں تو اس کی جو حالت ہوئی [illegible]
پورا حال بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ قصہ مختصر اس بوڑھے گوالہ نے بڑھاپے میں سات شادیاں کیں - یہ خبر آناً فاناً ہر طرف پھیل گئی۔ امیر، تعلقہ دار، رئیس اور نواب مہاتما کی طرح طرح سے خوشامد کرکے اس عجیب و غریب دوائی کا نسخہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ نواب بہاول پور کے مشیر حاجی حیات محمد خاں صاحب کی کوشش بار آور ہوئیں۔ اور بابا جی نے یہ نسخہ اور اس کے بنانے کی ترکیب بتادی۔ حاجی صاحب موصوف سے یہ نسخہ امرت دھارا کے مشہور موجد کوی ونود پنڈت ٹھاکر دت شرما کے ہاتھ لگا جنہوں نے اپنے [illegible] کے ہمراہ اس نسخہ کو اپنے طبی رسالہ دلیش اپکارک میں شائع کرکے اس سے بہتر نسخہ بنانے والے کو ایک ہزار روپیہ دینے کا اعلان کردیا۔ اس اعلان کو [illegible] سو سال ہو چکے ہیں۔ لیکن اب تک کوئی بھی انعام حاصل کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔ پھر متھرا کے مشہور و معروف وید راج بالو [illegible] اس نسخے کو اپنی طبی کتاب حکمت چند چند راودے میں چھپوا دیا۔ ہم نے اس کتاب سے اس نسخہ کو لے کر تیار کیا اور ہزاروں نامردی جیسے [illegible] کے مایوس مریضوں پر اس کی آزمائش کی۔ ہم اس دوائی کے حیرت انگیز کرشمے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ ان زندہ درگور مریضوں کی کایا پلٹ ہوگئی [illegible] تھی۔ چند روز کے استعمال سے ہی ان کے چہروں پر سرخی دوڑنے لگی بھوک حیرت انگیز طور پر بڑھنے لگی اور چالیس روز کے مکمل استعمال سے [illegible] مرد بن گئے۔ نسخہ حسب ذیل ہے:— جو صاحب ان موذی امراض کی بدولت موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہوں اسے تیار کرکے قدرت کا [illegible]

شدہ برادہ فولاد ۲۰ تولہ۔ خالص سنکھیا سفید ایک تولہ۔ کافور ½ ۱ ماشہ کو پانچ گھنٹے گھیکوار کے گودے میں گھوٹ کر مٹی کے کوزہ میں [illegible] بطریق گل حکمت ۵ سیر اُپلوں کی آنچ میں پھونکیں۔ پھر ٹھنڈا ہونے پر ایک تولہ ہڑتال ورقی ½ ۱ ماشہ کافور کے ساتھ تیسری بار ایک تولہ [illegible] ½ ۱ ماشہ کافور کے ساتھ اور چوتھی بار ایک تولہ شدہ شنگرف پارہ اور ½ ۱ ماشہ کافور کے ساتھ پھونکیں اسی طرح ساتواں [illegible] مٹی کے کوزہ میں [illegible] زمین میں گاڑ دیں اور چار ماہ بعد نکالیں یہ عجیب و غریب مقویات کی سرتاج دوائی تیار ہے خوراک نصف رتی صبح اور نصف رتی شام ملائی یا مکھن میں ملا کر کھائیں [illegible] دودھ پی لیں۔ گرم اور ترش اشیاء سے پرہیز کریں۔

اس کی تعریف میں متھرا کے بابو ہری داس جی لکھتے ہیں کہ ایک مریض کا اس کے استعمال سے ایک ہفتہ میں چار پونڈ وزن بڑھ گیا اور اس کے چہرہ میں سرخی [illegible] [illegible] کرشن جی شرما نے اسے ۳۰ سے زائد مریضوں پر استعمال کیا اور امید سے بھی بڑھ کر فائدہ دیکھا۔ [illegible] کے ایڈیٹر [illegible]
اپنی مشہور آفاق گرو حکمت [illegible] میں لکھا ہے کہ ہم نے آج تک ایسا تیر بہدف اور مقوی نسخہ نہیں دیکھا۔ [illegible]
[illegible] اس دوائی کے چالیس روز کے استعمال سے ۸۰ سال تک بڑھاپا نزدیک نہیں پھٹکتا۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] پانچ [illegible]

[illegible] ستیہ [illegible] بالاس [illegible]

ان شاندار نتائج کے باعث پبلک کا اعتماد ہے

کاروبار سنہ ۱۹۳۶ء کا

زائد از دس کروڑ

بیمہ زندگی یقینی طور پر ہر امیر اور غریب کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ آغاز سے ہی ان مکمل فوائد کا یقین دلاتا ہے۔ جو پسماندگان کو بیمہ کنندہ کی موت کے بعد حاصل ہونے والے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نفع ہے سرمایہ کو کسی اور ذریعہ پر لگانے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

ہر سال ہوشیار اور سنجیدہ لوگ گروہ در گروہ اورینٹل میں بیمہ کراتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بیموں کی کثرت پائداری اور لازوال پختگی سے ظاہر ہے۔

قائم شدہ ۱۸۷۴ء ــــــــــــــــ ہیڈ آفس بمبئی

اب سے ہی آپ

اورینٹل گورنمنٹ سیکورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

پالیسی خرید کر مستفید ہوں

قواعد و ضوابط اور تفصیلات کے لئے ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کیجئے:۔

گوپال داس سوفی ایف-سی-آئی (ایڈنبرگ) / ایف-آر-ای-ایس (لنڈن) **برانچ سکریٹری اورینٹل بلڈنگ، ۷ سی دی مال لا[ہور]**

یا کمپنی کے کسی دفتر کے ساتھ جو کہ ہندوستان کے ہر ایک حصہ میں موجود ہیں:۔

ڈاکٹر پریتھی سنگھ صاحب پی ایچ ایم ایس ٹی ایڈیٹر رسالہ مست قلندر لاہور کے قلم سے

ملاپ کی رات بارہ آنے ۱۲ر	رموز حسن باتصویر عہ عورتوں کی خوبصورتی کے لئے	نسخہ حسن ہر سہ حصہ دو روپیہ آٹھ آنے ..	سورج کی کرنوں سے علاج تین حصے ایک روپیہ .. عہ	طوائف کی سرگذشت آٹھ آنے - - ۸ر
…بھگوان کا پجاری ۱۲ر بہت اونچے درجے کا ناول	موت کے بعد ۸ر حیات بعد الممات پر	غیبی دنیا ہر دو حصہ ۸ر روحانیت سے متعلق	تقدیر کی تصویر باتصویر ۸ر ہاتھ دیکھنے کا علم	قسمت کی تحریر ۱ فالنامہ نویس لونا بارٹ
دودھ یا آب حیات بارہ آنے .. ۱۲ر	ڈھول میں جواہرات عہ علم جڑی بوٹی پر انوکھی بات	رموز بارہ اکسیر ۱۲ر بارہ نسخوں سے علاج	سدا جوانی ۸ر جریان احتلام وغیرہ کا علاج بلا دوا	طاقتور بنو تین حصہ مکمل عہ شہزور طاقتور اور ہٹے کٹے بننے کے لئے
ہمالیہ پربت کا جادو ایک روپیہ .. عہ	کالا علم المعروف الو کے معجزے ایک روپیہ .. عہ	قدیم مصری جادو ایک روپیہ .. عہ	زندہ جادوگری کے کرشمے ایک روپیہ آٹھ آنہ ..	خیال کا جادو عہ دس آنے ... ۱۰ر
تقدیر پر حکومت اپنی قسمت پر قادر ہونے کا راز	دولت مند بنو عہ تجارت کے گر راز کی باتیں	کروڑپتی بنو چھ آنے .. ۶ر	سو برس جیو ۸ر علم النفس یعنی پرانایام پر	دسترخوان کی لذتیں ۱۲ر لذیذ اور دل پسند کھانوں کے لئے
رموز ہمزاد چھٹا ایڈیشن ۱۲ر تسخیر ہمزاد پر بے بدل کتاب	عجائبات مسمریزم چھ آنے .. - ۶ر	اسرار لندن ناول ایک روپیہ .. عہ	روپیہ کمانے کی مشین عہ کم سرمایہ کے روزگار	روٹی کماؤ چھٹا ایڈیشن ۱۲ر تجارت بذریعہ ڈاک
منتر شکتی ایک روپیہ چار آنہ ..	گائتری شکتی بارہ آنہ .. ۱۲ر	روشن ضمیری آٹھ آنہ .. ۸ر	گھر کا ڈاکٹر یعنی خواص نمک آٹھ آنہ .. ۸ر	لیموں کی مسیحائی آٹھ آنہ .. ۸ر
علاج بذریعہ نیم …آنے ..	علاج بذریعہ شہد آٹھ آنے .. ۸ر	علاج بلا دوا چھ آنہ .. ۶ر	آنکھوں کی کسرتیں معہ آنکھ سنوار کاجل ..	علاج آبی ۸ر صرف پانی کے ذریعہ علاج
…فلم اسٹار ۱۲ر …کے صدملی حالات	فلم ایکٹنگ گائیڈ عہ فلمی لائن اختیار کرنیوالوں کے لئے	لکھ پتی بننے کے راز تجارت بذریعہ ڈاک .. ۱۰ر	جادوگروں کا بادشاہ باتصویر ایک روپیہ عہ	گناہ کی لذتیں ۱۲ر کلکتہ کی طوائف کی آپ بیتی
محبت کے خطوط … .. ۸ر	منتر شاستر بالکل حقیر اور معمولی چیزوں کی ملاوٹ سے بڑے بڑے کام نکالنا	بیسوی کا کوک شاستر باتصویر علم النسا پر بے بدل کتاب .. عہ	چھ ہفتہ میں انگریزی بول چال بارہ آنہ .. ۱۲ر	طائر روح ناول - ۸ر ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہو چکا
…تماش ۱۲ر …تماش	خواص نوشادر ۸ر خواص مٹی ۱۲ر	رموز ہومیوپیتھی ۸ر خواص پتھر ۱۲ر	فن از خود نویسی ۱۲ر امرت رسائن ۱۲ر	فن بوسہ بازی ہر دو حصہ .. ۱۲ر
…کی کرامات	مینیجر مست قلندر بکڈپو پوسٹ بکس نمبر ۱۵ لاہور			دھتورہ کی کرامات چھ آنے .. ۶ر

…محصول ڈاک ہے۔ ایک روپیہ سے کم کی مالیت کا وی پی نہیں ہوگا۔

لاہور میں ایک عظیم الشان تھیٹریکل کمپنی کی آمد

جہاں آرا کجن کی اپنی کمپنی

بلبل بنگال مس جہاں آرا کجن ایکٹ اکسو ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے ساتھ

لاہور میں تشریف لا رہی ہیں

معلوم ہوا ہے کہ پہلا کھیل ۲۵/۲۶ دسمبر کو کراؤن ٹاکیز (مہارام تھیٹر) بیرون بھاٹی دروازہ لاہور میں شروع ہوگا۔ ہر روز دو کھیل ہوا کریں گے۔ پہلا کھیل ۶ ½ بجے شام۔ دوسرا کھیل ۱۰ بجے رات کو ہر کھیل کا پروگرام صرف تین گھنٹے کا ہوگا۔ جس میں پورا کھیل پیش کیا جائیگا۔ مس جہاں آرا کجن نے اس مقصد کیلئے بہت سے نئے کھیل لکھوائے ہیں اور بہت سے پرانے کھیل از سر نو مرتب کرائے ہیں یورپ کے اچھے تھیٹروں کی طرز پر فضول گانے، بہاریوں کے گانے سپاہیوں کے گانے اور اسی قسم کی زائد چیزیں خارج کر کے کھیلوں کو اس قابل بنایا گیا ہے کہ ۳ گھنٹے کا پروگرام تین گھنٹے میں پورا ہو جاتا ہے اس پر دلکش راگوں اور جذبات انگیز قصوں سے اُسے اور بھی جاذب بنا لیا گیا ہے۔ الغرض اس قسم کی شاندار تھیٹریکل کمپنی اس سے پیشتر لاہور میں نہیں آئی۔ درجنوں ماہرین فن کے لیئے اپنے کمال کے علاوہ

ہر کھیل میں مس جہاں آرا کجن

اپنے کمال فن سے حاضرین کو مسحور کر لیتی ہیں جہاں آرا کجن کی شستہ نثر، شیریں گلا اور ماہر فن موسیقی ہونا ایک حقیقت ہے کلکتہ میں ایک ایک کھیل ۱۴-۱۴ دفعہ کھیلا گیا ہے۔ لاہور میں شائقین کا روزانہ ہجوم ہوگا۔ اس کے علاوہ جالندھر۔ امرتسر۔ پٹھانکوٹ۔ ہوشیارپور۔ گورداسپور۔ سیالکوٹ۔ وزیرآباد۔ جہلم۔ گجرات۔ گوجرانوالہ۔ لائلپوری۔ فیروزپور۔ قصور۔ ملتان اور گرد و نواح کے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبات کے لوگ محض لاہور میں اس لیئے آئینگے کہ کھیل اس کمپنی کے ضرور دیکھ لیں۔ اور مس جہاں آرا کجن کے دلکش نغمے اور اُن کا لاجواب پارٹ اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سنیں۔ کمپنی کا مفصل پروگرام وقت اور تاریخ معہ تعلیم اخبارات کے ذریعہ روزانہ مشتہر ہے گا۔

المشتہر
مینیجر کمپنی

Regd. L. No. 1703.

Title & All Pictures Printed at
THE VICTORIA PRESS, RY., ROAD, LAHORE